مجموعۃ القاسم

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il- Islamia, Supaul Bihar (INDIA)

جلد چہارم ۴ مسلم پرسنل لاء

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت
مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کا علمی، دینی، دعوتی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

کی

تحقیقی، تاریخی اور دستاویزی پیش کش

مجموعہ القاسم

﴿مسلم پرسنل لاء-۴﴾

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

ناشر

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : مجموعہ القاسم (مسلم پرسنل لاء-۴)

ترتیب : ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم : ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

صفحات : ۴۴۵

اشاعت : ۲۰۱۸ء

تعداد : ۲۵۰۰

ناشر : جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، اراریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل:9891763977

انتساب

استاذ الکل مولانا مملوک علی النانوتوی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مجاہد فی سبیل مولانا محمد مظہر النانوتوی بانی مظاہر علوم سہارنپور، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الحدیث اوّل مولانا محمد یعقوب نانوتوی، امیر لشکر میدان شاملی مولانا محمد منیر نانوتوی، کتب فقہ اسلامی کے مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی اور مصلح قوم سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام منسوب کرتا ہوں۔ جن کے جلائے ہوئے چراغ کی لَو سے آج پوری دنیا ڈیڑھ صدی سے روشن ہے، اور جن کے اخلاص کا تاج محل، کتاب وسنت، فقہ اسلامی کی ترویج کے علاوہ اسلامی تحریک، ناموس تحفظ ختم نبوت، مدارس ومساجد اور انسانی خدمات کا وہ روشن باب جن کا شمار ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے تاریخ داں لکھے گا انشاء اللہ۔ یقیناً یہ کارہائے نمایاں ہمیشہ انجام پاتے رہیں گے اور آئندہ بھی مورخ اِن کارناموں کو سنہری حروف میں لکھتا رہے گا۔

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رونق بزم

نمبر شمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱	مسلم پرسنل لاء	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۷
	پیغامات		۱۱
	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی، مولانا سید نظام الدین، مولانا مفتی احمد خانپوری، مولانا مفتی احمد دیولوی، مولانا سید جلال الدین انصر عمری، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، مولانا حکیم محمد اسلام انصاری		
	باب اوّل		۳۰
۲	مسلم پرسنل لاء کیا ہے؟		۳۱
۳	مسلم پرسنل لاء اور ہماری ذمہ داریاں	قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	۳۹
۴	مسلم پرسنل لاء کی صحیح تعبیر	مولانا صدر الدین اصلاحیؒ	۵۴
	باب دوم		۶۵
۵	مسلم پرسنل لاء اور ہندوستان	مولانا منت اللہ رحمانیؒ	۶۷
۶	مسلم پرسنل لاء خطرات کے سائے میں	سید احمد قادریؒ	۷۲
۷	تعدد ازدواج پر پابندی...		۷۷
۸	حکومت کو مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں	مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ	۸۰
	باب سوم		۹۳
۹	اقلیتوں کے مسائل اور اصول: فقہ الاقلیات اصول وضوابط	ڈاکٹر صلاح الدین سلطان	۹۵
۱۰	خاندان کی تشکیل کے اسلامی اصول	مولانا بدر الحسن قاسمی، کویت	۱۲۹

۱۱	اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ	ڈاکٹر علامہ اقبالؒ	۱۳۶
	باب چہارم		۱۴۷
۱۲	عدالتی دائرے اور اسلامی اصول: طلاق کے مسائل اور ...	محمد عبد الرحیم قریشی	۱۴۹
۱۳	نکاح رجسٹریشن سے متعلق سپریم کورٹ کی ہدایت	مفتی محمد ارشد فاروقی	۱۵۹
	باب پنجم		۱۶۵
۱۴	برطانوی سماج اور اسلامی قوانین: برطانیہ میں اسلامی ...	ڈاکٹر روون ولیمس	۱۶۷
۱۵	برطانیہ میں قانون شرعیہ کا اطلاق، آرک بشپ کی رائے	انور علی ایڈوکیٹ	۱۸۳
۱۶	برطانیہ میں قوانین شرعی کے نفاذ کی تجویز	مولانا محمد عیسیٰ منصوری	۱۸۶
۱۷	برطانوی مسلمانوں میں اسلامی عدالت کا بڑھتا شوق	وسیم احمد	۱۹۷
	باب ششم		۲۰۱
۱۸	مختلف ایکٹوں کا تعارف: بنگال محمڈن میریج ایکٹ		۲۰۳
۱۹	شریعت ایکٹ -1937		۲۲۰
۲۰	ترمیمات برائے قانون وقف 1995		۲۲۵
	باب ہفتم		۲۳۳
۲۱	مسلم پرسنل لا بورڈ: ایمان ویقین کے متوالوں کا کارواں	مولانا سید محمد ولی رحمانی	۲۳۵
۲۲	آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن کا خطبہ صدارت	مولانا قاری محمد طیبؒ	۲۴۲
۲۳	تحفظ دین وشریعت کے چند ستون	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۲۷۱
۲۴	مسلم پرسنل لا بورڈ ماضی، حال اور مستقبل	نور اللہ جاوید قاسمی	۲۸۵
۲۵	راہیں دشوار گزار سہی، منزل آشنا ہیں!	عزیز بلگامی	۲۹۳
۲۶	لازمی نکاح رجسٹریشن: ایک بحث		۲۹۹
۲۷	آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: چند ذاتی تاثرات	پروفیسر طاہر محمود	۳۱۸
۲۸	آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ - ماضی سے حال کی طرف	محمد فہیم اختر ندوی	۳۲۱
۲۹	ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء اور ہمارا اسلامی تشخص قرآن وحدیث کی روشنی میں!!!		۳۲۶

۳۰	حرف چند	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۳۲۷
۳۱	مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اوّل کا مختصر تعارف		۳۳۳
۳۲	یہ قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی		۳۳۴
۳۳	مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر دوم کا مختصر تعارف		۳۳۷
۳۴	ہماری تہذیب ابراہیمی ہے		۳۳۸
۳۵	مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر سوم کا مختصر تعارف		۳۴۰
۳۶	پھولوں کی سیج پر چلنے کی نہیں پھانسی کے تختے پر جانے کی ہیں!		۳۴۱
۳۷	مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر چہارم کا مختصر تعارف		۳۴۲
۳۸	شریعت اسلامی الٰہی قانون حیات		۳۴۳
۳۹	کلیدی خطاب	قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ	۳۴۶
۴۰	صدارتی خطبات	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳۶۷
۴۱	خطبہ صدارت، بائیسواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ		۳۶۹
۴۲	خطبہ صدارت، تیئیسواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ		۳۷۷
۴۳	خطبہ صدارت، چوبیسواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ		۳۸۴
۴۴	رسائل امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ		۳۹۳
۴۵	مسلم پرسنل لاء: بحث ونظر کے چند گوشے		۳۹۵
۴۶	یونیفارم سول کوڈ		۴۱۲
۴۷	متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء: ایک جائزہ		۴۳۳
۴۸	آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن بمبئی کی بنیادی قراردادیں		۴۴۲

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلم پرسنل لاء

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

ہندوستان کے دستور اور جمہوری نظام میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس بات کی دستوری اجازت حاصل ہے کہ وہ شرعی قوانین پر عمل پیرا ہوں اور اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ عائلی مسائل کے تعلق سے مسلمان جملہ حقوق کی بازیابی بھی جمہوری طریقہ پر شرعی اصولوں کی روشنی میں کریں، لیکن گاہ بہ گاہ کبھی ملک کی عدالتوں کی طرف سے اور کبھی ایوانوں سے مسلم پرسنل لاء کے خلاف آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اسی طرح شرعی قوانین پر تیشہ زنی کبھی اسلامی قوانین سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوتی ہے اور کبھی محض بغض وعناد کی بنیاد پر۔ ہر دو حالت میں ہونے والے فیصلوں سے مسلمانوں کو شدید اذیت پہنچتی ہے، کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قوانین کو کسی بھی حال میں نہ تو کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بدلا جاسکتا ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ شرعی اصول وکلیہ کی روشنی میں اجتہادی آراء کے اظہار کا بھی اختیار علماء محققین کو ہی ہے نہ کہ شریعت سے ناواقف عدالتوں کے ججوں کو۔

مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی تحریک کو 1972 میں ہندوستان کے علماء وقائدین نے تیز کیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا، الحمدللہ مسلم پرسنل لا بورڈ تحفظ دین متین کے نگہبان کے طور پر سرگرم ہے تاہم آئے دن شرعی اصولوں پر

سوالات کھڑے کیے جانے کا سلسلہ جاری ہے اور ہر ممکن یہ کوشش کی جارہی ہے کہ قوانین اسلامیہ میں نقص نکالا جائے اور اسے موجودہ عہد کے لیے ناقابل عمل قرار دیا جائے۔لیکن علماء اسلام جس طرح ماضی میں اسلام کو مٹانے والی ہر طاقت سے ٹکراتے رہے ہیں اسی طرح وہ آج بھی کسی ایسی کوشش کو سبوتاژ کردینے کے لیے تیار ہیں جو شریعت کے خلاف کی جائے۔مسلم پرسنل لا بورڈ کے اولین صدر اور علمائے امت کے سرخیل حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے فرمایا تھا کہ ''اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی ،وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے، بلکہ روایت ودرایت کے لحاظ سے اس کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں،اگر ہیں تو وقت کی دھارے سے ادلتی بدلتی رہتی ہیں،لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں،زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں۔''

حضرت قاری محمد طیبؒ ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے، بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے،صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے،سو یہ آپ کی سیاست ہے،آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔''

مسلم پرسنل لاء کو دو طرح کے چیلنجوں کا سامنا ہے،ایک تو یہ کہ ہمارے ملک کے طول وعرض میں قائم مختلف سطح کی عدالتوں میں آئے دن ایسے فیصلے ہوتے رہتے ہیں جو شرعی اصولوں سے متصادم ہوں۔دوسرے یہ کہ طرف کچھ اسلام مخالف طاقتیں عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی یہ مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ اسلامی اصولوں میں سختی ہے،عدم رواداری ہے، بنیاد پرستی ہے،عورتوں پر طرح طرح کی پابندی ہے،اس لیے اس میں تبدیلی لانے کی ضرورت

ہے۔ان چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے سب سے پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ سے وابستہ علماء نے اسلامی قوانین سے بھی لوگوں کو واقف کرایا ہے اور معترضین کو بھی خاموش کیا ہے اور ملک کی عدالتوں کو بھی قانونی طور پر باہمی مشاورت کے بعد آگاہ کیا ہے،ان کے سامنے پرسنل لاء کی صحیح تصویر رکھی ہے،اور بورڈ کی یہ کوششیں یقیناً لائق تحسین ہیں،لیکن یہ قابل توجہ ہے کہ ہر روز معاندین ومخالفین نئے نئے جال لے کر آتے ہیں اور اسلام کو متہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں،چنانچہ اس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کو بھی چوکس وچوکنا رہنا ہوگا اور روشن خیال عوام کو بھی کہ وہ کہیں ان کے فریب میں نہ پھنس جائیں۔

ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کو خطرہ ان روشن خیال مسلم دانشوروں سے بھی ہے جو شریعت کا گہرا علم تو نہیں رکھتے لیکن معاندین کے اعتراضات کی رو میں بہہ کر شرعی اصولوں پر ہی تنقید کرنے لگتے ہیں اور شریعت میں غیر ضروری اجتہاد کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔یہ وہی طبقہ ہے جو ہر زمانہ میں علماء پر تنقید کرتا رہا ہے اور شرعی اصولوں کو فرسودہ ثابت کرتا رہا ہے،اگر اس کو بھی سامنے رکھا جائے تو چیلنج کا دائرہ خارجی اور داخلی دونوں سطح تک وسیع ہوجاتا ہے، اور مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی جدوجہد کرنے والے افراد کو دونوں دونوں محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے معارف قاسم جدید کا یہ خصوصی شمارہ مسلم پرسنل لا نمبر قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔اس میں مسلم پرسنل لا کی حقیقت پر وقیع مضامین اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی مختلف تجاویز پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس شمارہ میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے وہ دراصل آج کے ہندوستان کا سُلگتا ہوا موضوع ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت تو دستوری طور پر حاصل ہے لیکن جب عائلی مسائل کے حل کے لئے دارالقضاء کو تسلیم کرنے کی بات آتی ہے تو اس بات کا واویلا شروع کردیا جاتا ہے کہ ملک میں مسلمانوں کی طرف سے متوازی عدالتی نظام قائم

کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کوحکومت کاغذی طور پر حقوق تو دینا چاہتی ہے، یا دیئے ہوئی ہے، لیکن جب اس کی عملی شکل پیش کی جاتی ہے تو اسے متوازی عدالتی نظام کہہ کرنامنظور کردیا جاتا ہے۔معارف قاسم کے اس شمارے میں ان موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہم نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بہت وسیع اور نہایت ہی ہمہ گیر ہے، ظاہر ہے اس مختصرسی کوشش میں ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہم نے موضوع کا مکمل احاطہ کر لیا ہے، تاہم اس موضوع کو علماء اور دانشوروں کے غور وفکر کا ایجنڈا بنانے کی سمت میں یہ بھی ایک چھوٹی سی کوشش ضرور ہے اور اس میدان میں کام کرنے والے افراد کے لئے ہماری یہ حقیر کوشش بھی انشاءاللہ ضرور معاون ہوگی۔ **وما توفیقی الا باللہ۔**

☆☆

بورڈ کا پیغام ملت اسلامیہ کے نام

● حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ علیہ
بانی وصدر اوّل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے، بلکہ دوربیں سے دیکھئے یا خوردبیں سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے، جو ہندوکوڈبل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور، مذہب اور سیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملے میں اپنی سیاست میں لاکر حکومت سے عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟ آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں۔میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں، حکومت کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوث ہے، جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل ودیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم قسمت کی ماری بازاری گناہ گار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں۔نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی دارو گیر کا روادار ہے۔

پیغام

● مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد و علیٰ آلہ و صحبہ أجمعین، بعد!

مسلمان ہندوستان میں اگرچہ اقلیت میں ہیں، لیکن یہ اقلیت بڑی بھی ہے اور خاص حدتک بااثر بھی ہے، اسی کے ساتھ اس اقلیت کو دو خصوصیات ایسی بھی حاصل ہیں جو اس کو خود کفیل اور ترقی پذیر بننے والی امت بنانے میں بڑی مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کے اسلاف نے اس ملک میں پانچ چھ صدی تک انتظام سنبھالا ہے اور قائدانہ کردار بھی ادا کیا ہے، اس کے قائدانہ کردار سے اس ملک کی تہذیب وتمدن پر بھی اثر پڑا ہے جس سے اس ملک کی خوبیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ مغایرت کا نہیں، بلکہ اعلیٰ انسانی سلوک کا ثبوت دیا ہے۔

دوسری خصوصیت اس اقلیت کی اس کا دین ودنیا دونوں کا جامع مذہب ہے، جو اس کو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ ملا ہے، یہ مذہب اپنی رواداری اور اعلیٰ انسانی کردار کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور اعلیٰ انسانی قدروں کا لحاظ اور اپنے خالق ومالک کے احکامات کے ساتھ پوری زندگی کو وابستہ کرنے کی ذمہ داری بھی ڈالتا ہے جس کو انجام دینے کا کام اس امت نے اپنی گذشتہ تاریخ میں مخلصانہ انداز سے

انجام دیا ہے اور اس کو برابر قائم رہنے والی ذمہ داری سمجھا ہے، اس امت کی یہ خصوصیات ایسی ہیں کہ ان کے ذریعہ یہ امت اپنے کو ہمیشہ ایک فعال اور مؤثر امت بنانے میں مدد لے سکتی ہے، اور اپنے پیش رووں کے معاملہ میں انسانی نسلوں کا ہمیشہ یہ خاصہ بھی رہا ہے کہ ان کی کارگزاریوں کو اپنے لئے نمونہ بناتی ہیں اور اس کی بناء پر ماضی میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان سے اپنے کو بچانے کی فکر کرتی ہیں۔ اس طرح ہماری اس امت کے لئے جو اس ملک میں اقلیت میں ہے، لیکن اپنے اسلاف کی شاندار تاریخ رکھتی ہے، سبق حاصل کرنے کا بڑا موقع ہے، جس سے بہت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

اس امت کو ایک خصوصیت یہ بھی حاصل ہے کہ اس کے افراد ساری دنیا میں بھی پھیلے ہوئے پائے جاتے ہیں اور ان سب کا ایک بڑا دینی وفکری مرکز ہے لیکن اس ملک کے مسلمان اپنے اس مرکز مرکز اسلام سے تعلق قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی دینی وعلمی صلاحیت دین اور علم دین کے معاملہ میں ممکنہ حدتک خود کفالتی کا طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں، اور اسی بناء پر اس ملک کے مسلمانوں میں بڑے بڑے جید علماء دین پیدا ہوئے اور انہوں نے اس امت کی دینی وعلمی ضروت کو پورا کیا اور امت کو مرکز اسلام سے دور ہونے سے اگر کوئی خرابی ہوسکتی تھی تو اس سے بچایا ہے اور صحیح طریقہ سے خود کفیل بنایا ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جن کو اپنا کر یہ امت اس ملک میں اپنے لئے بڑا مقام بنا سکتی ہے اور اس ملک میں مصلحانہ وقائدانہ کردار کا ثبوت دے سکتی ہے، لیکن سب سے بڑی ضرورت یہ کہ یہ امت اپنے کو ان خصوصیات کی حامل امت سمجھے اور اس سلسلہ میں متحد الفکر ہوکر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ اس طرح کا احساس ہی وہ قوت ہے جو کسی بھی کام کو اعلیٰ سطح سے انجام دینے میں مدد ومعاون ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اس امت سے اس کی تاریخ میں جب جب کوتاہی ہوئی تو اس امت کو بہت نقصان پہنچا ہے، خاص طور سے متحد وبامقصد ہوکر کام کرنے میں۔ حالانکہ اس امت کو جو دین ملا ہے اس میں آپسی اخوت اور اتحاد پر

بہت زور دیا گیا ہے اور اس میں انسان کے جائز تقاضوں کی پوری رعایت رکھی گئی ہے، وہ تنگی کا دین نہیں ہے، وہ وسعت کا اور آسانی کا دین ہے، وہ دین انسانی معاشرہ کی مختلف الجہات ضرورتوں کو بہت اچھے طریقہ سے اور بہت اچھے انداز سے پورا کرتا ہے اور مزید کام کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں اور سخت دشواریوں میں اس دین کے ماننے والوں نے جب بھی مقصد کی لگن اور کام میں یکجہتی اور مستعدی دکھائی ہے تو حالات کو بدلا ہے اور یہ اس کی تاریخ میں بار بار ہوا ہے۔ اس کے ہر دور میں اس کی رہبری کے لئے علماء اور اہل فکر ضرورت کی تعداد میں موجود رہے ہیں اور وہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف طریقہ ہائے کا اختیار کرتے رہے ہیں موجودہ دور میں بھی ایسے باصلاحیت لوگ ہیں مختلف جماعتوں اور اداروں کا اختلاف اگر مقصد کے لحاظ سے یکجہتی اور تعاون کے ساتھ عمل میں آتا ہے تو امت کی ضروت پوری ہوسکتی ہے، اور یہ صفت جس حد تک بھی اس امت میں ہے اس کے مطابق فائدہ ہو رہا ہے، لیکن اگر ان کے اس تنوع میں گروہی عصبیت کا عمل دخل ہو جائے تو یہ ایسا مرض ثابت ہوسکتا ہے جو امت کو سخت نقصان پہنچانے والا اور اس کی طاقت کو توڑنے والا ہوگا۔ یہ مرض صرف اسی امت ہی کے لئے نہیں، بلکہ کسی بھی امت میں پیدا ہو جائے تو اس امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

امت کے مسائل کو خصوصاً شرعی مسائل کو متحدہ طور پر حل کرنے کے لئے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام ملت اسلامیہ ہندیہ کے تمام طبقات اور مختلف مکتبہ ہائے فکر و مسالک، یہاں تک کہ اسی امت کی طرف انتساب کرنے والے دوسرے فرقے بھی اکٹھا ہوئے اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب دیوبندیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی قیادت اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زبردست تحریک پر جمع ہوئے۔ حضرت قاری صاحب کی وفات کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

نے اور پھر فقیہ ملت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ نے قافلہ سالاری کی اور ہر موقع پر پوری امت نے متحد ہو کر پورا ساتھ دیا، اور بڑے مسائل حل ہوئے۔ آج الحمدللہ ہمارا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ امت کی غرض و غایت اور اس کی مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کام انجام دینے کی طرف توجہ دیتا ہے اور امت کی گروہ بندی و گروہی عصبیت سے اپنے کو علیحدہ رکھتے ہوئے کام انجام دیتا ہے، وہ امت کے سب کارگزار گروہوں کے ساتھ یکساں معاملہ رکھتا ہے اور اس میں بڑی حد تک الحمدللہ کامیاب ہے۔

اس نے امت کو ملی ہوئی آسمانی شریعت کے تحفظ کو اپنا اصل مقصد عمل بنایا ہے اور شریعت کی مشترک و بنیادی ضرورتوں اور اس کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی فکر کرتا ہے۔ وہ اپنی کارکردگی میں اس بات کی فکر رکھتا ہے کہ کم سے کم امت کے بنیادی مقصد اور بنیادی تقاضوں کے سلسلہ میں امت کے سارے کارگزار افراد اور جماعتیں اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیں تاکہ امت کو مضبوطی حاصل ہو جائے اور امت اپنے دینی و ملی تقاضوں کو آپس کے تعاون اور یکجہتی کے ساتھ پورا کر سکے، جس کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ امت کی ملی اور دینی ضرورتوں کے لئے اس کو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے حکومتی سرپرستی حاصل نہیں ہے، وہ اگر اپنے بنیادی مقاصد میں یکجہتی اور وحدت کو اختیار نہ کر سکے گی تو اس کو اپنے ملی اور دینی تحفظ کا فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ ہمارا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اسی عیب سے بچانے کے لئے اپنی ذمہ داری کو مشترکہ اور بنیادی تقاضوں تک محدود رکھتا ہے کہ جن میں سب کا تعاون حاصل کر سکتا ہے، اور یکجہتی کے ساتھ خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے۔ لیکن بورڈ اس سلسلہ میں پوری کامیابی اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اس کو سب کا تعاون حاصل ہو، اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ وسائل بھی مہیا ہوتے رہیں، یہ وسائل کارگزار افراد کی صورت میں اور مالی تقاضوں کی صورت میں مطلوب ہیں۔ کارگزار افراد کے معاملہ میں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ملت کی خاطر اپنی صلاحیت اور وقت امت کی ضرورت میں

حسب استطاعت لگاسکیں، اس سلسلہ میں بورڈ کو ابھی تک کمی کا سامنا ہے، جس کے لئے اس کو خیر خواہان ملت کو توجہ دلانے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اسی طرح مالی وسائل کے سلسلہ میں بھی اہل فکر اور امت کا درد رکھنے والوں کو توجہ کی ضرورت ہے۔

اس وقت ملک کے جو حالات ہیں، اور ملت اسلامیہ کو جو مسائل درپیش ہیں ان کو حل کرنے کے لئے اور جو خطرات ہیں، ان سے امت کو بچانے کے لئے ملت کے دانش وروں کو بہت توجہ کرنے کی ضرورت ہے، امت کی ضرورت اور اس کی صورت حال اس بات کی بہت طالب ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس طرح کے مواقع پر بے توجہی اور کوتاہی کا امتوں کو بڑا نقصان پہنچا ہے، جس سے سابقہ امت مسلمہ کو بھی پڑا ہے، اس سے محفوظ رہنے کے لئے خیر خواہان ملت کو پوری توجہ کا ثبوت دینے کی ضرورت ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ ومدیر ماہنامہ ''معارف قاسم'' سپول بہار اس سلسلہ میں فکر مندی اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہوئے مختلف جہتوں سے خدمت انجام دے رہے ہیں، جس کے لئے مجلّہ معارف قاسم بھی مفید ذریعہ ہے، ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اس کا خصوصی شمارہ مسلم پرسنل لا بورڈ سے متعلق شائع کرنے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔

والسلام

۳۰/۱۰/۱۴۲۹ھ مطابق ۳۱/۱۰/۲۰۰۸ء

☆☆

پیغام

● متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی
جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم، دیوبند

گوناگوں مسائل ومشکلات میں الجھی امت کے لئے نجات کی راہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور شریعت پر عمل پیرا ہوں۔ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کو دستوری طور پر تحفظ حاصل ہے، لیکن امت کو شریعت پر عمل کرکے یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ خود پر شرعی اصول وقانون کی بالادستی پر فرحاں ونازاں ہیں۔ معاشرہ میں درآئیں خرابیٔ بسیار کو ختم بھی اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب مسلمان خود کو شرعی اصولوں کا پابند کردیں۔ جہاں تک مسلم پرسنل لا پر آئے دن مختلف راستوں سے حملوں کی بات ہے تو اس کے تدارک کے لیے جو کوششیں مسلم پرسنل لا بورڈ کررہا ہے وہ قابل قدر وستائش ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے اتحاد امت کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ لائق تقلید ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بورڈ کی آواز پر لبیک کہیں اور اعتماد واتحاد کا مظاہرہ کریں۔

جواں سال عالم دین عزیز مکرم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کا خصوصی شمارہ ''مسلم پرسنل لا نمبر'' شائع ہونے جارہا ہے اس کے لیے مدیر موصوف مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ شمارہ مسلم پرسنل لا کی حقیقت سے بھی عوام کو آگاہ کرے گا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمات پر بھی روشنی ڈالے گا۔

والسلام

۳ر محرم الحرام ۱۴۳۰ھ بمطابق یکم رجنوری ۲۰۰۹ء

پیغام

● عالم ربانی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بخدمت عالی حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی
بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ آنجناب اپنے ماہنامہ ''معارف قاسم'' کا خصوصی شمارہ شائع کررہے ہیں، اوراس خاص شمارہ کے ذریعہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی حقیقت، شرعی حیثیت اوراس کے تحفظ پر روشنی ڈالی جائے گی، نیز مسلم پرسنل لا کی جملہ خدمات اور پیش رفت کا جائزہ لیا جائے گا اور بورڈ کی قانونی اور اجتماعی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بورڈ سے وابستہ تمام اہم شخصیات کی بایوگرافی بھی شائع کی جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کا متحدہ شرعی اور اجتماعی ادارہ ہے، اس کے ذریعہ ہم زندگی کے تمام پہلوؤں کو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں پیش کرکے آئین میں دیئے گئے حقوق کے مطابق زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور جن مسائل میں شریعت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں ہم اپنا اسلامی موقف اپنا کر کسی ایسی بات پر راضی ہونے کا اختیار نہیں رکھتے جس میں ایمان وعقیدہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، ہمارا اسلامی موقف بالکل واضح ہے اور یہ ادارہ اس موقف کو ہر جگہ سامنے لانے اور اس کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچنے سے روکنے کا ذمہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے اس خصوصی نمبر کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے ادارے کا ترجمان اور زبان حقیقت ثابت ہو۔

۱۶ر صفر المظفر ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۴ر فروری ۲۰۰۸ء والسلام

پیغام

● امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ
امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ پورے ملک کے مسلمانوں کی جملہ تنظیموں مختلف مسالک کے لوگوں علماء وقانون دانوں اور دوسرے طبقوں کے با اثر لوگوں کا ایک متحدہ و متفقہ پلیٹ فارم ہے جس کا مقصد شریعت اسلامی اور شعائر اسلامی کا تحفظ ہے اور اس ملک میں مسلمانوں کو اپنے دینی واسلامی تشخص کے ساتھ زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا ہے اس کے خلاف کوئی بات باہر سے آئے یا خود مسلمانوں کے اندر پائی جائے تو اس کا معقول اور مؤثر جواب دینا اور حکومت کے ساتھ مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی تحریک چلانا ہے۔ یہ بورڈ ۷۳-۱۹۷۲ء میں قائم ہوا اور الحمدللہ آج تک یہ اپنی بنیادی ذمہ داری کو پورا کررہا ہے۔ ملک کے مختلف بڑے شہروں میں اس کے ۲۰ر بڑے اجلاس ہوچکے ہیں۔

علماء وائمہ کو چاہئے کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں شریعت اسلامی کی اہمیت اور مسلم پرسنل لاء سے متعلق مسائل وضروریات عوام کے سامنے بیان کریں۔ نکاح میں سادگی سے کام لیا جائے، طلاق میں جلدی نہ کی جائے، وراثت میں شریعت کی پوری پوری پیروی کی جائے۔ اسلام میں عورتوں کے جو حقوق بیان کئے گئے ہیں، مردوں کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو بیان کیا جائے۔ صالح مسلم معاشرہ کیسے وجود میں آسکتا ہے اس کی تلقین کیا کریں۔ ایک بات یہ ضرور بتائی جائے کہ اگر میاں بیوی یا خاندان کے درمیان کوئی جھگڑا پیدا ہوجائے تو اس کو سرکاری عدالت میں لے جانے کے بجائے آپس میں علماء کے مشورہ سے یا دارالقضاء میں قاضی شریعت کے سامنے

پیش کر کے فیصلہ کرالیں یہ آسان ہے اور اس میں مسلمانوں کی عزت بھی قائم رہتی ہے۔

ہمارے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ارکان اور مدعوئین کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلک، برادری یا علاقہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو آپس میں تفریق پیدا کرنے سے روکیں اور کلمہ واحدہ کی بنیاد پر متحد و منظّم رہنے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ ایک اور بات جس کا بالواسطہ مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ سے گہرا تعلق ہے وہ دینی تعلیم ہے۔ ہمارے پانچ فی صد بچے ہی مدرسوں اور دینی مکاتب میں پڑھتے ہیں۔ باقی بچے اور بچیاں اسکول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ان کے والدین خاص کر انگلش میڈیم اسکول اور عیسائی مشنریوں کے اسکولوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے اگر خصوصیت کے ساتھ تمام بچوں کو چھ سال سے گیارہ سال کی عمر کے درمیان دینی تعلیم سے آراستہ نہیں کیا گیا تو وہ شریعت اسلامی سے واقف ہی نہیں ہوں گے اور وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دینی تعلیم سے قطعی محروم رہ جائیں گے۔ جیسا کہ آپ بہت سارے مسلم مرد وعورتوں کو جو صرف جدید تعلیم یافتہ ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ وہ محض چند رسمی عبادتوں کو ہی اسلام سمجھتے ہیں اور ان کی پوری زندگی پر غیر اسلامی تہذیب چھائی ہوئی ہوتی ہے۔

الحمدللہ اس کا احساس ملک میں پایا جارہا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ارکان بورڈ و مدعوئین کرام اور دوسرے علماء کرام، مسلمانوں میں دینی شعور کی بیداری کے لئے کام کرنے والے حضرات زیادہ متوجہ ہوں۔

میں مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ وہ اپنے رسالہ 'معارف قاسم' کا خصوصی شمارہ 'مسلم پرسنل لا نمبر' شائع کررہے ہیں، اس سے مسلم پرسنل لا اور مسلم پرسنل لا بورڈ سے عوام واقف ہوسکیں گے اور سماجی بیداری آئے گی۔

والسلام

۵/صفر المظفر ۱۴۳۰ھ ـــ بمطابق یکم/فروری ۲۰۰۹ء

☆☆

پیغام

فقیہ گجرات حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری خلیفۂ مجاز فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند۔ مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل، گجرات

محبّ مکرم ومحترم مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی زیدت مکارمکم
بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول بہار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' ایک خصوصی شمارہ مسلم پرسنل لا نمبر شائع کررہا ہے جس میں اس موضوع پر مختلف حیثیتوں سے روشنی ڈالنے والے وقیع مضامین شائع کئے جائیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس نمبر کی اشاعت کو آسان فرمائے، اس کی راہ کی رکاوٹیں دور فرمائے، اس کے لئے جو اسباب ووسائل مادی اعتبار سے مطلوب ہیں مہیا فرمائے اور اس اشاعت کو حسن قبول عطا فرما کر اس سے امت مسلمہ کو بے حد فائدہ پہنچائے، دل سے دعاء کرتا ہوں۔

والسلام

۲/جمادی الآخر ۱۴۲۹

☆☆

پیغام

● تحفظ مدارس گجرات کے پاسبان حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی
بانی ومہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر بھروچ، گجرات

اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہدایات و قوانین موجود ہیں، اسلامی تعلیمات کا وہ حصہ جس کا تعلق انسان کی ذاتی اور شخصی زندگی سے ہے یا جس کا تعلق مسلمانوں کی عائلی اور خاندانی زندگی سے ہے اسی کا نام مسلم پرسنل لاء ہے۔ یہ شخصی اور عائلی قوانین ہی وہ روحانی تحفہ ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنا ملی تشخص قائم رکھ سکتا ہے اور یہ پرسنل لاء ہی اسلامی تہذیب کا وہ قیمتی اثاثہ ہے جس سے مسلم معاشرہ دوسرے معاشروں سے ممتاز ہوسکتا ہے، جس پر عمل کرنے کے نتیجے میں ایسا معاشرہ تیار ہوسکتا ہے جس کا وجود خدا کی وحدانیت اور ربوبیت سے سرشار ہوگا جس میں پیغامات محمدیؐ اور سنن احمدی کا جلوہ قدم قدم پر نمایاں ہوگا۔ یہ تعلیمات اب ایسی اہم اور ضروری ہے تو پھر اس کی جانب کامل توجہ ہر صاحب ایمان کے دل کی دھڑکن ہونی چاہئے، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اصلاح معاشرہ کی کوششوں کو تیز تر کیا جائے جو بعد کے اہم ترین اور بنیادی مقاصد میں داخل ہے، وقفہ وقفہ سے ملک گیر دورے اور وسیع پیمانے پر اعلانات ہوں اور ائمہ مساجد کو بھی اپنے خطبات کا موضوع بنانا چاہئے، تاکہ عام زندگی پر اس کے اثرات پڑے۔

اس وقت ملک کے جو حالات ہیں اور ملت اسلامیہ کو جو مسائل درپیش ہیں ان سے نپٹنے کے لئے اور جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان سے امت کو بچانے کے لئے قوم کے

دانشوروں کو بڑی فکرمندی اور ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں تمام مکاتب کے اربابِ حل وعقد کو اپنے مسلکی تعصّبات سے بالاتر ہوکر اور گروہی عصبیتوں سے اوپر اٹھ کر کوئی ٹھوس اور مضبوط قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے سارے افراد اور جماعتوں کو باہم متحد ومتفق ہونا اور ایک دوسرے کا تعاون کرنا، یکجہتی بنائے رکھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ درپیش خطرات کا صحیح طور پر مقابلہ کیا جاسکے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کرم فرما مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ ومدیر ماہنامہ ''معارف قاسم'' سپول، بہار اس سلسلہ میں بڑی فکرمندی اور مستعدی کے ساتھ کام کررہے ہیں، بالخصوص مذکورالذکر ماہنامے کے صحافتی پلیٹ فارم سے اس جانب لوگوں کو مسلسل متوجہ کررہے ہیں، ہم ان کو مسلم پرسنل لاء سے متعلق خصوصی شمارہ شائع کرنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔

فقط والسلام

۲۴؍محرم الحرام ۱۴۳۰ھ، بروز جمعرات
بمطابق ۲۲؍جنوری ۲۰۰۹ء

☆☆

پیغام

● حضرت مولانا سید جلال الدین انصر عمری
امیر جماعت اسلامی ہند

یہ امر باعث مسرت ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ میں اب مسلم پرسنل لاء اور اس کے مسائل سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اور اس کی آواز شہروں سے نکل کر دیہاتوں تک پہنچ رہی ہے جس کا اندازہ کلکتہ کے حالیہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس سے کیا جاسکتا ہے جس میں لاکھوں فرزندانِ توحید کا جم غفیر، علماء کرام اور دانشورانِ ملت کی رہنمائی سے مستفید ہونے کے لیے امنڈ پڑا تھا۔

ایسے حالات میں آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ: (۱) مسلمان اپنے پرسنل لاء کے احکام سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس سلسلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تیار کردہ لٹریچرس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے عائلی قوانین اور اسلام کے خاندانی نظام پر جو لٹریچر تیار کیا ہے وہ بھی اس سلسلہ میں بہت مؤثر اور کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ (۲) مسلمانوں کو اپنے پرسنل لاء پر ملکی دستور کے مطابق عمل کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ملک کی عدالتیں مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کرتی ہیں، اس کے خلاف فیصلے دے دیتی ہیں جب کہ مسلم پرسنل لاء کی ترجمانی کا حق مسلمان علماء کو ہونا چاہیے اور عدالتوں کو اس کی روشنی میں فیصلے کرنے چاہئیں۔ یہ آواز پریس اور پلیٹ فارم سے بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ (۳) مسلم پرسنل لاء کے احکام و مسائل نکاح، خلع، طلاق، وراثت وغیرہ مسائل پر مسلمان عوام و خواص کو ٹھوس اور مستند معلومات پہنچانے کا انتظام شہروں، اور

دیہاتوں میں وسیع پیمانے پر کیا جانا چاہئے۔ اس کے لیے خطبات جمعہ، مسئلے مسائل پر مشتمل مستند دینی کتابیں، ٹی وی پروگرام، آڈیو، ویڈیو کیسٹ، سی ڈی، ڈی وی ڈی، اصلاحی اور تبلیغی جلسے، دینی نشستیں، حلقے اور تعلیم بالغان کے مراکز مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ مراسلاتی اسلامی کورس چلانے والے مسلم ادارے، مسلم پرسنل لاء سے متعلق مسائل کو بھی اپنے نصاب میں شامل کرکے اہم دینی اور ملی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ (۴) مسلمانوں کی ذہن سازی کی جائے کہ وہ اپنے نزاعی مسائل مروجہ عدالتوں کے بجائے شرعی عدالتوں/پنچایتوں میں لے جائیں اور وہاں سے اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے حاصل کرائیں۔ (۵) جہاں دارالقضاء پنچایتیں قائم نہ ہوں وہاں دارالقضاء یا شرعی پنچایت قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مرکزی دفتر سے تعاون اور رہنمائی حاصل کی جائے۔ (۶) مسلمان اپنے طور پر مسلم پرسنل لاء کے تحت زندگی گزارنے کا عہد کریں اور دینی احکام و مسائل سے واقفیت اور آگاہی کے لئے مخلصانہ اور سنجیدہ کوشش کی جائے۔ یہی اس مسئلہ کا اصل حل ہے اس کے بغیر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی، گرامی قدر مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی و مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ و مدیر ماہنامہ ''معارف قاسم'' قابل مبارک باد ہیں جنہوں نے حالات کو بروقت سمجھا اور معارف قاسم کا خصوصی شمارہ ''مسلم پرسنل لانمبر'' شائع کرنے کا ارادہ کیا جو امت مسلمہ کے لئے اصلاح معاشرہ کے موضوع پر اہم رول ادا کرے گا۔ دعا ہے کہ مسلم پرسنل لاء پر آپ کا یہ خصوصی شمارہ کامیاب ہو اور عامۃ المسلمین کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہو۔

والسلام

۱۴۲۹/۱۰/۲۵ھ بمطابق ۲۰۰۸/۱۰/۲۶ء

☆☆

پیغام

● پاسبانِ ملت کے جانباز سپاہی حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی
ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

محبّ مکرم حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کا خصوصی شمارہ ''مسلم پرسنل لانمبر'' شائع ہونے جارہا ہے۔اس کے لیے مدیر محترم قابل مبارک باد ہیں۔ ہندوستان میں مسلم پرسنل لاکو آئینی درجہ حاصل ہے اسی کی روشنی میں یہاں کے مسلمان شرعی اصولوں پر زندگی گذارنے کے لیے آزاد ہیں۔امارت شرعیہ نے آٹھ دہائی سے مسلم پرسنل لا کے نفاذ کی جدوجہد کی ہے اوراس سلسلہ میں کامیاب تجربہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ جب یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لاکو آئینی حیثیت کے باوجود طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں تو مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کا خاکہ سب سے پہلے امارت شرعیہ ہی نے پیش کیا تھا اور بورڈ کو مضبوط ومستحکم کرنے میں بھی امارت شرعیہ سرگرم اورپیش پیش ہے۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مسلمانوں کو دارالقضاء کے نظام سے مربوط ہونا ہوگا۔اگر پوری امت مسلمہ اپنے تنازعات اور عائلی مسائل کو دارالقضاء سے حل کرائیں تو بہت سے مسائل ازخود حل ہوجائیں گے اور مسلم پرسنل لا پر منڈلاتے خطرات کے سائے کالعدم ہوتے چلے جائیں گے۔میں امید کرتا ہوں کہ اس نہایت اہم موضوع پر شائع ہونے والا خصوصی نمبر اہل علم خرد کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ والسلام

۱۵؍شوال المکرّم ۱۴۲۹ھ بمطابق ۱۴؍۱۰؍۲۰۰۸ء

پیغام

● عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاریؒ
خلیفۂ اجل حکیم الاسلامؒ ومہتمم جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد، وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین، بعد!

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ عزیز القدر حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ اپنے ماہنامہ معارف قاسم جدید کا خصوصی شمارہ مسلم پرسنل لا کے عنوان سے شائع کرنے جارہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا پر خطرات کے سائے ہر عہد میں منڈلاتے رہے ہیں،لیکن اکابر علماء کرام اور دانشوران امت ہر موقع پر مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور شریعت اسلامیہ کی بقا کی جدجہد کرتے رہے ہیں۔ چاہے عدالتی سطح پر یا معاندین اسلام کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے اساسی عقیدہ پر جب جب سوالات کھڑے کئے گئے ہیں علماء نے اس کے دفاع میں اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کردی ہیں۔ فی زمانہ بھی مسلم پرسنل لا پر کئی طرح کے اعتراضات ہورہے ہیں اور ملک میں وشو ہندو پریشد جیسی تنظیمیں آئے دن مسلمانوں کے شعائر پر انگشت نمائی کررہی ہیں ایسے میں ملت اسلامیہ کا ایک ہونہار فرزند مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی اپنی قلمی صلاحیت کے ساتھ آگے آرہا ہے اور حتی المقدور دفاع کی کوشش کررہا ہے جو مبارک اور اطمینان کا باعث ہے، میں موصوف کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اس خصوصی شمارے کو قبول عام حاصل ہو۔

۵؍شوال المکرّم ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۶؍۱۰؍۲۰۰۸ء

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (سورہ یونس:۶۴)

(ان کے لئے ہے خوش خبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں بدلتی نہیں اللہ کی باتیں یہی ہے بڑی کامیابی۔)

(ترجمہ: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی)

باب اوّل

مسلم پرسنل لاء کیا ہے؟

انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو اس کی شخصی اور خاندانی زندگی ہے جس کا دائرہ محدود ہے، اس میں انسان کے ذاتی معاملات آتے ہیں یا پھر وہ چیزیں ہیں جو اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان معاملات اور حقوق وفرائض سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً ازدواجی تعلق، ماں باپ اور اولاد کا تعلق، وراثت، ایک دوسرے پر نفقہ اور حق پرورش وغیرہ، اس زندگی کو ہم شخصی اور خاندانی زندگی (Personal & Family Life) کا عنوان دیتے ہیں، دوسری زندگی شہری اور اجتماعی زندگی ہے جس کا دائرہ خاندانی تعلقات کے حدود سے آگے بڑھ کر شہر، ملک اور بین الاقوامی امور تک کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے، اسے ہم اجتماعی اور شہری زندگی کا نام دیتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کے ہر گوشہ کے لئے (خواہ اس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہو یا انفرادی زندگی سے) اصول بتائے ہیں جن پر حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا ہے۔

قرآن پاک کی تعلیمات، حضور اکرم ﷺ کی ہدایتوں اور صحابہ کرامؓ کی تشریحات کی روشنی میں فقہائے اسلام نے زندگی کے تمام گوشوں کے لئے قوانین مرتب کر دیئے جنہیں اصطلاح میں ہم 'فقہ' کہتے ہیں یہ پوری 'فقہ' قرآن وحدیث کی بنیادوں پر مرتب ہوئی ہے۔ اور جس طرح انفرادی زندگی کے قوانین پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے، اسی طرح ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اجتماعی زندگی کے قوانین پر بھی عمل کریں۔

لیکن ہوا یہ کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور مسلم حکومتوں میں شخصی رجحان اور خدا کے حکم کے بجائے بادشاہ کی خواہش کے احترام کا جذبہ آتا گیا، اجتماعی قوانین جن کی روشنی میں حکومت چلائی جاتی تھی، عملاً ختم ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ اسلام کے بہت سے اجتماعی قوانین کتابوں میں محفوظ ہوتے چلے گئے اور عملی زندگی سے اس کا واسطہ کم ہوتا گیا۔

ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے حکومت چلانے کیلئے اپنا قانون نافذ کیا، جس کے نتیجہ میں اسلام کا ''اجتماعی قانون زندگی'' غیر متحرک ہوکر محض کتابوں میں رہ گیا اور صرف 'انفرادی زندگی' کے قوانین عملاً باقی رہ گئے جس کے نفاذ کے لئے حسب سابق قاضی مقرر ہوئے، بعد میں یہ قضاء کا نظام بھی ختم ہوگیا اور شخصی وعائلی زندگی سے متعلق اسلامی قوانین کے نفاذ کا اختیار بھی عام سرکاری عدالتوں کے حوالہ کردیا گیا۔ انفرادی زندگی کے یہ اسلامی قوانین جنہیں برطانوی حکومت نے اپنے قانون میں جگہ دی، 'مسلم پرسنل لا' کہلائے اور 'مسلم پرسنل لا' کا دائرہ صرف وراثت، نکاح، حضانت، خلع وطلاق، فسخ، مہر، نفقہ اور اوقاف وغیرہ تک محدود رکھا گیا..... گویا 'مسلم پرسنل لا' کی اصطلاح انگریزوں کا عطیہ ہے جو انفرادی اور خاندانی زندگی سے متعلق اسلامی قوانین کا ایک حصہ ہے..... یہی 'مسلم پرسنل لا' اب تک چلا آرہا ہے۔ یہ گفتگو اس نتیجہ تک پہنچائی کہ 'مسلم پرسنل لا' قوانین اسلامی کا ہی ایک حصہ ہے جن کی تفصیلات فقہاء اسلام کے ہاتھوں مرتب ہوئی تھیں، اور جن کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے۔

نئے مسائل اور ان کا حل:

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ 'مسلم پرسنل لا' دراصل شریعت اسلامی کے ایک خاص حصہ کا نام ہے، جو مسلمانوں کی شخصی وعائلی زندگی پر نافذ ہے تو اب اس کا کتنا اور کہاں تک امکان باقی ہے کہ موجود دور کے علماء اس میں تبدیلی لائیں اور اسے بدل کر کوئی ایسا 'پرسنل لا'

مرتب کریں جو ایک خاص قسم کے دانشور طبقہ کے مزاج کے موافق ہو، اس طرح کی تبدیلی حکومت کی خواہش کے مطابق تو ہوسکتی ہے، اسلام کے دستور کے مطابق نہیں ہوسکتی۔

یہ صحیح ہے کہ جدید ترقی نے معاشرہ کو بالکل نئی صورت حال سے دوچار کردیا ہے۔ یہ نئی صورت حال یقیناً اسلامی ہدایت کی طلب گار ہے۔ علماء کو نئے مسائل کا اسلامی حل دریافت کرنا ہوگا اور ان نئے سوالات کے جوابات دینے ہوں گے جن پر فقہ کی قدیم کتابوں میں بحث نہیں کی گئی ہے، لیکن ایک تو یہ ایسے مسائل بہت زیادہ نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ ایسے مسائل کی تعداد جتنی بھی ہو، ان کا حل حکومت کی متعین کردہ راہوں پر تلاش نہیں کیا جاسکتا، نہ ان معاملات میں مخصوص قسم کے دانشوروں کے مزاج کو بنیادی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ بلکہ ان کے لئے وہی طریقہ اپنانا ہوگا جو طریقہ کار ماضی میں علماء کرام نے نئے نئے مسائل کے حل کیلئے اختیار کیا تھا، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کو بنیادی حیثیت دینا ہوگی، اصول فقہ کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اور فقہ اسلامی کے عظیم خزانہ سے مدد لینی ہوگی، اس طرح نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور اسلام ان کا حل بھی پیش کرتا رہے گا۔

(اس موضوع سے واقفیت کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'')۔

کیا حکومت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتی ہے؟:

حالات اور واقعات کی جو ترتیب ادھر چند برسوں میں سامنے آئی ہے، انہیں دیکھتے ہوئے حکومت کے ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا اور اس ملک کا دستور بنا تو اس ملک کو ایک 'جمہوری ملک' بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس میں فرد کے ذاتی رجحانات، افکار وعقائد، مذہب وثقافت اور

تہذیب وتمدن کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ایک عنوان 'سیکولرزم' کا اختیار کیا گیا جس کی وضاحت یہ کی گئی کہ ہندوستان کا نظام حکومت کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوگا اور ہر شہری کو اپنے طور پر مذہبی امور میں آزادی حاصل رہے گی۔ اس طرح ایک مذہب کے ذریعے دوسرے مذہب کا استحصال نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک خوش آئند تصور تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستان کے جمہوری نظام حکومت کے تحت سکون کی زندگی گذاریں گے، لیکن ارباب سیاست نے اب 'سیکولرزم' کا مطلب 'رواداری' اور 'غیر مذہبی' کے بجائے 'مذہب کی نفی' طے کر کے ایسے معاشرہ کے قیام کی جدوجہد شروع کردی ہے جس میں مذہب کے اثرات ختم ہوجائیں۔

یہی ذہنیت مسلم پرسنل لا کی جگہ '' یکساں شہری قانون'' (Uniform Civil Code) نافذ کرانا چاہتی ہے..... اور اس سلسلہ میں دستور ہند کے بجائے رہنما اصول (Directive Principle) کی دفعہ 44 کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں یکساں شہری قانون نافذ کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ جس وقت دستور ہند بنا تھا، رہنما اصول کی یہ دفعہ زیر بحث آئی تھی اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کردیا گیا ہے۔ اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں..... یہ ساری بحث دستور ساز اسمبلی کی پروسیڈنگ میں موجود ہے۔

عدالتیں اب بھی رہنما اصولوں کے مقابلے میں بنیادی حقوق کو زیادہ اہمیت دیتی رہی ہیں، لیکن سیاسی رہنما مختلف عوامل کی وجہ سے رہنما اصولوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان رہنما اصولوں کے سہارے 'مسلم پرسنل لا' میں ترمیم وتنسیخ کا مطالبہ کبھی واضح اور کبھی مبہم الفاظ میں کیا کرتے ہیں۔

حکومت نے اب تک براہ راست تو نہیں، لیکن بعض عمومی قوانین کے ذریعہ 'مسلم

پرسنل لا' میں تبدیلی کی کوشش کی ہے اور کچھ ایسے احکام اور ہدایتیں جاری کی جاچکی ہیں جن کے باعث ملک میں مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ 'مسلم پرسنل لا' پر عمل نہیں کرسکتا..... مثلاً یہ حکم جاری کیا گیا کہ حکومت کا کوئی ملازم اجازت حاصل کئے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا، اس حکم سے مسلمان مستثنیٰ نہیں ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تعدد ازدواج جو 'مسلم پرسنل لا' کا اہم مسئلہ ہے، کو حکومت نے مسلمانوں کے ایک حلقہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا، اور اب آسانی کے ساتھ اس حلقہ کو وسیع کیا جاسکتا ہے اور اس حکم کو فیکٹریوں، مختلف قسم کے نیم سرکاری اداروں اور دوسرے سیکٹروں میں کام کرنے والوں پر نافذ کیا جاسکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اہم قدم متبنیٰ بل (Adoption of Children Bill) کی شکل میں اٹھایا گیا(1)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس 'بل' کے خلاف آواز بلند کی جس کا اثر حکومت پر ہوا، اور حکومت نے اس بل کے متعلق رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے اسے پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ کردیا بورڈ نے متبنیٰ بل کے سلسلے میں عام مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے واقف کرانے کے لئے اردو انگریزی میں رسالے شائع کئے، اخبارات میں مضامین لکھوائے، بورڈ کے معزز ارکان نے جلسوں اور تقریروں میں اسے موضوع بحث بنایا۔ اور جب پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی نے ملک کا دورہ کر کے رائے عامہ جاننے کی کوشش کی تو بورڈ کے ارکان اور پڑھے لکھے مسلمانوں نے ہر مقام پر اس بل کے خلاف شہادت دی، پارلیمنٹ کی کسی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے کبھی اتنے زیادہ افراد نے اتنے واضح اور مدلل طور پر شہادت نہیں دی تھی۔ مسلمانوں کی اتنی واضح رائے سامنے آنے کے باوجود اس کمیٹی نے نہ فراموش کی جانے والی زیادتی کی ہے کہ اس نے بل کی حمایت میں اپنی رائے دی۔ کمیٹی کے تین مسلم ممبران نے مشترکہ طور پر بل کے خلاف نوٹ لکھا اور یہ مطالبہ کیا اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ حکومت نے مسلمانوں کی رائے

عامہ کے پیش نظر 'بل' کو سرد خانے میں ڈال دیا۔

1978 میں یہ بل پھر راجیہ سبھا میں آیا، اس وقت وزیر قانون مسٹر شانتی بھوشن نے یہ اعلان کیا کہ ''یہ بل مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف ہے اس لئے 'بل' کو واپس لیا جاتا ہے۔'' اس طرح ایک غیر اسلامی قانون سے مسلمان محفوظ رہے۔ متبنیٰ بل کے سلسلہ میں بورڈ کی یہ دوسری کامیابی تھی۔ اب پھر چند نام نہاد مصلحین اور 'بچوں کے ہمدردوں' کی طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ بل دوبارہ پیش کیا جائے۔

اس بل میں تبنیت کو اختیاری اور انفرادی فعل قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے بظاہر اس کا ٹکراؤ ''مسلم پرسنل لا'' سے نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے اثرات بہت دور رس تھے۔ جس کی وضاحت خود وزیر قانون نے پارلیمنٹ میں ان الفاظ میں کی تھی 'یہ مسودہ یکساں سول کوڈ کی طرف مضبوط قدم ہے'۔

اس طرح کے اقدامات ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں حکومت کے ذمہ داروں اور سیاسی رہنماؤں کی نیت صاف نہیں رہی ہے، اور مفکرین قانون یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں اس منطقی امکان سے بحث نہیں کہ اگر اسلامی قوانین شخصی کو ملک کے تمام باشندوں پر نافذ کر دیا جائے تو یکساں سول کوڈ کے باوجود 'مسلم پرسنل لا' پورے پورے طور پر باقی رہ جائے گا۔ کیونکہ یہاں ایسے کسی اقدام کو عملاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ساتھ ہی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے جذبات بھی اس سے مجروح ہوں گے اور اس طرح کی شخصی اور عائلی زندگی میں مداخلت شریعت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

خدانخواستہ اگر یکساں سول کوڈ لایا گیا تو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی بڑی الجھنوں میں مبتلا ہو جائے گی اور بہت سے معاملوں میں ہمیں قانون کے ذریعہ مجبور کیا جائے گا کہ ہم جائز چیزوں کو چھوڑ دیں اور حرام کو قبول کر لیں۔ تفصیلی واقفیت کیلئے ملاحظہ فرمائیے:

('یونیفارم سول کوڈ' شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)۔

ہندوستان کے قانون سازوں کا ذہن مغربی سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے اور قانون بناتے وقت ان کے سامنے کسی مغربی ملک کا کوئی نہ کوئی قانون رہا کرتا ہے، اس لئے یکساں سول کوڈ پورے طور پر مغرب طرز کا ہوگا، جس کی ایک مثال 'ہندو کوڈ' ہے، میرا خیال ہے کہ اگر حکومت نے یہاں یکساں سول کوڈ بنایا تو وہ موجودہ ہندو کوڈ کو یونیفارم سول کوڈ کا نام دے گی، یا اسے تھوڑی بہت ظاہری تبدیلی کے ساتھ سول کوڈ بنا دیا جائے گا۔ ہندو کوڈ کی بنیاد ہندو مذہب کی تعلیمات نہیں، بلکہ مغربی نظریات ہیں مثلاً ہندو کوڈ کی رو سے شادی کے بعد تین سال تک میاں بیوی میں علیحدگی کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور دونوں میں سے کوئی اگر علیحدگی چاہے تو اسے شادی کے بعد کم سے کم سے تین سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہندو کوڈ نے طلاق کا اختیار بھی مردوں سے ختم کر دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ مرد اور عورت میں سے جو بھی علیحدگی چاہے عدالت میں درخواست دے، عدالت اگر علیحدگی کے مطالبہ کو درست سمجھے گی تو علیحدہ کر دے گی۔ یہ سسٹم خدا کے بتائے ہوئے قانون سے صاف طور پر ٹکراتا ہے۔ شریعت (مسلم پرسنل لا) نے اس کا پابند نہیں کیا ہے کہ نباہ ہو رہا ہے یا نہیں، بہر حال تین سال تک میاں بیوی ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہیں، شریعت نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، خلع اور فسخ کا حق عورت کے لئے مخصوص کیا ہے، اس لئے اس طرح کے قوانین ایک مسلمان کی عائلی زندگی کیلئے ناقابل برداشت ہیں۔

ہندو کوڈ میں وارثت کے متعلق بھی دفعات موجود ہیں۔ یہ دفعات بھی اسلام کے قانون وراثت سے ٹکراتی ہیں۔ مثلاً ہندو کوڈ نے ماں، بیوی، بیٹا اور بیٹی کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ اگر مرنے والے کے یہ چاروں وارث موجود ہوں تو جائداد برابر تقسیم کی جائے گی اور سبھوں کو برابر حصہ ملے گا۔ جبکہ اسلام نے ان چاروں کے لئے چار الگ درجات متعین کئے ہیں اور ہر ایک کے حصہ کی مقدار بتا دی ہے، اس طرح ہندو کوڈ کا وہ پورا حصہ جو میراث

سے متعلق ہے اسلام کے قانون میراث سے بالکل الگ ہے۔ بہت سے وہ لوگ جو اسلامی قانون کے لحاظ سے حقدار یا زیادہ کے حقدار ہوا کرتے ہیں ہندو کوڈ کی نظر میں ان کا حصہ کم ہوگا یا نہیں ہوگا اور بہت سے وہ لوگ جو اسلامی قانون کے لحاظ سے کم کے مستحق ہیں یا جنہیں کچھ نہیں ملنا چاہئے وہ ہندو کوڈ کے مطابق زیادہ پا سکتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس طور پر کچھ لوگوں کی حق تلفی اور کچھ لوگوں کو بے جا نفع پہنچتا ہے جو غلط ہے۔

اسلامی تعلیمات کے جو عالمگیر اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں اور دستوروں میں وراثت کا نظام جاری کیا گیا ہے، اور مرنے والے کے مال کو خاندان کے مختلف افراد میں تقسیم کرنے کا تخیل ابھرا ہے، ہندوستان میں بھی ماضی میں تقسیم وراثت کا تخیل موجود نہیں تھا، اسلامی قانون سازی کی افادیت اور تقسیم دولت کے اصول نے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن کو متاثر کیا، اور ان میں وراثت کے قانون کو مرتب کرنے کی تحریک ہوئی، لیکن جب انہوں نے قانون سازی کی تو اساتذہ مغرب کی نقالی کی، جب کہ خود مغرب میں یہ تخیل اسلامی ہدایات کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا، جسے اساتذہ مغرب نے اپنے انداز پر ڈھال لیا۔

دونوں قوانین کے درمیان جو فرق ہے اس کی یہ چند مثالیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب سے برآمد کیا ہوا یہ ہندو کوڈ مسلم پرسنل لاء سے بالکل الگ اور مخالف قانون ہے۔ یکساں سول کوڈ موجود ہندو کوڈ سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا اس لئے اگر مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ کو نافذ کیا گیا، تو مسلمانوں کی عائلی زندگی کی پوری عمارت ڈھہ جائے گی۔

☆☆

مسلم پرسنل لاء اور ہماری ذمہ داریاں

● قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

قانون کی اہمیت:

اس سلسلے میں بہت مختصر الفاظ میں واضح کرنا چاہوں گا کہ کوئی بھی سوسائٹی اور کوئی بھی سماج قانون کے بغیر منظّم نہیں رہ سکتا۔ قانون لوگوں کے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے۔ سڑک پر ہر شخص کو چلنے کی اجازت ہے، لیکن اگر ٹریفک کا کوئی قانون متعین نہ ہو، ہر شخص کو ہر سمت سے چلنے کی اجازت ہو اور سگنل کا نظام نہ ہو تو یقیناً روزانہ سینکڑوں حادثات ہوں گے اور نہ جانے کتنی جانیں اس بدنظمی کی نذر ہو جائیں گی، اسی کے سدباب کے لئے قانون ایک محافظ کا رول ادا کرتا ہے اور زندگی کی تنظیم اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

قانون کون بنائے گا؟:

اب سوال یہ ہے کہ انسان کے لئے قانون بنانا کس کا حق ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص کسی مشین کو بناتا ہے، یا کسی نئی چیز کو وجود میں لاتا ہے تو وہی اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتاتا ہے اور اس کی رہنمائی کے مطابق اس مشین کا استعمال کیا جاتا ہے، انسان ظاہر ہے کہ خود اپنا خالق نہیں، انسان نے خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ پیدا کیا گیا ہے اور یہ پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ ''**أنتم تخلقونه أم نحن الخالقون**'' (الواقعة59) (کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔)

اس لئے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ ہی کا حکم چلے گا، اسی کا بنایا ہوا قانون انسان کے لئے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار اس کی صراحت فرمائی ہے کہ حلال وحرام کے فیصلے کرنا اللہ ہی کا حق ہے "ان الحکم الا اللّٰہ." (الانعام 57) (حکم صرف اللہ کا) کیونکہ جو خالق ہو وہی صاحب امر بھی ہوگا۔ "الا لہ الخلق والأمر". (الاعراف 54) (سن لو اسی کو پیدا کرنے اور حکم دینے کا حق ہے)۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ قانون بنانے والی شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں دو باتیں پائی جائیں: علم اور عدل۔ علم اس لئے ضروری ہے کہ جو انسان کی ضروریات، انسان کے مفادات وجذبات اور انسان پر پیش آنے والے حالات سے آگاہ نہ ہو، وہ اس کی زندگی کے بارے میں کیسے رہنمائی کرسکتا ہے؟ اور عدل اس لئے ضروری ہے کہ قانون کا مقصد ظلم کو روکنا اور تقاضائے انصاف کو پورا کرنا ہے، کہ جو خود عادل نہ ہو اور انصاف کرنے کی صلاحیت یا اس کا مزاج نہ رکھتا ہو، اس سے اس بات کی امید کیونکر رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمام انسانی طبقات کے بارے میں عدل سے کام لے گا؟

غور کیا جائے تو انسانوں کا کوئی طبقہ، ایک فرد یا مجموعہ قانون وضع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے کہ انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی ضروریات سے واقف نہیں، بلکہ وہ خود اپنے مفادات سے بھی آگاہ نہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کسی کام کو مفید سمجھ کر شروع کرتا ہے، لیکن وہ آخر میں اس کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے، نفع بخش سمجھ کر ایک قاعدہ وضع کرتا ہے، لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد ٹھوکر کھاتا ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون ہی انسانیت کے لئے باعث رحمت ہے:

اللہ ہی وہ ذات ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے، انسان مرد ہو یا عورت، باپ بیٹے ہوں، یا بھائی بہنیں، گورے ہوں یا کالے، کوئی سا بھی خاندان ہو یا قبیلہ، بلکہ انسان ہو یا

جانور، بہائم ومویشی ہوں یا کیڑے مکوڑے سب کا پیدا کرنیوالا وہی ہے، وہ جانتا ہے کہ کس شئ کو اس نے کس لئے پیدا کیا ہے اور کس شئ کے اندر کس بوجھ کو اٹھانے کی صلاحیت ہے، غرض یہ کہ ہر شئ کی بناوٹ، اس کی تخلیق کے مقصد اور اندرونی صلاحیت کو پوری طرح جاننے والا وہی خالق ہے، وہ کسی چیز کا محتاج وضرورت مند نہیں، اس لئے مخلوقات سے خالق کا کہیں ٹکراؤ نہیں ہوسکتا، اسی لئے وہ پوری انسانیت کے ساتھ عدل اور انصاف کا برتاؤ کرسکتا ہے، پس چونکہ اللہ تعالیٰ علیم ہے خبیر ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، اور علم وعدل اس کی ذاتی صفت ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوسکتی، اس لئے قانون بنانے کا اختیار بھی اسی کو ہے اور اسی کا بنایا ہوا نظام بہتر اور خیر ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے " ان الدین عند اللہ الاسلام". (آل عمران 19) (بیشک دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی اسلام ہے)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں کے لئے جو قانون مفید اور جو نظام زندگی معتبر ہے، وہ صرف "اسلام" ہے۔

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو قانون ہمیں عطا فرمایا ہے، اس کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے ایک شعبہ اس قانون کا ہے جو انسانی سماج اور معاشرہ سے متعلق ہے، جس پر خاندانی نظام کی بنیاد واساس ہے، جو سماجی تعلقات کے اصول بتاتا ہے، جس میں خاندان کے مختلف افراد کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے، انہی قوانین کو آج عرب علماء "قوانین احوال شخصیہ" یا اردو میں "عائلی قوانین" اور انگریزی میں پرسنل لا یا فیملی لا (Family Law) کہتے ہیں۔

مسلم پرسنل لا برطانوی عہد میں:

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، گو عام

طور پر ان حکمرانوں کو اسلام سے وہ تعلق نہیں تھا جو ہونا چاہئے تھا اور جو ایک مسلمان سے اس کے دین کا مطالبہ ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسلامی قانون نافذ تھا، جب انگریز اس ملک پر مسلط ہوئے تو آہستہ آہستہ قانون اسلامی کے مختلف شعبوں کو ختم کر دیا تھا، سب سے پہلے 1866 میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کر دیا تھا، پھر قانون شہادت اور قانون معاہدات منسوخ کئے گئے، بالآخر نوبت ''معاشرتی قوانین'' جن میں نکاح وطلاق، خلع، میراث وغیرہ داخل ہیں، کے بارے میں غور کرنے کی آئی کہ کیا ان قوانین میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے ''رائل کمیشن'' (Royal Commission) مقرر کیا، اور غالباً چار بار یہ کمیشن بیٹھا، لیکن ہر بار وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ان قوانین کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، اس لئے ان قوانین میں کوئی تبدیلی براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ انگریز ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے اور انہوں نے طے کیا کہ ان مسائل میں مسلمان ''قانون شریعت'' پر اور ہندو ''دھرم شاستر'' پر عمل کریں گے۔

شریعت اپلی کیشن ایکٹ:

لیکن ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عدالت میں ایک مسلمان لڑکی نے اپنے والد کے ترکہ میں میراث کے لئے مقدمہ دائر کیا، ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی کے نقطہ نظر سے بیٹی لازمی طور پر اپنے باپ کے متروکہ میں وارث ہوتی ہے، بھائی نے اس مقدمے میں جواب دیا کہ چونکہ میں نسلی طور پر فلاں ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور ہندوؤں کے یہاں لڑکیوں کو باپ کے ترکے میں حصہ نہیں ملتا، یہی رواج ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے، اس لئے مجھ پر قانون شریعت کا نفاذ نہیں ہونا چاہئے، برطانوی قانون میں رواج کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ یورپ کے اکثر ملکوں کے قوانین رومن لا (Roman Law) سے ماخوذ ہیں اور

(Roman Law) میں رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسے قانون کا اہم ترین سرچشمہ تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ عدالت نے رواج کو اصل مانتے ہوئے بھائی کے حق میں فیصلہ دیا اور لڑکی کو اپنے باپ کے ترکہ سے محروم رکھا جو قطعاً قرآنی طریقے کے خلاف تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ عورتوں کے ساتھ نہایت ظلم کی بات ہے کہ محض عورت ہونے کی بنا پر اسے میراث سے محروم کر دیا جائے، یہ وہ وقت تھا کہ تمام علماء چیخ پڑے اور پورے ہندوستان میں آواز اٹھائی گئی، ہمارے اکابر علماء نے بڑی زبردست جدوجہد کے بعد شریعت اپلیکیشن ایکٹ پاس کرایا اور ہمارے اکابر مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مشائخ کی مسلسل اور متحدہ کوششوں سے 1937 میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' بنا اس قانون کے مطابق ''نکاح، طلاق، خلع، ظہار، مبارأۃ، فسخ نکاح، حق پرورش، ولایت، حق میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ'' سے متعلق معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان کا فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف اور رواج کچھ بھی ہو اور قانون شریعت کو عرف ورواج پر بالادستی حاصل ہوگی۔

مسلم پرسنل لا دستور ہند میں:

یہ شریعت اپلی کیشن ایکٹ ایک اہم اور دوررس نتائج کا حامل قانون تھا، جو ہندوستان میں مسلمانوں کو پرسنل لا کا تحفظ فراہم کرتا تھا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد بنیادی حقوق میں ''عقیدہ وضمیر کی آزادی'' ہر مذہب والوں کے لئے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی کی دفعات رکھی گئیں، یہ دفعات مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہیں، کیونکہ مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین کتاب وسنت پر مبنی ہیں، اگر ان میں مداخلت کی گئی تو یہ مذہب پر عمل کرنے

میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا، نیز بحیثیت مسلمان جو احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور اس کے مخالف قانون کو قبول نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے نکاح وطلاق کے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں اگر ہم اپنی زندگی کے لئے ان کے مقابلے میں کسی اور قانون کو بہتر اور قابل عمل سمجھتے ہیں، تو یہ بھی کفر ہے، پس گویا مسلمانوں کو ان قوانین میں تبدیلی قبول کرنے پر مجبور کرنا ان کو عقیدہ اور ضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنا ہے، حالانکہ آئین ہند میں بنیادی حقوق کے ذیل میں مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے جس کا لازمی مطلب مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی گارنٹی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے دستور کے رہنما اصولوں میں ایک دفعہ (دفعہ 44) یکساں سول کوڈ سے متعلق رکھ دی گئی ہے، دستور ساز اسمبلی کے مسلم نمائندوں نے دستور بننے کے وقت بھی اس پر اعتراض کیا تھا، لیکن بہرحال یہ شق دستور میں باقی رہی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ رہنما اصول میں بہت سی ایسی مفید ہدایات بھی موجود ہیں جن کے بارے میں حکومت نے کبھی غور کرنے کی بابت سوچا بھی نہیں، حالانکہ عوامی نقطہ نظر سے ان پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے، اور جو لوگ اپنے آپ کو روشن خیال اور دانشور کہتے ہیں ان کو بھی اس جانب توجہ نہیں ہوئی۔

حکومت کے بدلتے تیور:

لیکن دستور کے نفاذ کے کچھ ہی سالوں بعد سے یکساں سول کوڈ کی آواز اٹھنے لگی اور ایسے گمراہ فکر لوگوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا جن کو نہ اپنی قوم میں کوئی اعتماد حاصل ہے اور نہ قانون شریعت سے وہ صحیح طور پر آگاہ ہیں، بالآخر 1972 میں متبنی بل پیش ہوا جس کا مقصد بلا تفریق مذہب ملک کی تمام قوموں کے لئے متبنی کو اپنی اولاد کا درجہ دینا قرار پایا اور ان کو لے پالک لینے والے مرد وعورت کے ترکہ میں وارث قرار دیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ قانون نہ صرف اسلام کے خلاف ہے، بلکہ عقل اور خرد کے بھی خلاف ہے،

کیونکہ والدین اور اولاد کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ صرف زبان سے وجود میں آجاتا ہو، یہ ایک فطری رشتہ ہے اور ایک فطری محبت جو والدین اور اولاد میں ہوا کرتی ہے اس مصنوعی رشتے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام ہی مکاتب فکر نے اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ان حالات کے نتیجے میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایک اجلاس بلایا، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے بڑے خطرے اور اس کی نزاکتوں کو محسوس فرمایا اور اس وقت کے اکابر علماء دیوبند اور دانشور اور قانون داں بھی اکٹھا ہوئے، انہوں نے بعض بہت اہم فیصلے کیے، انہی میں سے ایک اہم فیصلہ ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کنونشن کے انعقاد کا تھا جسے وہاں کے علماء دانشوروں، مسلم سماجی کارکنوں اور مختلف جماعتوں کے ذمہ داروں نے حسن وخوبی کے ساتھ 28-27 دسمبر 1972 میں مہاراشٹرا کالج میں منعقد کیا، اس کنونشن کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

دوسرا مسئلہ پرسنل لا کی شرعی اہمیت:

یاد رکھنا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں جن شعبہائے زندگی کے قوانین شامل ہیں، وہ نہایت اہم ہیں اور ان کی جڑیں کتاب وسنت میں پیوست ہیں، بلکہ زیادہ تر احکام وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح تصریحات وہدایات موجود ہیں۔

جو احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں ان کو ماننا مسلمان اور صاحب ایمان ہونے کے لئے بنیادی شرط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ماکان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم“۔(الاحزاب 36)(کسی مسلمان مرد اور عورت کو اللہ اور اس کے

رسول کے فیصلے کے بعد اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا)۔

گویا جب قرآن وحدیث کے ذریعہ کوئی حکم سامنے آجائے تو اب کوئی اختیار نہیں، ان احکام کے واضح ہونے کے باوجود جو اللہ اور رسول کے بجائے ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں۔

''ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا'' (النساء115)(اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف تو موڑ دیں گے اس کو اسی طرف جدھر وہ مڑ گیا ہے اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

آج مسلمانوں سے جس یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، یہ قانون کس طرح کا ہوگا؟ اسپیشل میرج ایکٹ، اور انڈین سیکشن ایکٹ میں اس کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے، جس کے تحت بین المذاہب شادیاں ہوسکتی ہیں، اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت نکاح کرنے والوں پر شریعت کا قانون میراث لاگو نہیں ہوگا، اسی طرح انڈین سیکشن ایکٹ کی پہلی دفعہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر شخص کو وصیت کرنے کا حق ہے، چاہے جس کے لئے وصیت کرے اور جتنی مقدار کے لئے کردے، لے پالک کے قانون سے مسلمانوں کو استثناء کردیا گیا ہے، لیکن دوسری قوموں کے لئے یہی قانون نافذ ہے کہ متبنیٰ کی حیثیت اصل اولاد کی ہوگی، تو ظاہر ہے کہ یکساں سول کوڈ میں بھی اس طرح کی بات آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ تمام احکام قرآن کے صریح احکام کے خلاف ہیں، اس لئے یکساں سول کوڈ ایک مسلمان کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہے۔

اور اس سے قوانین کو قبول کرنے کا مطالبہ کرنا نہ صرف مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے حق میں مداخلت ہے، بلکہ ان کو عقیدہ وضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنے کے مترادف

ہے اور درحقیقت جمہوریت کا قتل اور ملک کے سیکولر کردار کو مسخ کردینے کی نہایت مذموم اور ناپسندیدہ کوشش ہے۔

ان سطور سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے مسلم پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے اور قانون شریعت کس قدر انسانی فطرت اور انسان کی سماجی ضروریات سے ہم آہنگ ہے۔

خطرات اور اندیشے:

اب ایک نظر ان خطرات پر بھی ڈالئے جو مسلم پرسنل لا کے گرد منڈلا رہے ہیں، یہ بات پہلے آچکی ہے کہ دستور کے بنیادی حقوق میں مسلم پرسنل لا کو تحفظ دیا گیا ہے، دوسری طرف رہنما اصول کی دفعہ 44 یکساں سول کوڈ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، بظاہر دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ معاشرتی قوانین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں پہلے ہی سے یکساں سول کوڈ موجود ہے اور اس پر عمل بھی ہورہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس دفعہ کا اصل نشانہ یہی عائلی قوانین ہیں، چنانچہ جس وقت دستور بن رہا تھا اس وقت بھی ہمارے زعماء نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا، مولانا حسرت موہانی اور جناب محمد اسماعیل مرحوم، نیز دستور ساز اسمبلی کے بعض مسلم ارکان نے اس دفعہ میں ترمیم پیش کی تھی کہ جن قوموں کا پرسنل لا ہے، ان کو ہاتھ لگائے بغیر یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے گا۔

لیکن ملک ابھی آزاد ہی ہوا تھا اس وقت مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے اس سے ہر شخص واقف ہے، مسلمان اس وقت اس موقف میں نہیں تھے کہ اس کے خلاف کوئی تحریک چلاسکیں، چنانچہ یہ ترمیمات رد کردی گئیں اور ڈاکٹر امبیڈکر کی اس وضاحت پر لوگوں کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا کہ ''کوئی پاگل ہی سرکار ہوگی جو مسلمانوں کے پرسنل لا کو ختم کرے گی، کیا وہ پسند کریں گے کہ مسلمان بغاوت کرجائیں''؟

لیکن جوں جوں حالات بدلتے گئے حکومت کی بدنیتی سامنے آنے لگی، اور انہی

حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے 1972 میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اب حالات پہلے سے زیادہ خراب ہیں، پہلے جو سیاسی پارٹیاں اقتدار میں تھیں وہ کم از کم زبان سے قانون شریعت میں تبدیلی کی بات نہیں کہتی تھیں، بلکہ چور دروازے سے اس کام کو کرنا چاہتی تھیں، لیکن اب فسطائی طاقتیں بام اقتدار پر چڑھ چکی ہیں اور انہوں نے اپنے ایجنڈے میں ''یکساں سول کوڈ'' کی بات رکھی ہے، اس لئے اب ہمیں زیادہ قوت، حوصلہ، تدبر اور سمجھداری کے ساتھ یہ لڑائی لڑنی ہے اور ان کا مقابلہ کرنا ہے۔

کیا یکساں سول کوڈ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی؟:

جو لوگ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یکساں معاشرتی قوانین سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی اور تمام قومیں ایک دوسرے سے قریب آئیں گی، لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے، ہمارے ہی ملک کے صوبہ پنجاب میں ایک عرصے تک سکھ اور ہندو ایک دوسرے سے دست وگریباں رہے ہیں، آسام میں آسامیوں اور بنگالیوں، بلکہ خود آسام کے مختلف قبائل میں جس درجہ آویزشیں پائی جاتی ہیں، ان سے کون ناواقف ہوگا؟ حالانکہ ان کے پرسنل لا ایک ہی ہیں، برطانیہ اور جرمنی میں کیسی خونریز جنگیں ہوچکی ہیں جنہیں تاریخ میں ''جنگ عظیم'' کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کا مذہب ایک ہی اور ان کے پرسنل لا بھی ایک ہی تھے، لیکن پرسنل لا کی وحدت نے ان بھیانک جنگوں کو نہیں روکا، ماضی قریب میں عراق اور کویت کی جنگ کل کی بات ہے، حالانکہ دونوں ملکوں کے رہنے والے مسلمان تھے اور ان کے پرسنل لا بھی ایک تھے، تو اگر پرسنل لا کی وحدت قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں مؤثر ہوتی تو یقیناً ایسی بھیانک جنگیں نہ ہوتیں۔

اور پھر سوال یہ ہے کہ قومی یکجہتی کے لئے کہاں تک وحدت پیدا کی جاسکتی ہے؟ اگر معاشرتی قوانین یکساں کر بھی دئے جائیں تو تہذیب وتمدن اور ثقافت کا اختلاف ضرور

باقی رہے گا، زندگی میں انسان قدم قدم پر جس چیز سے دوچار ہوتا ہے اور جس سے تعصب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے وہ ''زبان'' ہے۔ ملک میں کتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہیں، بلکہ آج تک جنوبی ہند کی ریاستوں نے رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو قبول نہیں کیا ہے، تو کیا قومی یکجہتی کے نام پر تمام قوموں پر ایک ہی زبان مسلط کردی جائے گی؟ اور اگر ایسا سوچا گیا تو کیا اس ملک کی وحدت اور سالمیت باقی رہے گی!؟

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ پرسنل لا کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہونے کا خیال محض ایک وہم ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے، بلکہ یہ ملک کے لئے سخت نقصاندہ ہے، اس ملک کی اساس ہی کثیر مذہبی جمہوریت کے تصور پر ہے، اسی ہمہ رنگی میں اس ملک کی بقاء اس کی سلامیت اور اس کی خوبصورتی ہے اور یہی اس دستور کی روح ہے جسے قوم کے معماروں نے خوب سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔

ہماری ذمہ داریاں:

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور جو خطرات ہمارے سامنے ہیں ان کا مقابلہ کریں؟ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کے عادلانہ قانون کے نفاذ کے لئے ہم امت کو مشینری اور سسٹم فراہم کریں۔ یعنی نظام قضاء قائم کریں اور مسلمان رضا کارانہ طور پر شریعت کے فیصلوں کو اپنے اوپر نافذ کریں۔

نظام قضاء کا قیام اور اس کی شرعی اور سماجی اہمیت:

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں اور انہیں جو مقام عطا کیا ہے دنیا کے کسی مذہب اور کسی قانون میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے عدالتی نظام نے ان حقوق کے حاصل کرنے کو بہت ہی دشوار بنادیا ہے، مقدمات کی طویل کارروائیاں اور اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے

مظلوموں کو اپنا حق حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس لئے قانون شریعت سے فائدہ اٹھانے کے لئے دارالقضاء کا نظام نہ صرف شرعی نقطہ نظر سے، بلکہ سماجی اعتبار سے بھی نہایت ضروری اور اہم ہے۔

مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، انہیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی زندگی گزارنی ہے اور کتاب وسنت کے فیصلوں کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فلا وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی أنفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً" (النساء56) (سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مؤمن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے)۔

اللہ اور رسول کا فیصلہ کیسے معلوم ہوگا؟ قاضی کے فیصلے کے ذریعہ، اس لئے مسلمان خواہ کسی علاقہ میں ہو، نظام قضاء کا قائم کرنا ان پر واجب ہے، متعدد فقہاء نے بار بار اس بات کو لکھا ہے، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

"وہ ممالک جہاں مسلمان مغلوب ہیں جیسے قرطبہ، بلنسیہ آج کے زمانے میں، ایسے ملکوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی ایک شخص کے امیر ہونے پر متفق ہو جائیں اور وہی امیر ان کے لئے قاضی مقرر کرے، یا خود خصومات کی سماعت کر کے فیصلہ کرے۔"

چنانچہ ہندوستان میں جب انگریزوں نے تسلط حاصل کر لیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں ہندوستان کے مسلمانوں پر نظام قضاء کے قیام کو لازم قرار دیا اور مختلف علماء نے اس کے لئے کوششیں کیں، بالآخر اس عظیم فریضہ محکمہ کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو اٹھایا اور انہوں نے بہار واڑیسہ میں نہایت منظم طریقہ پر نظام قضاء قائم فرمایا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو شروع سے نظام قضاء کی اہمیت کا احساس ہے، اجلاس جے پور میں اس کے لئے باضابطہ تجویز منظور ہو چکی ہے اور بورڈ نے بار بار علماء اور ارباب حل وعقد کو اس جانب متوجہ کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے ملک میں نظام قضاء کا جال بچھا دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ اپنے نزاعی معاملات کو قاضیوں کے ذریعہ حل کریں، دارالقضاء کے پاس گو پولس کی طاقت نہ ہو، لیکن اس کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہوگی اور اس کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول کی مرضیات کا آئینہ دار ہوگا، انشاء اللہ یہی چیز مسلمانوں کو دارالقضاء تک کھینچ کر لائے گی، انہیں انصاف بھی ملے گا، وہ عدالتوں میں بار بار حاضری کی ذلت سے بھی بچیں گے، جھوٹی قسموں سے اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں گے، بلاوجہ کثیر رقم کے بے جا خرچ سے بھی اپنے آپ کو بچا سکیں گے، اور اسلام کے سماجی قوانین میں جو راحت، جو عدل، جو رعایت اور عافیت ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے، حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلانے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں، حقوق خواہ کتنے بھی مقرر کر لئے جائیں، اگر وہ حاصل نہ ہو سکیں اور ان کے حصول کو آسان نہ بنایا جا سکے تو ان کا کچھ فائدہ نہیں۔

قانون شریعت کی افادیت کا ادراک:

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود قانون شریعت اور اس کی اہمیت سے واقف ہوں اور اپنے آپ کو اتنا باشعور بنائیں کہ نہ صرف دوسرے مسلمانوں، بلکہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی ان قوانین کی افادیت، فطرت انسانی سے ان کی مطابقت اور انسانی زندگی کے لئے ان کی اہمیت بتا سکیں اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کر سکیں، کیونکہ یہ جمہوریت کو بچانے اور سیکولرزم کی حفاظت کرنے کی لڑائی ہے، اس میں ہمیں دوسری اقلیتوں اور خود اکثریتی فرقہ کے سیکولر اذہان کے حامل اشخاص کو بھی ساتھ لینا ہے اس لئے کہ یہ محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس ملک میں مذہبی قدروں کی بقا کا مسئلہ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے

بہت سے مسلمان بھائی جنہوں نے یا تو اسلام کو پڑھا نہیں یا مستشرقین کی کتابوں میں پڑھا ہے، وہ خود اسلام کے تئیں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

احکام شریعت پر عمل:

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم قانون شریعت پر عمل کریں، حقیقت یہ ہے ہم خود ہی اللہ اور رسول کے احکام کو توڑتے ہیں، عورتوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کو روا رکھتے ہیں، بیٹی کو میراث نہیں دی جاتی، بیوہ کو اس کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے، شادیوں میں جہیز اور تلک کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے، بڑی تعداد میں بارات لے جائی جاتی ہے، بعض لوگ عورتوں کو لٹکا کر چھوڑ دیتے ہیں، نہ ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور نہ انہیں طلاق دے کر اپنے نکاح سے آزاد کرتے ہیں، محض جذبہ عناد کے تحت ایک سے زیادہ نکاح کئے جاتے ہیں اور بیویوں کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے، کسی ضرورت شرعی کے بغیر محض وقتی اشتعال کے تحت طلاق دی جاتی ہے اور وہ بھی ''ایک'' نہیں، بلکہ ''تین''۔ غرض بہت سی معاشرتی بیماریاں ہیں جو کچھ تو جہالت اور خدا ناترسی کی وجہ سے ہیں، اور کچھ برادران وطن کے رسم ورواج سے متاثر ہوکر ہمارے سماج میں گھس آئی ہیں، اگر ہم نے ان برائیوں کو دور نہیں کیا تو اللہ کی مدد ہم سے اٹھ جائے گی اور ظاہر ہے کہ نصرت خداوندی کے بغیر ہمارا یہ کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے دوسروں کو اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ قانون شریعت پر انگلیاں اٹھائیں اور شریعت مطہرہ کے خلاف زبان کھولیں، اس سے زیادہ بدنصیبی اور بدبختی کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر انگشت نمائی کا ذریعہ بنیں۔

اتحاد امت:

تیسری ضروری چیز امت کا اتحاد واتفاق ہے، 1972ء میں ہمارے بزرگوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں ایک ایسا قافلہ ترتیب دیا جس میں حوصلہ تھا،

جذبہ اتحاد تھا، قانون شریعت کے تحفظ کا عزم تھا اور ہر قیمت پر راہ کی مشکلات سے گزر کر منزل تک پہنچنے کا پختہ ارادہ تھا، یہی وہ چیز تھی جس نے حکومت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا اور اسی وجہ سے مختلف مواقع پر قانون شریعت کی حفاظت کی مہم میں ہم نے کامیابیاں حاصل کیں، اور آئندہ بھی اتحاد ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔

مصیبت اور آزمائش دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کردیتی ہیں، جب سیلاب آتا ہے اور آندھیاں اٹھتی ہیں تو شیر اور ہاتھی اور سانپ اور نیولے سبھی مل کر اپنی جان بچاتے ہیں، آج مسلمان آزمائش کی اسی گھڑی میں ہیں، فرقہ پرست طاقتیں اقتدار کے نشہ میں ہیں اور وہ اعلانیہ مسلمانوں کو قانون شریعت سے محروم کرنے اور ہم پر خود ساختہ قوانین کو مسلط کرنے کے درپے ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کریں، تاکہ ہمارا شیرازہ بکھر جائے، کیونکہ ایک کمزور اور بکھری ہوئی قوم کو اپنی گرفت میں لینا آسان ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے گروہی مسلکی اور جماعتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر مشترکہ مسائل میں اتحاد کا ثبوت دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم**''. (الانفال46)

(اور آپس میں نہ جھگڑو، پس بزدل ہوجاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا)۔

آخری بات:

اگر ہم اپنی صفوں کو متحد رکھیں گے، اشتعال سے بچتے ہوئے تدبر اور حکمت عملی کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے، اللہ کے دین کی محبت ہمارا زاد سفر ہو اور حوصلہ وہمت ہمارا ہتھیار، باہمی اعتماد اور ہر حال میں نظم واجتماعیت کے ساتھ رہنے کا عزم، تو کوئی طاقت نہیں جو ہماری راہ میں رکاوٹ بن سکے اور ہمیں منزل مقصود تک پہنچنے سے روک سکے۔

والله ولی التوفیق وهو المستعان.

☆☆

مسلم پرسنل لاء کی صحیح تعبیر

● مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

'مسلم' نہیں 'اسلامک' لاء:

حقیقت واقعی یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ 'مسلم پرسنل لا' کہے جانے والے احکام اصلاً دین کا ہی ایک جز ہیں اور ان کی حیثیت ان دوسری قوموں کے شخصی قوانین سے قطعی مختلف ہیں جنہوں نے انہیں خود وضع کر رکھا ہے، انہیں 'مسلم پرسنل لا' کہنا بھی امر واقعہ کی اگر غلط نہیں تو غیر محتاط تعبیر ضرور ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قوانین مسلم نہیں، بلکہ اسلامی قوانین ہیں، ان کا سرچشمہ مسلمانوں کی اپنی عقل وفہم، اپنی پسند اور اپنی صوابدید نہیں، بلکہ قرآن اور سنت ہیں۔ اس لئے انہیں مسلم پرسنل لا کے نام سے یاد کرنا نادانستہ یا دانستہ کی اس کی اصل حیثیت پر پردہ ڈال دینا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ نام بھی دراصل اسی انگریزی دور کا ایک نامبارک عطیہ ہے جس میں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے دین کو جراحتیں پہنچانے اور ان کے تصور کو مسخ کر ڈالنے کی مسلسل کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی اسلام دشمن یا اسلام ناشناس انداز فکر کے نتیجے میں قرآن اور اسلام کے احکام کو 'قرآنک لا' اور 'اسلامک لا' کہنے کے بجائے محمڈن کی تعبیر اختیار کی گئی، اور قانون کی کتابوں اور عدالتوں میں اسے رواج دے کر عام زبانوں پر اس طرح چڑھا دیا گیا گویا اس کے صحیح اور حقیقت کے عین مطابق ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں اور پھر اسی کے شاخسانے کے طور پر ان احکام شریعت کو جو مسلمانوں کی شخصی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں 'مسلم پرسنل لا' کا نام دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ 'مسلم' نہیں

'اسلامک لا' تھے۔ اس لئے راستی اور حقیقت پسندی ہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان احکام کو ان کے اسی اصل نام سے یاد کیا جائے۔ یہ صرف حقیقت پسندی ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر ضرورت کا بھی تقاضا ہے۔ آج اسلام سے ناواقفیتی کا یہ عالم ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ کہے جانے والے افراد بھی کسی چیز کے 'اسلامی' اور مسلم ہونے میں فرق نہیں کرتے۔ ایسی صورت حال میں اگر 'مسلم پرسنل لا' کی اصطلاح اسی طرح جاری رہتی ہے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ ان احکام شریعت کی اصل تصویر عام نگاہوں کو دکھائی نہ دے سکے گی۔ لوگ یہی خیال کریں گے کہ یہ تو 'مسلم پرسنل لا' ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تمام تر تعلق اس کا صرف مسلمانوں سے ہی ہے۔ اور یہ مسلمان نامی قوم کے ویسے ہی خالص تمدنی قوانین ہیں جیسے کہ دنیا کی بہت سی قوموں کے شخصی قوانین، مذہب سے آزاد اور خالص تمدنی وضع کے ہیں۔ کیا اتنی بڑی بنیادی غلط فہمی کو باقی رکھنا اور اسے غذا دیتے رہنا انصاف اور معقولیت کی بات ہے؟

جزو دین ہونے کی منطقی وجہ:

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ یہاں ذرا رک کر وہ وجہ بھی سمجھ لی جائے جس کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کا دائرہ عائلی اور معاشرتی مسائل تک وسیع ہے۔ یہ وجہ ان بنیادی تصورات میں پائی جاتی ہے۔ جو قرآن حکیم نے 'اللہ، دین' اور 'عبادت' کے بارے میں ظاہر فرمائے ہیں، اور جن کے سوا ہر تصور اس کے نزدیک یا تو ناقص ہے، یا یکسر غلط جاہلانہ اور باطل ہے۔ ان تصورات کی ضروری وضاحت مختصر لفظوں میں یہ ہے:

خدا وہ ہستی ہے جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور ہر مخلوق کی پروردگار ہے۔ وہ ربوبیت، عدل، حکمت، رحمت، قدرت اور علم کل وغیرہ ساری اچھی صفات سے کمال کی حد تک متصف ہے۔ وہ جس طرح پوری کائنات کا خالق اور پروردگار ہے اسی طرح اس کا مدبر

ومنتظم بھی ہے، مالک اور آقا بھی ہے، حاکم اور مقتدر اعلیٰ بھی ہے، شارع اور قانون دہندہ بھی ہے، اور معبود و مسجود بھی ہے۔ دوسرا کوئی بھی اس کی صفات میں اس کی ان حیثیتوں میں، اس کے اختیارات میں اور اس کے حقوق میں ذرہ برابر شریک نہیں۔ اس لئے پرستش کے لائق بھی صرف وہی ہے اور اطاعت حقیقی مکمل اور غیر مشروط اطاعت کا مستحق بھی وہی ہے۔

دین خدا کے اس ہدایت نامے، یعنی ان احکام وقوانین کے مجموعہ کا نام ہے جو اس طرف سے انسان کو راہ راست دکھانے، جادۂ حق پر چلانے اور حقیقی فلاح کی منزل تک پہنچانے کیلئے عطا ہوا ہے یہ خدا کے عادل، حکیم، پروردگار اور حاکم ومقتدر اعلیٰ ہونے کا عین تقاضا تھا کہ وہ انسان کو اس کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے لئے بھی اسی طرح 'سامان رزق' مہیا کرے جس طرح اس نے اس کی مادی زندگی کے لئے مہیا کر رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ربوبیت ناتمام اور اس کا عدل ناکام، اس کی حکمت بے مغز اور اس کی حاکمیت یکسر بے معنی ثابت ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں پھر خدا خدا کہلانے ہی کا حق دار نہ ہوتا۔ دوسری طرف انسان بھی اس بات کا شدید ضرورت مند تھا کہ اسے اپنی زندگی کے مقصد کے اور اس مقصد کے حصول کی صحیح راہ سے اچھی طرح باخبر کر دیا جاتا، اسے اپنے پرودگار کی مرضی اور اپنے حاکم حقیقی کے احکام دے دیا جاتا، تاکہ اس علم کی رہنمائی میں وہ اپنے لئے فکر وعمل کی سیدھی راہ پاسکتا، اور ظن وتخمین کے اندھیروں میں ہی بھٹکتا نہ رہ جاتا۔ چونکہ دین کا منشاء ومدعا یہ تھا، وہ انسان کی پوری اخلاقی زندگی کی ضرورت کی چیز تھی، وہ خدا کی صفات ربوبیت وحاکمیت کا فطری مقتضا تھا، اس لیے وہ حیات انسان کی زندگی کا کوئی بھی معاملہ ایسا نہیں جس کے سلسلے میں اخلاقی پہلو کی، حسن وقبح کی بحث نہ پیدا ہوتی ہو، اس لئے ضروری تھا کہ دین، یعنی ہدایت الٰہی بھی کسی معاملے کو نظر انداز نہ کرے اور کوئی شعبہ حیات بھی اس کی رہنمائی سے محروم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ آخری دین، اسلام بھی ایک ایک کر کے سارے ہی مسائل حیات سے بحث کرتا ہے اور عبادت گاہ سے لے کر اجتماعی زندگی

کے آخری زندگی کے سرے تک ہر معاملے میں متعلق ہدایتیں دیتا ہے۔ اور ان سبھی ہدایات کے مجموعے کا نام 'دین' ہے اور اس مجموعے کا ہر حصہ یکساں طور پر دین کا جزو ہے۔

عبادت کا مفہوم اسلام کی نگاہ میں پوجا اور پرستش سے بہت وسیع ہے۔ خدا کی پرستش اور اس کی یاد یقیناً عبادت کی جان ہے، مگر کل عبادت نہیں، کل عبادت یہ ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی مکمل پیروی کی جائے، کسی تفریق وتقسیم کے بغیر کی جائے۔ اور پورے اخلاص اور سچے جذبۂ اطاعت کے ساتھ کی جائے، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین، ایک جامع ہدایت نامہ ہے، اور پوری انسانی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس ہدایت نامے اور اس مجموعۂ احکام خداوندی کے ایک ایک حرف کو دانتوں سے نہ پکڑا جائے اور پوری زندگی اس ہدایت کے حوالے نہ کر دی جائے۔

جب خدا اور دین وعبادت کے صحیح تصورات قرآن اور اسلام کے نزدیک یہ تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انسان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات سے انہیں کوئی بحث ہی نہ ہوتی؟ یا اگر بحث ہوتی بھی تو وہ نہ دین کا جزو قرار پاتی، نہ عبادت اور خداپرستی کے لوازم میں شمار ہوتی؟ عائلی اور معاشرتی معاملات بھی تو اسی انسانی زندگی کا ایک حصہ تھے، بلکہ انتہائی اہم اور ہر حال میں ناگزیر حصہ تھے۔ پھر ان کو خدا کا دین کس طرح نظر انداز کر دیتا؟ ان کے بارے میں ہدایتیں نہ دیتا؟ حق، عدل اور راستی کے تقاضے نہ بتایا؟ یا جو احکام ان کے سلسلے میں اس نے دئے ہیں ان کی کوئی دینی اہمیت نہ ہوتی؟ ان کی پابندی ضروری نہ قرار دی جاتی؟ مومن ومسلم ہونے پر ان کی پیروی یا عدم پیروی کا کوئی اثر نہ پڑتا؟

بلاشبہ جن لوگوں کا تصور خدا اور تصور دین اور تصور عبادت کچھ اور ہے۔ اور بلاشبہ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ ان کے لئے اسلام کے شخصی قوانین کی دینی حیثیت کو سمجھ پانا اور اسے معقول تسلیم کرنا بڑا مشکل ہے۔ مگر یہاں گفتگو معقولیت اور غیر معقولیت کی بالکل

نہیں ہورہی ہے، بلکہ نفس واقعہ کی ہورہی ہے۔ اور نفس واقعہ بالبداہت یہی ہے، جس کا انکار کسی طرح نہیں کیا جاسکتا، کہ یہ قوانین دینی حیثیت کے مالک اور دین کا جزو ہیں، اور ایسا ہونا قرآنی تصور دین وتصور خدا کے پیش نظر بہرحال ضروری تھا۔

مسلمانوں کے شخصی قوانین کی جو اصل حیثیت اور بنیادی اہمیت ہے وہ اوپر کے مباحث سے پوری طرح واضح ہوچکی ہے، اور اس بارے میں مزید بحث وتمحیص کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا پھر بھی یہ ہے کہ ان قوانین کی اس مسلمہ حیثیت، دینی حیثیت، سے ہٹ کر خالص تہذیبی اور ملی پہلو سے بھی ان کی قدر و قیمت کا جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ جن لوگوں کا ذہن، کسی نہ کسی وجہ سے ان کی دینی حیثیت کو سمجھ پانے سے قاصر ہے وہ بھی یہ محسوس کرلینے کے قابل ہوسکیں کہ مسلمان اگر اپنے پرسنل لا کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں تو انہیں ایسا کرنا ہی چاہئے۔ اگر ملی اور تہذیبی مصالح کو نظر میں رکھ کر مسلم قوانین شخصی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی اہمیت کے درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔

پرسنل لاء.....ملی شخصیت کا قالب:

پہلی بات تو یہ کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین ان کی ملی شخصیت کے لئے اتنے ہی ناگریز ہیں جتنا کہ کسی زندہ جسم کے لئے اس کے اعصاب ضروری ہوتے ہیں۔ اس امر کی وجہ یا اس دعوے کی صداقت معلوم کرنے کے لئے ملتوں اور تہذیبی گروہوں کی ساخت پر غور کیجئے اور یہ دیکھئے کہ وہ تہذیبی گروہ کس طرح بنا کرتے ہیں؟ وہ کون سے مخصوص عناصر ہوتے ہیں جو کسی مجموعہ افراد کو، دوسرے تمام افراد اور گروہوں سے الگ ایک منفرد شخصیت رکھنے والے گروہ اور ایک مستقل ملت کی حیثیت دے دیتے ہیں۔ اس غور وفکر کے نتیجے میں آپ دیکھیں گے کہ اس معاملے میں اگرچہ اولیں اہمیت بنیادی عقائد وتصورات ہی کو حاصل

ہوتی ہے اور وہی اس ملت کی انفرادیت کا حقیقی سرچشمہ ہوا کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان احکام وضوابط اور آداب ورسوم کی اہمیت بھی اس باب میں کچھ کم نہیں ہوتی جن کے تحت اس ملت کے افراد کی پوری زندگی بسر ہوا کرتی ہے۔ یہ اس لئے کہ عقائد وافکار آنکھوں کو دکھائی دینے والی شے نہیں ہوتے، کہ وہ کسی ملت کی شخصیت کا مظہر اور اس کی انفرادیت کی علامت فارقہ بن سکیں۔ عملاً تشخص اور انفرادیت کی علامت تو اس کے وہ ظاہری طور طریقے اور قوانین وضوابط ہی بنا کرتے اور بن سکتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے بنیادی عقائد وتصورات کے تحت اختیار کئے ہوتی ہے، اور جن کے مطابق اس کی زندگی کا پورا کاروبار چل رہا ہوتا ہے۔ پھر چونکہ ان قوانین وضوابط کے مختلف شعبے قوم کی عملی ضرورت اور اس کی عام زندگی سے عملی ربط کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے، اس لئے اس کی شخصیت کی تشکیل میں بھی ان کا عمل دخل برابر نہیں ہوسکتا جن قوانین کا ربط، افراد قوم کی زندگی سے جتنا ہی زیادہ ہوگا ان کا عمل دخل بھی اس کی تشکیل ذات میں اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اب ہر شخص جانتا ہے کہ اس پہلو سے شخصی قوانین ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ رضاعت، حضانت اور کفالت، نکاح، مہر اور نفقہ، ازدواجی حقوق اور فرائض، طلاق، خلع، فسخ نکاح، وراثت، وصیت اور وقف ایسے مسائل ومعاملات ہیں جن کا عملی تعلق سبھی لوگوں سے ہوتا ہے اور تقریباً فرد فرد کی زندگی ان سے گھری ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے مسائل حیات کا عملی رابطہ نسبتاً محدود افراد ہی کی زندگی سے ہوتا ہے، یا محدود پیمانہ پر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ معاملات زندگی کو منضبط کرنے والے مقدم الذکر قوانین کی ملی اہمیت بھی بہت زیادہ اور نمایاں تر ہوگی اور ملت کی انفرادیت اور مخصوص شخصیت کا انحصار جتنا ان پر ہوگا دوسرے قوانین پر ہرگز نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عام حالات میں یہی قوانین اس انفرادیت اور مخصوص شخصیت کے آئینہ دار ہوں گے۔ یہی وہ قالب ہوں گے کہ جس کے اندر یہ شخصیت پائی جاسکے گی، جس کے ذریعے اسے پہنچانا جاسکے گا، جو اس کے وجود وبقا کا ضامن بن سکے گا۔

پرسنل لاء.....روح ملت کا محافظ:

دوسری بات یہ کہ شخصی قوانین ملت اسلامیہ کی ملی روح کے محافظ بھی ہیں۔ کیونکہ ملتوں کی زندگی اور موت کے مسئلے پر اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ کسی بھی ملت کے شخصی قوانین کی بقا سے ان عقائد وافکار تک کی زندگی وابستہ ہوتی ہے جن کی اساس پر اس کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قوانین اگر چہ اس کی اصل واساس نہیں ہوتے، لیکن اس کی اصل واساس کے لئے ناگزیر بہر حال ہوتے ہیں۔ اس کی مثال درخت کی سی ہے۔ درخت کی شاخیں اور پتیاں اگر چہ اس کی جڑ ہی سے نکلتی ہیں، اور یہی جڑ ان کو زندگی اور شادابی بخشتی رہتی ہے، لیکن خود یہ جڑ بھی اپنی زندگی اور تازگی کے بارے میں اپنی ان شاخوں اور پتیوں سے یکسر بے نیاز نہیں ہوتی، چنانچہ جہاں جڑ کے کٹ جانے یا سوکھ جانے سے شاخیں اور پتیاں بھی سوکھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہیں دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ جس درخت کی پتیاں اور شاخیں کسی چیز کا شکار ہوگئی ہوں یا کاٹ ڈالی گئی ہوں اس کی جڑ بھی زیادہ دنوں تک اپنی قوت اور تازگی باقی نہیں رکھ پاتی، اور آہستہ آہستہ خشک ہو کر گل سڑ جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال ملتوں کے بنیادی افکار وتصورات کا بھی ہے۔ جب تک ان تصورات کے عملی تقاضے اور مظاہر، زندگی کے میدان میں کارفرما رہتے ہیں اس وقت تک ان تصورات میں بھی زندگی اور توانائی موج زن رہتی ہے جونہی یہ عملی مظاہر میدان حیات سے غائب ہوئے ان تصورات کی نبض بھی کمزور پڑنے لگتی ہے اور آخر کار ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ اگر چہ بنیادی تصورات کے عملی مظاہر وہ سارے ہی قوانین ہوتے ہیں جن کے تحت قوم اپنی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کی شخصیت کے لئے اس کے شخصی قوانین کی عملی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، اس لئے ان قوانین سے اس کی عملی وابستگی یا عدم وابستگی کا نتیجہ بھی اس کے اپنے بنیادی تصورات کے حق میں سب

سے زیادہ نمایاں اور مرتب ہوتا ہے۔ ان قوانین پر مضبوطی سے کاربند رہنے کی شکل میں ان تصورات سے ذہنی رابطہ لازماً برقرار رہتا ہے۔ اور اگر ان سے عملی رشتہ منقطع ہو جائے تو پھر اس رابطے کا، کمزور، نیم اور بالآخر بے جان، ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان قوانین سے عملی رشتہ کاٹ لینے کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ اب وہ اس قوم کی نظر میں معقول اور قابل قبول نہیں رہ گئے تھے، اور ان کو نامعقول اور ناقابل قبول ٹھہرا دینے کے معنی لازماً یہ ہوں گے کہ وہ جن اساسی افکار وتصورات کی پیداوار ہیں فی الواقع خود ان تصورات ہی کی معقولیت اور صداقت اب اس کے نزدیک تسلیم شدہ اور یقینی نہیں رہ گئی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اسے اپنی اس بے یقینی کا خود بھی اعتراف یا شعور نہ ہو۔

پھر یہ ذہنی تبدیلی اسی حد پر رک نہ جائے گی، بلکہ لازماً آگے بڑھے گی اور قوم کچھ دوسرے ہی افکار وتصورات سے متاثر ہونے لگے گی۔ کیونکہ جب وہ اپنے شخصی قوانین سے عملی رشتہ کاٹ لے گی تو ضروری ہوگا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا مجموعۂ قوانین اپنائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرے قوانین کسی اور ہی تصور اور نظریئے کے تحت بنے ہوں گے۔ اس لئے بالکل فطری بات ہوگی کہ جن تصورات کی بنیاد پر بنے ہوئے شخصی قوانین کو وہ اپنا چکی ہے۔ خود ان کے لئے بھی اس کے دروازے کھل جائیں۔ ادھر چونکہ اس کا تعلق اپنی انفرادیت سے کمزور پڑ چکا ہوگا۔ اس لئے وہ اس حملے کا مقابلہ کرنے میں سنجیدہ نہ رہ جائے گی۔ بات بالآخر یہاں تک پہنچ کر رہے گی کہ اس کے اپنے بنیادی افکار وتصورات کی چولیں لازماً ہل جائیں گی، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ ان کے اندر رد وبدل قبول کر لینے پر آمادہ ہو رہے گی۔ اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ملت کا پرسنل لا جہاں اس کی شخصیت کا قالب ہوتا ہے وہاں اس کی روح کا محافظ بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شہادت سے قوموں اور ملتوں کی تاریخ بھری پڑی ہے، اور سب سے قریب کی شہادت خود ملت اسلامیہ کی اپنی ہی تاریخ میں موجود ہے۔

پرسنل لاء سے محرومی تشخص کی موت:

تیسری بات یہ کہ اپنے پرسنل لا سے محروم ہوجانے کے بعد ملت کی شخصیت کسی طرح برقرار نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ جس پرسنل لاء کی یہ اہمیت ہو کہ وہ قوم کی مخصوص شخصیت کا قالب بھی ہوتا ہے اور اس کی روح کا محافظ بھی، اس سے محروم ہوجانے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا باقی رہ جانا بالکل غیر منطقی ہوگا۔ اس محروم کے معنے واضح طور پر یہی ہوں گے کہ اس قوم کو اپنی شخصیت سے محروم کردیا گیا اور اس سے اس کی اپنی ہستی چھین لی گئی۔ یہ اس لئے کہ جب اس کے پرسنل لا کو کالعدم کرکے اس کی شخصیت کے امتیازی خطوط مٹادئے گئے اور اسے ایک دوسرے ہی قالب میں ڈھال دیا گیا ہو، یہاں تک کہ اس 'کایا پلٹ' کے باعث اس کی فکری اور تصوراتی بنیادیں بھی ہلتی اور کھوکھلی ہوتی چلی گئی ہوں، تو آخر اب بھی اس کا بدستور زندہ برقرار رہ جانا ممکن ہوگا؟ اس انقلاب حال کے بعد تو کسی دوسرے تہذیبی گروہ کے اندر بارش کے قطروں کی طرح جذب ہورہنا ہی اس کا مقدر بن جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس قوم یا ملت کے افراد بھی اب باقی نہ رہ جائیں گے۔ نہیں، وہ باقی رہیں گے اور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ زندگی کے میدان میں ترقیوں پر ترقیاں بھی کرتے چلے جائیں، مگر مطلق افراد کا نام قوم یا ملت نہیں ہوتا۔ ایسے لاکھوں اور کروڑوں افراد کے موجود ہوتے ہوئے بھی قوم کی اپنی شخصیت بالیقین ماضی کی داستاں بن چکی ہوگی۔

پرسنل لاء کی تنسیخ ایک خطرناک اقدام:

قوموں اور ملتوں کے پرسنل لاء کی یہی وہ غیر معمولی اہمیت ہے جس کے باعث کوئی بھی ملت، جس کے اندر خودداری اور خودشناسی کی رمق بھی باقی ہو، اپنے پرسنل لا کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے، اور ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کا نظریاتی رشتہ تو ہوتا ہی ہے، گہرا جذباتی لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جس چیز سے انسان کو گہرا جذباتی

لگاؤ ہو، اس کے بارے میں اس کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں، اور اس کی حرمت کی پامالی اس کے لئے بالکل ہی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ اپنی دوسری چیزوں سے محرومی چاہے گوارہ کرلے، مگر ایسی کسی عزیز ترین متاع سے محرومی کی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی عظیم ترین اور طاقت ور سے طاقت ور شہنشاہیتوں نے بھی اپنی زیردست قوموں کا اگرچہ سب کچھ چھین لیا تھا، مگر ان کے شخصی قوانین پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ رومن امپائر اور برطانوی شہنشاہیت اس کی سب سے نمایاں مثالیں ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان پر حاکمانہ تسلط قائم کرنے کے بعد ان عام اسلامی قوانین کو جو اب تک یہاں نافذ چلے آرہے تھے، بتدریج ختم کرکے اپنا وضع کردہ قانون جاری کردیا، مگر جہاں تک یہاں کے باشندوں پر پرسنل لاء کا تعلق ہے، انہیں منسوخ نہیں کیا اس کی وجہ ان کے سامنے کی یہی حقیقت تھی کہ یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے شخصی قوانین سے جو گہری جذباتی وابستگی ہے اس کے باعث وہ جان دے دیں گے مگر اپنے ان قوانین کی منسوخی ہرگز گوارہ نہ کریں گے۔ اس لئے ان کے اس نازک ترین جذبے کو چھیڑنا انجام کے لحاظ سے سخت مضر ہوگا۔

یقیناً جو بات اب تک ایک حقیقت رہی ہے وہ آج بے حقیقت نہیں بن جائے گی۔

پرسنل لاء کی یہ تہذیبی اہمیت جس طرح دوسری قوموں اور ملتوں کے بارے میں ناقابل انکار ہے، اسی طرح ملت اسلامیہ کے سلسلے میں بھی ناقابل انکار ہی رہے گی۔ اس کا پرسنل لاء بھی اس کی شخصیت کے لئے قالب کی، اور اس کی اجتماعی روح کے لئے محافظ کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسے محروم ہوجانے کا نتیجہ بھی اس کے ملی تشخص کے لئے موت ہی کی شکل میں نکل سکتا ہے۔ اس لئے اگر اس کا رشتہ اس کے دین وایمان سے نہ جڑا ہوتا تو بھی وہ اس کے لئے جان سے کم عزیز نہ ہوتا۔

☆☆

باب دوم

مسلم پرسنل لاء اور ہندوستان

● امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ
جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مسلم پرسنل لاء کیا ہے؟:

انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو اس کی شخصی اور خاندانی زندگی ہے، جس کا دائرہ محدود ہے، اس میں انسان کے ذاتی معاملات آتے ہیں، یا پھر وہ چیزیں جو اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان معاملات اور حقوق وفرائض سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً ازدواجی تعلق، ماں باپ اور اولاد کا تعلق، وراثت، ایک دوسرے پر نفقہ اور حق پرورش وغیرہ، دوسری زندگی شہری اور اجتماعی زندگی ہے جس کا دائرہ خاندانی تعلقات کی حدود سے آگے بڑھ کر شہر، ملک اور بین الاقوامی امور تک کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر گوشہ کے لئے خواہ اس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہو یا انفرادی زندگی سے، اصول بتائے ہیں جن پر حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے عہد میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اجتماعی قوانین، جن کی روشنی میں حکومت چلائی جاتی تھی عملاً ختم ہوتے رہے اور کتابوں میں محفوظ ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو صرف ''انفرادی زندگی'' کے قوانین عملاً باقی رہے، جسے بعد میں عام سرکاری عدالتوں کے حوالے کر دیا گیا، انفرادی زندگی کے یہ اسلامی قوانین ''مسلم پرسنل لا'' کہلائے، گویا مسلم پرسنل لا کی اصطلاح انگریزوں کا عطیہ ہے، جو قوانین اسلامی کا

ہی ایک حصہ ہے جن کی تفصیلات فقہاء اسلام کے ہاتھوں مرتب ہوئی تھیں اور جن کی بنیاد قرآن وحدیث ہے۔

آزاد ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء:

جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس ملک کو ایک ''جمہوری ملک'' بنانے کا فیصلہ کیا گیا، جس میں فرد کے ذاتی رجحانات، افکار وعقائد اور تہذیب وتمدن کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا، مگر کچھ مریض ذہنیت مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں شہری قانون نافذ کرانا چاہتی رہی ہے، حکومت بھی بعض عمومی قوانین کے ذریعہ ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی کی کوشش کرتی رہی ہے اور کچھ اس قسم کے احکام وہدایات دیتی آئی ہے، مثلاً یہ حکم جاری کیا گیا کہ حکومت کا کوئی ملازم اجازت حاصل کئے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تعدد ازدواج جو مسلم پرسنل لا کا اہم مسئلہ ہے، کو حکومت نے مسلمانوں کے ایک حلقہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا، اسی سلسلہ کا ایک اہم قدم متبنیٰ بل کی شکل میں اٹھایا گیا تھا۔ جو اسلام کے مختلف صریح قوانین وضوابط سے ٹکراتا اور مسلم پرسنل لا کے ایک اہم حصہ کو پورے طور پر مجروح کرتا ہے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یکساں سول کوڈ سراسر غیر اسلامی چیز ہے اور یہ موجودہ ہندو کوڈ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے مسلمانوں کی عائلی زندگی کی پوری عمارت ڈھہ جائے گی۔

مسلم پرسنل لاء اور مسلم ممالک:

مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی وتنسیخ کے لئے بطور دلیل چند مسلم ممالک کو پیش کیا جاتا ہے۔ خاص کر وہ لوگ جو ہر معاملے میں پاکستان کے نام سے بدکتے ہیں، اس معاملے میں پاکستان کی دہائی دے کر ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستانی مسلمانوں کی پیروی کا مشورہ دیتے

ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی مسلم اسٹیٹ کی غلط کارروائی ''اسلامی قانون'' نہیں کہلاسکتی اور نہ اس بنیاد پر اسلامی قوانین میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے، جو چیز قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح ہے اسے ہی صحیح اور اسلام کے مطابق کہا جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلم ممالک میں ''پرسنل لا'' کی تبدیلی کا پروپیگنڈہ حقیقت سے دور ہے۔ عام طور پر مسلم ممالک میں ''مسلم پرسنل لا'' نافذ ہے، صرف چند ممالک ایسے ہیں جہاں تبدیلی ہوئی ہے، ماضی بعید میں ترکی اور پاکستان اس کی اہم مثال ہے۔ اگر ہندوستان کی حکومت پاکستان کو سامنے رکھ کر یا ترکی کو مثال بناتے ہوئے ''مسلم پرسنل لا'' کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی ان دونوں ملکوں کی طرح آمرانہ اور فوجی نظام اپنایا جارہا ہے۔ ایک چیز اور بھی لائق توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان مذہبی اقلیت ہیں، اس لئے مذہبی امور میں اگر مسلم ممالک کی کوئی مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے تو اس کے لئے سب سے بہتر ان ممالک کی اقلیتی صورتحال ہوسکتی ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی بھی مسلم ملک نے اپنے یہاں کی مذہبی اقلیت کے دینی امور میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی ہے، نہ پرسنل لاء کو ہاتھ لگایا ہے، ایسے بھی مسلم ممالک ہیں جن کے پڑوس میں دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی حکومت ہے اور دونوں میں ایسے شدید ترین اختلافات موجود ہیں جن کی تہ میں کسی نہ کسی درجہ میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما ہے، لیکن اس ملک میں پڑوسی ملک کے ہم مذہب کی شکل میں آباد ہیں اور اپنی دینی زندگی اور پرسنل لا کو محفوظ سمجھتے ہیں اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ مصر میں یہودیوں کی مذہبی آزادی اس کی واضح مثال ہے۔

معاشرتی دشواریاں:

کہا جاتا ہے کہ ''مسلم پرسنل لا'' پر عمل کرنے سے معاشرتی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

خاص کر طلاق اور تعدد ازدواج ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کی زندگی ہر وقت خطرات میں گھری رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم پرسنل لا کی رو سے مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اور اسے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہے، لیکن یہ قانون کی خامی نہیں ہے۔ شریعت نے شوہر اور بیوی میں علیحدگی کی مختلف شکلیں بتائی ہیں۔ مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اور عورتوں کے لئے خلع اور فسخ نکاح کی راہ بتائی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرد اپنے اس حق کا براہ راست استعمال کرسکتا ہے اور عورتیں اپنا حق بالواسطہ استعمال کرسکتی ہیں۔ مرد اور عورت کے حقوق میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریوں کی نوعیت جدا جدا ہے، نکاح کے بعد مرد پر جتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، عورتوں پر اتنی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے۔ مرد پر بیوی اور بچوں کے اخراجات کے علاوہ مہر کی شکل میں ایک رقم بھی واجب ہوتی ہے۔ علیحدگی کا فیصلہ اگر بلا واسطہ عورتوں کے بھی حوالہ کیا جاتا تو عورتیں اپنے اس حق کو استعمال کرتیں جس کے نتیجہ میں عورتوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، مگر مہر کی رقم کی فوری ادائیگی اور بچوں کی کفالت اور تربیت کا نظم مرد کو کرنا پڑتا اور مرد بلاوجہ دشواریوں میں مبتلا ہوتا۔ طلاق کو شریعت نے گرچہ جائز قرار دیا ہے، مگر اسے ابغض المباحات (جائز چیزوں میں سب سے زیادہ کریہہ) قرار دیا ہے اور یہ ہدایت دی ہے کہ جب نباہ ہونے کی کوئی شکل باقی نہ رہے تو بہت سوچ سمجھ کر طلاق دی جائے۔ شریعت نے تفصیل کے ساتھ طلاق کا طریقہ بتایا ہے، اس طریقہ پر عمل کرنے کے بعد اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مرد اشتعال کے نتیجہ میں یا جذبات کی رو میں طلاق دے دے، شریعت کی ہدایت کے مطابق دی ہوئی طلاق ایک عاقلانہ اور ٹھنڈا فیصلہ ہی ہوسکتا ہے، شریعت نے عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت بھی دی ہے۔ اسلامی قانون عفت وعصمت کے پیش نظر مرد کے ایسے حالات ہوسکتے ہیں کہ وہ صاف ستھری زندگی گذارنے کے لئے دوسرے نکاح کی ضرورت محسوس کرے۔

مسلمانوں کا مضبوط موقف:

مسلم پرسنل لا مسلمانوں کی مستقل تہذیب اور عائلی نظام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی انفرادی سماجی زندگی سے مسلم پرسنل لاء کا بہت گہرا تعلق ہے، انہیں قوانین کی بنیاد پر ان کی انفرادی اور سماجی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا ایمانی جذبہ اسے برداشت نہیں کرتا کہ اسلامی احکام میں تبدیلی کی جائے۔ اسلام کے عائلی قوانین کے مقابلہ میں اگر دوسرے قوانین بنائے جائیں گے اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مسلمانوں کی زندگی بڑی مشکلات سے دوچار ہوجائے گی۔ ایک طرف امن پسند شہری کی حیثیت سے مسلمان ان قوانین کا احترام کرنا چاہیں گے تو دوسری طرف اسلامی احکام انہیں پابند بنائیں گے کہ وہ مخصوص طریقہ کار اپنایا جائے جسے اسلام نے متعین کیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی داخلی زندگی ہر مرحلہ میں ملکی عائلی قوانین اور اسلامی قوانین کے درمیان ٹکراتی رہے گی اور وہ مجبور ہوں گے کہ ملکی عائلی قوانین کو نظر انداز کرکے اسلامی قوانین کی پابندی کریں۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر ملک کے تمام طبقے ایک ہیں اور ان میں کوئی بھی جماعت ایسی نہیں ہے جو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی برداشت کرسکتی ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ میں ہر طبقے کی نمائندگی اور اس کی خدمات اس کی روشن دلیل ہے۔

☆☆

مسلم پرسنل لاء خطرات کے سائے میں

● سید احمد قادریؒ

''حکومت شہریوں کے لئے ایک ایسا مشترکہ سول کوڈ رائج کرنے کے لئے جدوجہد کرے گی جس کا نفاذ ہندوستان کے طول وعرض میں ہو۔''

دستور ساز اسمبلی کے متعدد مسلم وغیر مسلم ممبروں نے اس رہنما اصول پر اعتراض کیا تھا اور بعض مسلمان ممبروں نے ترمیم بھی پیش کی تھی، لیکن ان کی ترمیم منظور نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے جن کی نگرانی میں دستور بن رہا تھا اقلیت سے تعلق رکھنے والے ممبروں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں اعلان کیا گیا۔

حکومت کو محض اختیار دیا جارہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی، شخصی قوانین ختم کردینا اس لئے لازم ہوگا۔ کسی صاحب کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہئے محض یہ اختیار مل جانے کے باعث حکومت فوراً اس پر عمل کرنے پر مصر ہوجائے گی، خواہ وہ ملک کے مسلمان یا عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے۔ حکومت کے اختیار عملاً ہمیشہ محدود ہوتے ہیں، خواہ آپ انہیں لفظی طور پر کتنا ہی لامحدود کردیں، کیونکہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے نتیجے میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہوجائیں۔ اگر کسی وقت گورنمنٹ ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہئے۔

لیکن بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ یقین دہانی سیاسی طفلی تسلی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حکومت ہند نے دفعہ 44 کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور وہ بتدریج یکساں سول کوڈ کی

طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ اپنے ملازمین پر بلاتفریق مذہب، تعدد ازدواج کا دروازہ بند کرچکی ہے اور ان کے لئے یک زوجگی کو لازم قرار دے چکی ہے۔ وہ اسپیشل میرج ایکٹ پاس کرچکی ہے جس کے تحت ایک مسلمان عورت اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر کسی غیر مسلم سے شادی کرسکتی ہے اور جس کے تحت وہ اپنے شوہر کی نصف جائداد کی مالک ہوجاتی ہے۔ صوبہ یوپی وغیرہ کی اسمبلیاں زرعی ایکٹ پاس کرچکی ہیں اور یہ ایکٹ مسلمانوں پر بھی نافذ ہیں۔ ان میں زرعی زمین کی وراثت کے ضابطے اسلامی شریعت کے بالکل خلاف بنائے گئے ہیں اور ابھی حال میں ''لے پالک بل'' پارلیمنٹ میں پیش ہوچکا ہے۔ مرکزی وزرائے قانون نے حکومت کی نیت کو چھپایا بھی نہیں ہے، بلکہ بآواز بلند اس کو ظاہر کیا ہے، تاکہ مقتدی اپنے امام کی نیت سے بخوبی واقف ہوجائیں جب ''ہندو کوڈ بل'' پاس ہورہا تھا تو اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا۔

''ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی، اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہوگئے جو ہماری پچاس فیصدی آبادی کے لئے ہو تو اس کا نفاذ باقی آبادی پر مشتمل نہ ہوگا اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔''

ابھی جو 'متبنیٰ بل' زیر غور ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ وزیر قانون نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا قدم ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا یہ پہلا قدم نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی کئی قدم اٹھائے جاچکے ہیں۔ ان اقدامات واعلانات کے بعد حکومت کا ارادہ بالکل واضح ہوچکا ہے۔ کانگریس الیکشن کے وقت جو اعلانات کرتی ہے یا حکومت کے ذمہ دار افراد خاص مواقع پر مسلمانوں کو جو تسلی دیتے ہیں اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا عبرتناک معاملہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں ہم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ حکومت کو مداخلت فی الدین کے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے ہم مسلمانوں کو پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ، ایک سخت جدوجہد اور کشمکش (اسٹرگل) کے لئے تیار ہونا چاہئے اور اس جدوجہد میں ان مذہبی غیر مسلموں سے بھی تعاون حاصل کرنا چاہئے جو کسی کے مذہب میں مداخلت کو غلط سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے پرسنل لاء کا تحفظ دو باتوں پر موقوف ہے، ایک یہ کہ دستور ہند کے رہنما اصول کی دفعہ 44 ختم کی جائے اور دوسری یہ کہ شخصی قوانین سے متعلق مقدمات کے فیصلہ وتصفیہ کا اختیار دین دار اور اسلامی شریعت سے واقف مسلمان ججوں اور قاضیوں کے حوالہ کیا جائے۔ میں نے اس پر اختصار کے ساتھ اظہار اپنی تحریر 'قضاء شرعی کا قیام ضروری ہے' میں کیا ہے جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ ہمارے نزدیک کوشش کی صحیح سمت یہی ہے۔

جدوجہد کی صحیح سمت متعین کر لینے کے بعد کوشش کا ایک رخ تو وہ ہے جس کا تعلق وقت کی حکومت سے ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جس کا تعلق خود ہم مسلمانوں سے ہے جن میں ہم حکومت کی منظوری کے محتاج نہیں ہیں۔ اس سلسلے کی چند تدابیر ہم یہاں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(1) سب سے پہلی تدبیر یہ ہے کہ شرعی قوانین پر مسلمان خود عمل کریں۔ نکاح، مہر طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت اور اسی طرح کے شرعی احکام پر اگر مسلمان خود عمل نہ کریں یا اس کے خلاف عمل کریں تو پھر مسلم پرسنل لاء کے تحفظ اور قضاء شرعی کے قیام کا مطالبہ وہ کس بنیاد پر کریں گے اور ان کی کوشش موثر کس طرح سے ہوگی؟ علماء اور مسلمان تنظیموں کے رہنما، اہل علم اور اخبارات ورسائل کو پوری کوشش کرنی چاہے کہ جہاں کہیں مسلمان، شریعت کے خلاف، مقامی رسم ورواج یا خاندانی وروایات پر عمل کر رہے ہیں وہ اسے ترک کر دیں اور قوانین شریعت پر عمل شروع کر دیں۔

(2) لوک سبھا، راجیہ سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور قضا شرعی کے قیام کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں سے متعلق ہر ایسے بل کی مخالفت کریں جو شریعت کے کسی قانون کے خلاف ہو، مثال کے طور پر اس وقت متبنیٰ (لے پالک) بل لوک سبھا کے سامنے ہے اس کے خلاف انہیں اپنی آواز بلند کرنی چاہئے۔

(3) ایسے تمام انصاف پسند غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرنا چاہئے جو دستور میں اقلیتوں کو دئے ہوئے حقوق کے حامی ہیں اور جو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں حکومت کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے، اس طرح عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کو بھی ساتھ لینا چاہئے جن کے پرسنل لا یکساں سول کوڈ کی زد میں آجائیں گے۔

(4) مسلمان خواتین کو خصوصیت کے ساتھ اس جدوجہد میں حصہ دار بنانا چاہئے، کیونکہ عام طور پر انہیں کی مظلومیت کا نعرہ لگا کر مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کوششیں بھی ہوئی ہیں اور متعدد بڑے شہروں میں اہم اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں، لیکن انہیں پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ہمیں اپنی جدوجہد اس وقت جاری رکھنی ہوگی جب تک حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کرے۔

(5) مسلم پرسنل لا کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے؟ اس کو تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں پر واضح کرتے رہنا چاہئے۔ جہاں تک تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اسے واضح کرنے کا تعلق ہے اس پر خاصہ کام ہوا ہے۔ متعدد کتابیں، پمفلٹ، مضامین اور اخبارات ورسائل پر مسلم پرسنل لا نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ماہنامہ زندگی کا یہ نمبر بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح کرتے رہنے کی ضرورت ہے کہ جن شرعی قوانین کے مجموعہ کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے وہ انگریزوں کے وضع کئے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ اللہ رب العالمین نے انہیں اپنی کتاب قرآن مجید میں نازل فرمایا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت

یوں ہے کہ جولوگ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کو یہ مغالطہ بھی دے رہے کہ مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لا انگریزوں نے وضع کیا تھا، لہٰذا اس میں تبدیلی کرنا دین میں مداخلت نہیں ہے۔ یہ باور کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے کہ وہ لوگ اتنی بات نہ جانتے ہوں کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین کے لئے انگریزی زبان میں صرف مسلم پرسنل لا کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ انگریزوں نے وہ قوانین وضع نہیں کئے ہیں۔ کیا وہ حضرات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے مثال کے طور پر تعدد ازدواج کا قانون انگریزوں نے وضع کیا تھا؟ دراصل جان بوجھ کر وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔

☆☆

تعدد ازدواج پر پابندی

تمہاری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

مسلمانوں میں دوزوجگی روکنے کے لئے مسودۂ قانون:

اغراض ومقاصد: تعدد ازدواج کی اگرچہ مسلم پرسنل لا کے تحت اجازت دی گئی ہے، لیکن وہ عملاً ترک کردیا گیا ہے اور مسلم رائے عامہ 'ایک زوجگی' کی مؤید ہے۔ مسودۂ قانون کی غرض اسی مقصد کو حاصل کرنا ہے، ضمناً اس کا مقصد مسلمان خواتین کو بھی سہولت بہم پہنچانا ہے۔ جن کے خاوند اس بل کے نفاذ کے وقت ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہوں۔

ہرگاہ کہ مسلمانوں میں دوزوجگی کو روکنا ضروری ہے، اس لئے جمہوریہ ہند کے تیرہویں برس مندرجہ قانون نافذ کیا جاتا ہے:

1۔ (الف) یہ قانون مہاراشٹر قانون انسداد دوزوجگی برائے مسلمان 1962 کہلائے گا۔

(ب) اس کا اطلاق پوری ریاست مہاراشٹر پر ہوگا۔

2۔ اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا۔

اس قانون کی اصلاحات میں جب تک کہ کوئی بات مضمون یا متن کے متضاد نہ ہو مقصد یہ ہے:

(الف) دوزوجگی کی شادی کا مطلب بیوی یا شوہر کا اپنے زوج کی موجودگی میں نکاح کرنا ہے۔ بشرطیکہ ایسے مرد یا عورت کی اس بیوی یا شوہر سے نکاح کو کسی بااختیار عدالت

نے ناجائز قرار نہ دیا ہو یا خلع نہ کرادی ہو یا وہ رسم ورواج کے اعتبار سے جائز نہ ہو۔ اس میں وہ شادی شامل نہیں ہے جو کسی نے اپنے زوج کی زندگی میں اس وقت کی ہو جب کہ متعلقہ زوج سات سال تک مسلسل مفقود الخبر ہو اور اس کی زندگی کے بارے میں کوئی خبر نہ کی گئی ہو، البتہ ایسے شخص کو اپنی شادی سے پہلے واقعات کی صحیح صورت حال سے اس مرد یا عورت کو واقف کر دینا ہوگا جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔

(ب) مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو مذہب اسلام کا ماننے والا ہو۔

(ج) نابالغ سے وہ شخص مراد ہے جس کی عمر 16 سال سے کم ہے۔

4۔ عام اس سے کہ کوئی قانون یا رسم ورواج اس کے منافی ہو دو زوجگی کی شادی باطل قرار دی جائے گی۔

(الف) اگر وہ اس قانون کے نفاذ کے بعد اس ریاست میں انجام دی گئی ہو۔

(ب) اگر وہ شادی اس قانون کے نفاذ کے بعد ریاست کی حدود سے باہر انجام پائی ہو، مگر زوجین میں ایک یا دونوں اس ریاست میں رہتے ہوں۔

5۔ عام اس سے کہ قانون تنسیخ نکاح مسلمین 1939 قانون 8/1939 کی دفعہ 2 میں کوئی امر موجود ہو۔ ایک عورت جس کی مسلم قانون کے تحت شادی انجام پائی ہو اس بات کی حقدار ہوگی کہ اس قانون کے نفاذ کے وقت اس کے شوہر کی ایک سے زیادہ بیوی موجود ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے۔

6۔ عام اس سے کہ کوئی قانون رسم یا رواج اس سے متضاد ہو۔ اگر نابالغ کے علاوہ کوئی فرد ایک زوج کی موجودگی میں دوسری شادی کرتا ہے یا کرتی ہے جو (دفعہ کی رو سے باطل ہے) اس پر مقدمہ چلا کر سات سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے، نیز جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

7۔ جو شخص بھی اس ریاست میں دوسرے نکاح کی رسم انجام دے گا یا اس میں اعانت

کرے گا اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت 6 ماہ تک ہو اور اس پر جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے، الا یہ کہ وہ اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ اس کے پاس یہ یقین کرنے کے معقول وجوہ موجود تھے کہ یہ نکاح دوسرا نہیں ہے۔

8۔ (الف) جب کوئی نابالغ دوسری شادی کرے جو دفعہ 4 کی رو سے باطل ہے تو جو شخص اس نابالغ کا نگراں ہو خواہ وہ والدین میں سے یا سرپرست یا کوئی اور، نیز قانونی طور پر ولی ہو یا نہ ہو ایسی شادی کو انجام دینے کے سلسلے میں اقدام کرنے یا اسے انجام دینے کی اجازت دینے یا غفلت وتساہل سے ایسی شادی کو روکنے میں ناکام رہنے پر، اس پر مقدمہ چلا کر کسی بھی نوع کی سزا دی جا سکتی ہے جس کی مدت 6 ماہ تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ یا سزا اور جرمانہ دونوں۔

(ب) اس دفعہ کے تحت سمجھا جائے گا (الا یہ کہ اس کے خلاف ثبوت بہم پہنچایا جائے) کہ جہاں کسی نابالغ کی دوسری شادی انجام پائی ہے جو دفعہ 4 کی رو سے باطل ہے اسے نابالغ کا سرپرست خواہ وہ والدین میں سے ہو یا سرپرستوں میں سے یا قانونی یا اس کے علاوہ ولی ہو اپنی غفلت سے نکاح کو روکنے میں ناکام رہا ہے۔

9۔ ہر درخواست جو اس قانون کی دفعہ 5 کے تحت دی جائے اسے ایسے ڈسٹرکٹ کورٹ میں جس کے دائرہ اثر میں کیا جائے نکاح واقع ہو یا جہاں خاوند اور بیوی رہتے ہوں یا آخر میں رہتے تھے پیش کیا جائے گا۔

10۔ عام اس سے کہ کوئی امر ضابطہ فوجداری 1898 میں شامل ہو دفعات 7-6 یا 8 کے تحت ہر الزام کی سماعت پریسیڈنسی مجسٹریٹ یا جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں ہو۔

☆☆

حکومت کو مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا کوئی حق نہیں

● مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ
سابق امیر جماعت اسلامی ہند

کسی بھی راسخ العقیدہ مسلمان سے سوال کیجئے کہ وہ اسلامی شریعت سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ دے گا کہ ایک فرد جو اللہ اور رسولؐ سے محبت کرتا ہے ان کی اطاعت وفرماں برداری کا عہد کر چکا ہے، اور اس عہد کو ''أشهد أن لا إله الا الله وأشهد أن محمد رسول الله'' کہہ کر دن رات میں بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اس کی گھٹی اور فطرت میں یہ بات ودیعت ہو چکی ہے کہ وہ اس دین اور شریعت سے محبت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت نازل فرمایا ہے اور اس طرح اپنی چند روزہ زندگی میں خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔ آپ اس سے اگر یہ سوال کریں کہ وہ اپنے پرسنل لاء میں ترمیم کیوں نہیں چاہتا تو دوٹوک لفظوں میں یہی کہے گا کہ چونکہ اسلامی شریعت کو وہ مکمل اور دین کا جز سمجھتا ہے، نیز تمام دنیا کے قوانین سے بالا و برتر اصح اور کامل سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں جو شریعت اسلامیہ کا ایک حصہ ہے کسی کتر بیونت کا قائل نہیں ہے۔

وہ آپ کو یہ بھی بتلائے گا کہ وہ اس بات پر یقین کامل رکھتا ہے کہ اس چند روزہ دنیاوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی زندگی بدرجہا بہتر بھی ہے اور وہ یوم حساب کی اس باز پرس سے ڈرتا ہے کہ اس نے اس مختصر سی زندگی میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کیوں نہیں کی۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اسلام صرف نماز، روزہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مکمل

دین ہے جس کے ہر جز کی اتباع اسی طرح لازم ہے جس طرح نماز روزہ کے احکام کی، لہٰذا اگر وہ ان تمام احکام کی پابندی کرتا ہے جن میں اس کا پرسنل لا بھی شامل ہے تو وہ امید رکھتا ہے کہ خدا اپنے فضل سے اس کو دائمی مسرت کے اس مقام میں داخل کرے گا جس کا نام جنت ہے، لیکن اگر اس نے کسی حکم کی نافرمانی کی خواہ وہ پرسنل لاء ہی کے سلسلہ میں کیوں نہ ہو تو اس کو سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے تصور ہی سے اس کی روح لرز جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ آپ سے یہ بھی کہے گا کہ خدا کے ماننے والے اگر اس کے کسی ایک حکم میں کتر بیونت کرنے لگیں تو ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ دوسرے احکام خداوندی کی کاٹ چھانٹ میں جری ہو جائیں گے، بلکہ کسی بھی مروجہ قانون اور لیجسلیچر کے احکام کی پابندی سے بھی گریز کرنے لگیں گے۔

ممکن ہے کہ حکومت ہماری ان باتوں کو فرقہ واریت پر محمول کرے، کیونکہ ہمارا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور جماعت کو حکومت آئے دن بلاوجہ ملعون کرتی رہتی ہے، لیکن اگر اپنے مذہب کی باتیں بیان کرنے اور ان پر یقین کامل رکھنے کا نام فرقہ واریت ہے تو ہم بخوشی اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، البتہ حکومت کو یہ بتلائے دیتے ہیں کہ یہ خیالات صرف جماعت اسلامی ہی کے نہیں، بلکہ سارے ہی مسلمانوں کے ہیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سابق صدر اور حکومت ہند کے ایک ممتاز مرکزی وزیر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے غور سے سن لی جائے جن کے الفاظ یہ ہیں:

''اسلام کے احکام میں کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز یہ درس و تدریس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئے یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذاہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس

سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو۔ یا پھر اعلان کردے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے، وہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی نہایت آسان ہوجائے گا کہ اپنا وقت بے سود شوروفغان میں ضائع نہ کریں اور برٹش اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔'' (مسئلہ خلافت وجزیرہ عرب 5-204 طبع ثانی)

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا آزاد مرحوم اگر آج زندہ ہوتے تو وہ بھی 'اسلام کے شرعی احکام' کے سلسلہ میں جماعت اسلامی ہی کی صف میں نظر آتے۔

دراصل یہ باتیں جماعت اسلامی یا ہندوستان کے مسلمانوں کی ہی من گھڑت نہیں، بلکہ اسلام کا یہ مسلمہ اصول اور مسلمانان عالم کا ہمیشہ سے یہ متفقہ مسلک رہا ہے کہ احکام خداوندی میں کوئی بھی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔

ایک بے وزن بات:

مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ فلاں مسلم ملک نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کردی ہے، اس لئے ہندی مسلمانوں کو بھی اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کردینی چاہئے۔ لیکن یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں فلاں مسلمان چونکہ شراب پیتے ہیں یا جوا کھیلتے ہیں، کیوں نہ دوسرے مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے استدلال کو استدلال کہنا استدلال کی توہین ہے۔ یہاں سوال اصول کا ہے، نہ کہ کسی کے عمل کا۔ اگر کسی کا عمل اصول کے خلاف ہے تو ایسے عمل کو غلط قرار دیا جائے گا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت کے کسی منصوص جز میں ترمیم کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، خواہ اقدام کوئی کرے، بفرض محال ساری دینا کے مسلمان متفقہ طور پر بھی اگر کسی حکم خداوندی میں ترمیم کردیں تو ان کا یہ اقدام غلط ہی ہوگا، کیونکہ وہ اس کے قطعی مجاز نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب کہ 'لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق' ایسے تمام احکام وقوانین دیوار پر دے مارنے کے قابل ہیں جو کتاب وسنت سے بے نیاز ہوکر بنائے گئے ہیں۔

جو لوگ ایسے احکام وضع کریں ان کو ڈرنا چاہئے کہ خدا کی سزا بڑی سخت ہے۔ اب ان تبدیلیوں کی بھی حقیقت جان لینی چاہئے جو بعض مسلم ممالک نے، مسلمانوں نے پرسنل لا میں کی ہیں۔ یہ حقیقت فی الاصل بس اتنی ہے کہ جن ممالک میں مسلم پرسنل لا میں ترمیم واصلاح کی گئی ہے ان سب میں سوائے دو ملکوں کے۔ یہ ترمیم واصلاح تمام تر حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ یعنی کسی ایک ہی مکتب فقہ کی بجائے مختلف فقہی مسالک کو سامنے رکھ کر اخذ وانتخاب کا طریقہ اختیار کرکے ایک مجموعہ قوانین مدون کرلیا گیا ہے یعنی اس مجموعہ قوانین کا سرچشمہ بہرحال اسلامی ذخیرہ فقہ ہی ہے۔ پھر اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے وہ خود مسلمانوں ہی نے کیا ہے۔ اور علماء وماہرین قانون اسلام کے مشورے سے کیا ہے، غیر مسلمین کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں رہا ہے۔ اس ذیل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسلمان ملکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے، جیسا کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کے پیش نظر ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کے لئے ان کے پرسنل لاء محفوظ رکھے گئے ہیں۔

اس بات کو پھر ذہن نشیں کرلینا چاہئے کہ اگر کسی مسلم ملک نے کوئی ایسی تبدیلی کی بھی ہو جو قرآن وسنت کے خلاف ہو تو خدا اور اس کے مقابلے میں یہ ایک باغیانہ روش اور غیر مجاز عمل ہے جس کو نہ تو نظیر بنایا جاسکتا ہے نہ اس کو بنیاد بنا کر قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنے والوں کے مقابلے میں کوئی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔ کتاب وسنت ہی دراصل مسلمانوں کی پوری زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا بڑا حکم ان کے لئے واجب الاتباع ہے۔

ایک غلط دعویٰ:

عام طور سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا حق حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دستور ہند کے کچھ اجزاء بنیادی ہیں اور کچھ غیر بنیادی۔ ان بنیادی اجزا میں ترمیم کا کسی پارلیمنٹ کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے شہریوں نے ملکی ڈھانچے اور نظام کو اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ اس میں بنیادی حقوق کی دفعات موجود ہیں۔ ان حقوق میں کانٹ چھانٹ سے اندیشہ ہے کہ ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھل جائے گا۔ جس میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی مستحکم ضمانت دی گئی ہو۔ ہندوستانی شہری اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ عارضی طور پر کامیابی حاصل کرنے والی پارٹیوں کی خواہشات پر ہوا کے اکھڑے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے رہیں بلکہ انہوں نے بجا طور پر ایسی مستقل بنیادوں کو دستور میں جگہ دے رکھی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کی ضامن ہیں اور اہل ملک کی ہر اٹھنے والی قیادت کو پابند کیا ہے کہ وہ ان بنیادوں میں رخنہ اندازی نہ کرے۔

یہ صحیح ہے دستور ہند میں بنیادی حقوق کے باب کے بعد، رہنما اصولوں کے باب کے تحت ایک دفعہ میں مشترکہ سول کوڈ کا تصور بھی دیا گیا ہے۔ لیکن لوگوں کو مغالطہ میں نہیں رہنا چاہئے کہ ریاست اس کی عملاً بھی پابند ہے۔ اس سلسلے میں ایک واضح مثال شراب بندی کے قانون کی ہے جو رہنما اصولوں میں درج ہے، لیکن حکومت اسے نافذ کرکے اب دھیرے دھیرے ختم کرتی جارہی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند کی رو سے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حکومت اگر کسی رہنما اصول پر عمل درآمد کرنے سے قاصر رہے تو عدالتی چارہ جوئی کرکے اسے مجبور کیا جاسکے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستور ہند میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ 44 دستور کے چوتھے باب کا ایک جز ہے۔ دستور کے چوتھے باب میں چند وہ رہنما اصول مندرج ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر حکومت کو

قانون سازی کرنی ہے۔ دفعہ 44 کے الفاظ یہ ہیں:

''ریاست ملک کے تمام شہریوں کے لئے ایک مشترک سول کوڈ مہیا کرنے کی کوشش کرے گی۔'' دستور کے باب سوم کا عنوان ہے ''بنیادی حقوق'' اور اس باب میں ہندوستان میں رہنے والے تمام ہی باشندوں کے لئے چند حقوق کو ان کے بنیادی حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ ان بنیادی حقوق میں سے ایک حق مذہب کو اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا ہے۔ (دفعہ 25) اور اسی باب میں (دفعہ 39) کے ذریعہ یہاں کے شہریوں کے ہر طبقہ کو اپنے مخصوص کلچر کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

دستور ہند کے ان دونوں ابواب یعنی باب سوم اور باب چہارم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر فوقیت اور بالادستی حاصل ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما اصول کسی بنیادی حق سے متصادم ہو تو اس رہنما اصول کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔ اس فرق کو متعین کرنے والے چند وجوہ یہ ہیں۔

بنیادی حقوق کے متعلق دستور ہی کی دفعہ 32 میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ بنیادی حق کو سپریم کورٹ کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دفعہ 32 کی گنجائش دفعہ 226 سے مستزاد ہے جس کے تحت ہر ہائی کورٹ میں کسی بھی حق کے نفاذ کے لئے رٹ داخل کی جاسکتی ہے۔ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ریاست کسی بھی فرد کو کسی قانون کے ذریعے یا کسی عاملانہ حکم کے ذریعہ اس کے کسی بنیادی حق سے محروم کرے تو وہ اس قانون یا حکم کو عدالت میں چیلنج کرکے اس کی منسوخی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

لیکن رہنما اصولوں کے تعلق سے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور قانون دانوں کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر ریاست کسی رہنما اصول کو اختیار کرنے میں قصور اور کوتاہی کرے تو کسی عدالت کے ذریعہ ریاست کو اسے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اس صورت حال سے بھی بنیادی حقوق کی رہنما اصولوں پر بالادستی واضح ہوتی ہے۔

بنیادی حقوق کو دفعہ 13 ضمن 2 کے ذریعے مزید مستحکم کردیا گیا ہے، اس دفعہ کی رو سے ریاست کے اختیارات قانون سازی پر یہ صریح تحدید عائد کی گئی ہے کہ ریاست کوئی ایسا قانون نہیں بناسکتی جس سے باب سوم میں مندرج بنیادی حقوق میں کسی کے حق پر کوئی ضرب ہوتی ہو۔

رہنما اصولوں کے باب میں ایسی کوئی مثبت یا منفی نوع کی دفعہ شامل نہیں ہے۔ جس سے ریاست پر کوئی لزوم عاید ہوتا ہے یا شہریوں کے حقوق کو محدود کیا گیا ہو۔

دستور کے باب سوم میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ اپنی نوع میں بنیادی انسانی حقوق ہیں جو انسان کی فطری عزوشرف کا خاصہ ہیں۔ اور جن کو آج کی ہر متمدن ریاست تسلیم کرتی ہے۔ نیز وہ اقوام متحدہ کے منشور برائے بنیادی حقوق میں بھی شامل ہیں۔ اور اس منشور پر دستخط کر کے حکومت ہند نے بھی ان کو تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لئے اس باب سوم میں بیشتر بنیادی حقوق کی ضمانت (بشمول دفعہ 25 میں دی ہوئی مذہبی آزادی کے) تمام لوگوں کے لئے ہے، جبکہ یکساں سول کوڈ کا دائرہ صرف ہندوستان کے شہریوں تک ہی محدود ہے، جس کا مطالبہ یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے بنیادی حق سے ہندوستان میں رہنے والا ہر مقیم کوئی بھی شخص، حتی کہ ایک غیر شہری بھی جو عارضی طور پر ہندوستان میں مقیم ہو مستفید ہوسکتا ہے۔ اور اس کے تحفظ کے لئے ہندوستان کی عدالتوں کی پشت پناہی اسے حاصل ہوگی۔ رہنما اصول کے مقابلے میں بنیادی حقوق کا یہ عموم بھی ان بالادستی کو ظاہر کرتا ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر پارلیمنٹ یا کوئی ریاستی مجلس قانون ساز ایسا قانون وضع کرے جو دستور میں دئے ہوئے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو وہ قانون غیر آئینی ہوگا۔ اور یہی بات یکساں سول کوڈ کے لئے بھی ہے۔

یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو دستور ہند کی بعض دفعات

کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ اس لئے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دستور کے صحیح منشاء کے خلاف کوئی قانون وضع کرے اور اس کے ذریعہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو غصب کرلے دستور ہر حال میں پارلیمنٹ سے بالاتر ہے۔ اس کی بالادستی کے علی الرغم پارلیمنٹ اگر کوئی ایسا قانون وضع کرتی ہے جو اس کے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ پارلیمنٹ نے اپنے حقوق سے تجاوز کیا ہے اور ان سب لوگوں کو جو ایسا قانون وضع کرنے میں کسی حیثیت سے شریک ہوں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کا یہ اقدام حلف وفاداری کے خلاف ہے جو انہوں نے دستور ہند کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں اٹھایا ہے۔

دستور ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات کی بناء پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم پرسنل لا دین اسلام کا اہم جز ہے۔ اور اسلامی کلچر میں داخل ہے۔ اس لئے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا ہے جو اس کلچر پر ضرب لگاتا ہو۔

مشترکہ سول کوڈ کی ایک جھلک:

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ہمیں ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہے جس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے، یہ اندیشہ اس شکل میں سامنے آرہا ہے کہ اس وقت ایسے متعدد قوانین منظور کئے گئے اور کئے جاسکتے ہیں جو مسلم معاشرے کے شخصی قوانین پر اثر ڈالنے والے ہیں اور جو مشترکہ سول کوڈ میں شامل ہیں۔

بچوں کی تبنیت (Child adoption) کے سلسلے میں اس وقت عام آبادی پر ایک قانون نافذ کرنا حکومت کے پیش نظر جس کو (Adoption of children 1972) کے نام سے پاس کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ میں یہ بل حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ حکومت مسلم پرسنل لا کو ابھی بدلنا

نہیں چاہتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر پرسنل لا میں تبدیلیوں کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بل کی دفعہ 13 ملاحظہ ہو۔

تبنیت کا اثر:

(1) حکم تبنیت اس تاریخ سے نافذ متصور ہوگا جس تاریخ کی صراحت ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپنے حکم نامہ میں کی ہو، یا اگر تحت دفعہ 12 اس حکم کے خلاف کوئی مرافعہ کیا گیا ہو تو اس تاریخ سے جس کی صراحت عدالت مرافعہ کے حکم میں کی گئی ہو۔

(2) وہ بچہ جس کے بارے میں حکم نامہ تبنیت جاری ہوا ہو حکم نامہ میں مندرج تاریخ سے جملہ اغراض کے لئے (بشمول بلا وصیت انتقال کی صورت کے) مثل اپنے متبنّیٰ گیرندہ کے حقیقی بچہ کے اور اس کے متبنیٰ گیرندگان مثل اس کے حقیقی والدین کے متصور ہوں گے، گویا کہ وہ ان کے رشتہ مناکحت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور اس تاریخ سے اس بچہ کے جملہ تعلقات اپنے خاندان پیدائش سے منقطع اور متبنیٰ گیرندگان کے خاندان سے قائم شدہ متصور ہوں گے، مگر شرط یہ ہے:

(الف) وہ بچہ کسی ایسے فرد سے شادی نہ کرسکے گا جس سے وہ شادی نہ کرسکتا اگر وہ اپنے خاندان پیدائش ہی میں رہتا۔

(ب) اگر کوئی جائداد تاریخ حکم نامہ تبنیت سے قبل اس بچہ کو حاصل ہوچکی تھی تو تابع ان شرائط کے، اگر کوئی ہوں، جن کے تحت وہ اس بچے کو حاصل ہوئی تھی، وہ اس بچہ کی ملکیت میں باقی رہے گی۔

(ج) متبنیٰ کسی فرد کو کسی ایسی جائداد کے حقوق ملکیت سے محروم نہ کرے جو حکم نامہ تبنیت سے قبل اس فرد کو حاصل ہوچکے ہوں۔''

متبنّیٰ کے یہ حقوق بعینہٖ وہی ہیں جو Hindu Adoption and

Maintenance Act1956 کے تحت ہندوؤں کے سلسلے میں مقرر کئے گئے ہیں اور اب ان کو سب ہندوستانیوں پر لاگو کیا جانا پیش نظر ہے۔

چنانچہ 72ء کے اس بل کے اغراض ومقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اس مسودہ قانون کا مقصد تبنیت کے بارے میں مروجہ ہندو قانون تبنیت وگذارے کے جز ومتعلقہ تبنیت اور اس سلسلہ کے سارے رواجی قوانین کو ختم کرا کے ایک ایسا قانون بنانا ہے جو تمام فرقوں پر لاگو ہو۔

اس سے قیاس کر لیجئے کہ مشترکہ سول کوڈ کس طرح اکثریت کے مزاج اور روایات کا عکس بن کر سامنے آنے والا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وسنت نے مسلمان خاندان کے نظم واستحکام کے لئے شخصی قوانین بنائے ہیں ان پر اگر آزادانہ اور غیر متعصّبانہ طور پر غور کیا جائے تو ہر منصف مزاج انسان یہ مطالبہ کرنے پر آپ کو آمادہ پائے گا کہ ان قوانین کو مسلم سماج ہی کے لئے خاص رکھنے کے بجائے ملک گیر اور آفاقی حیثیت دی جانی چاہئے۔ کیونکہ ان کے علاوہ خاندان کا استحکام اور سماجی انصاف کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔ مگر برا ہو تنگ نگاہی کا اس کے باعث ایسے مفید اور جامع قوانین سے استفادہ کرنا تو درکنار، الٹا ان لوگوں کو بھی اس سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہم یقیناً اس وقت ایک اجنبی ماحول میں گھرے ہوئے ہیں، تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریکی کا وجود ہی اس امر کا متقاضی ہے کہ اس میں روشنی کا چراغ جلایا جائے۔ ہمیں اپنی جگہ اس وقت ایک طرف تو یہ عزم کر لینا چاہئے کہ اپنے معاشرہ میں اسلامی روح کے مطابق خاندانوں کی اصلاح کریں گے اور ہمارا ایک ایک گھر خدمت دین اور اقامت دین کا روشن منارہ بنے گا۔ دوسری جانب ملی پیمانہ پر ہماری طرف سے اس بات کا صریحی مطالبہ کیا جانا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کا کسی حکومت یا پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا انتباہ:

اس ذیل میں یہ تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جب مجلس دستور ساز میں مجوزہ دستور پر دفعہ وار بحث ہورہی تھی اور یہ دفعہ 44 (جو مسودہ دستور میں دفعہ 35 تھی) زیر بحث آئی تو بعض ممبران اسمبلی دستور ساز نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور ان تقریروں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ اس کی مخالفت صرف مسلمان ہی نہیں کرتے، بلکہ خود ہندو کا ایک بڑا طبقہ مشترکہ سول کوڈ کا مخالف ہے اور اس کو مداخلت فی الدین اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے مغائر سمجھتا ہے، اس موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر صاحب جنہوں نے دستور کا مسودہ تیار کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اس بارے میں یہ فرمایا تھا۔

''ریاست صرف یہی چاہتی ہے کہ اسے اس طرح کے قانون بنانے کا حق حاصل ہوجائے اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ریاست مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کی پابند ہوجائے، لہٰذا کسی شخص کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ریاست نے اپنے لئے اس قسم کا اختیار حاصل کرلیا ہے تو وہ فوراً ہی اس اختیار کا استعمال اور اس کو اس طرح نافذ بھی کردے گی جو مسلمان یا عیسائیوں یا دوسرے فرقوں کے لئے قابل اعتراض ہو۔

کوئی بھی ریاست اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے باعث مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ ہوجانا پڑے اگر ریاست ایسا کرے تو میری دانست میں وہ پاگل پن ہوگا۔''

اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف دفعہ 44 کے تحت یکساں سول کوڈ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ کرلینے پر بات ختم ہوجاتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ اس وقت بھی ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہیں جو مسلم پرسنل سے متصادم ہیں، ان میں خصوصیت سے (Special Marrige Act) قابل ذکر ہے۔ یہ قانون ہندوستان کی آزادی کے بعد ہماری پارلیمنٹ نے 1984ء میں بنایا ہے۔ اس کی رو سے نکاح کے لئے نہ تو جانبین کا

ہم مذہب ہونا ضروری ہے اور نہ ہی نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کسی مذہبی رسم کا ادا کرنا۔ صرف حکومت کے ایک عہدہ دار کے پاس اس بات کا تحریری اقرار کافی ہے کہ طرفین قانون مذکورہ کے تحت رشتہ مناکحت میں بندھ رہے ہیں اور اس قانون کے تحت شادی کے بعد طرفین اور ان کی اولاد وراثت کے باب میں (indian succession Act) سے متعلق ہوں گے نہ کہ ان میں سے کسی ایک کے شخصی قانون وراثت سے، اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اگر طرفین ایک ہی مذہب کے ہوں، یعنی مرد اور عورت دونوں ہندو یا دونوں مسلمان ہوں تب اس قانون کے تحت شادی کرلینے کے نتیجہ میں ان کا مذہبی قانون وراثت ان سے متعلق نہ ہوگا، بلکہ مذکورہ بالا قانون Indian succession Act سے متعلق ہوگا جو ہندو قانون وراثت اور اسلامی قانون وراثت سے مختلف ہے۔ اس طرح کے تمام قوانین کو منسوخ کرانے کی ضرورت ہے یا یہ طے کرالیا جائے کہ ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہوگا۔ اسی طرح اس وقت عدالتوں میں محمڈن لاء رائج ہے وہ فی الواقع اینگلو محمڈن لاء ہے اور اس میں متعدد قوانین شریعت سے متصادم یا مختلف ہیں ان تمام قوانین پر نظر ثانی کرکے انہیں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔

اس قسم کے غیر اسلامی قوانین یا قوانین مروجہ کے غیر شرعی اجزاء کو شریعت اسلامیہ کے مطابق بنانے کا کام ظاہر ہے کہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں، بلکہ اس کے لئے وہی لوگ اہل ہیں جن کو کتاب وسنت کا کما حقہ علم حاصل ہو اور جو اسلامی فقہ، اسلامی فلسفہ قانون اور اسلامی تاریخ پر عبور کے ساتھ ساتھ ان معاملات میں بصیرت بھی رکھتے ہوں۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں جو درج ذیل ہیں۔

مسلمانوں کے مطالبات:

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں حکومت سے مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ:

(1) رہنما اصولوں میں سے دفعہ 44 منسوخ ہو۔ (2) مسلم پرسنل لا میں حکومت کوئی

ترمیم نہ کرے۔ (3) اسپیشل میرج ایکٹ کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہو۔ (4) متبنی بل 72ء واپس لیا جائے یا کم از مسلمانوں کو اس کے دائرہ اثر سے خارج رکھا جائے۔ (5) حکومت آئندہ کوئی ایسا بل نہ لائے جس کی منشا یکساں سول کوڈ کو جزءً جزءً نافذ کرنا ہو، جیسا کہ وہ اس وقت کر رہی ہے۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہوں گے مسلمانوں کو چین نصیب نہ ہوگا اور وہ یہ محسوس نہ کرسکیں گے کہ ان کا دین وایمان اور ان کی شریعت وتہذیب ملک میں محفوظ ہے۔

یقیناً طوفان شدید ہے، لیکن اگر حکمت ودانش عزم واتحاد اور توکل علی اللہ سے کام لے کر آگے بڑھیں تو نصرت ایزدی سے اس طوفان میں سے اپنے لئے راستہ نکال سکتے ہیں۔

و اللہ خیر الناصرین.

☆☆

باب سوم

اقلیتوں کے مسائل اور اصول

فقہ الاقلیات اصول وضوابط

● ڈاکٹر صلاح الدین سلطان

دنیا کے مختلف حصوں میں جہاں مسلمان بحیثیت اقلیت آباد ہیں، وہاں کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی قانونی نظام الگ الگ نوعیت کے ہیں، پھر ان تمام مسلم اقلیتوں کے مسائل وحالات، مشکلات ودشواریاں جداگانہ نوعیت کی ہیں، ان سب حالات ومسائل کا عصر حاضر کے ممتاز فقہاء نے جائزہ لیا اور ان کے حل کے لئے نئے اصول وضوابط کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی۔ مسلم اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لئے فقہی اجتہاد کے تعلق سے ضابطہ سازی کے لئے کئی طرح کی کاوشیں درکار ہیں۔ فقہ وقواعد کے اصولوں پر مبنی کتابوں، معمولات زندگی کے مقاصد اور امریکہ، یورپ، ہندوستان اور چین وغیرہ کی مسلم اقلیتوں کے زمینی دورے کے دوران میری یہ شدید خواہش رہی کہ میں اس تعلق سے کوئی خاکہ پیش کروں۔ چنانچہ میں نے یہ تحریر مرتب کی۔

یہاں ''ضوابط'' کے لفظ سے میری مراد وہ دائرہ کار ہے جس کی بنیاد پر مسلم اقلیتوں کے اجتہاد کا کار انجام پاتا ہے۔ میں نے حتی الامکان ''قواعد'' کے لفظ سے گریز کیا ہے، تاکہ مناقشہ اور تنقیح سے بچے رہیں۔ اسے اصول اس لئے کہا گیا کہ یہ مجتہد کے عقل ووجدان میں اپنا طریقۂ کار نقش کرتے ہیں کہ وہ اجتہاد کے وقت ان دائروں اور ضابطوں کو بروئے کار لائے۔ اور ''فقہ'' شریعت کے ان عملی احکام کے علم کو کہتے ہیں جو

اس کی تفصیلی دلیلوں سے ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں تک ''مسلم اقلیتوں'' کی بات ہے تو وہ میری نظر میں دو قسم کی ہیں:

پہلی: یورپ، امریکہ، ہندوستان اور چین وغیرہ کی مسلم آبادیاں جو اقلیت شمار کی جاتی ہیں۔

دوسری: قانونی حقوق کے اعتبار سے اقلیت یعنی جن مسلمانوں کو ان کے حقوق نہیں دیئے جاتے اور انہیں ظلم وزیادتی کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ جیسے چیچنیا، ازبکستان، آذربائیجان اور کرغیز یا وغیرہ کے مسلمان۔ اس ضمن میں وہ چند اسلامی ممالک بھی داخل ہیں جہاں کی مسلم اکثریتیں وہاں کی غیر مسلم اقلیتوں سے کم حقوق پاتی ہیں، وہاں سے داعیوں اور اصلاح کاروں کو نکال باہر کردیا جاتا ہے، اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت یورپ کی مسلم اقلیتوں سے بھی بدتر ہے۔

☆☆

پہلا اصولی ضابطہ: وطنیت کا شدید احساس

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس وطن میں سانس لیتا ہے، جہاں کا پانی پیتا ہے، جس کے کھانے سے آسودگی حاصل کرتا ہے، جہاں کے مال ومنال سے بہرہ ور ہوتا ہے اور جہاں کے سرمایہ سے صدافتخاری حاصل کرتا ہے، اس وطن سے محبت کرتا ہے۔

اگر مسلم اقلیتیں جن ممالک میں وہ رہائش پذیر ہیں ان سے لگاؤ محسوس نہیں کرتیں اور اس وطن سے محبت نہیں رکھتیں، تو یہ مروت میں دراور بزرگی وکرامت پروار ہے، اس سے اکثریت کی طرف سے اقلیتوں کے تئیں جلاوطنی اور ظلم واستبداد کے تازیانے برسائے جائیں گے۔

جب فقہ کا کام حقیقی صورت حال کا علاج تسلیم کرلیا گیا تو اقلیتوں کی حالت پر بھی غور کرلیا جائے تو بہتر ہے:

۱- ایک سروے کے مطابق امریکہ میں آٹھ ملین سے بھی زیادہ مسلمان ہیں، جن میں 22.4 فیصد امریکی الاصل ہیں اور 77.6 فیصد مہاجر ہیں جو دوسری جگہوں سے آکر

یہاں آباد ہوگئے ہیں، جبکہ مہاجرین میں 0.4 فیصد ایسے ہیں جو یا تو بچپن ہی میں یہاں آکر اپنے ماں باپ کے ساتھ آباد ہوگئے ہیں اور امریکہ کی سرزمین پر ان کی پیدائش ہوئی ہے، ان کے آبائی وطن سے ان کی نسبت محض قلبی محبت کی ہے، وہ اپنے والدین، چچا، ماموں، دادی، نانی سے اس کے بارے میں جو کچھ سنتے ہیں اس سے کچھ لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے، لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا وطن امریکہ ہی ہے اور یہ ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔

۲- مشرقی اور مغربی یورپ کے مسلمان بھی اسی احساس کے ساتھ وہاں زندگی گذارتے ہیں، ان میں سے غالب اکثریت اپنے آبائی وطن لوٹنے کے بارے میں نہیں سوچتی، کیونکہ وہ غربت اور ظلم کی وجہ سے وہاں دوبارہ واپس نہیں جانا چاہتی۔

۳- چین میں مسلمان ایک سو پچاس ملین سے بھی زیادہ ہیں اور یہ سارے کے سارے چینی الاصل ہیں۔

۴- ہندوستان میں مسلمان دوسوملین ہیں اور یہ سب ہندوستان ہی کی سرزمین پر پیدا ہوئے ہیں۔

۵- مشرقی ایشیا کے ممالک میں خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں وہ بھی وہاں کے اصلی باشندے ہیں، جیسے ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، قرغیریا، آذربائیجان، سنگاپور اور سری لنکا وغیرہ۔

شمالی افریقہ کے ممالک جیسے تنزانیہ، یوگنڈہ، کینیا، گھانا، نائجیریا، نیز جنوبی افریقہ کے مسلمان بھی وہاں کے اصلی باشندے ہیں، ان کا وہیں گھر ہے کہیں اور نہیں۔

یہی حالت جاپان اور آسٹریلیا وغیرہ کی ہے۔ وہاں بھی اسی طرح مسلم اقلیتیں موجود ہیں، اس لئے مجتہدین، فقہاء اور ائمہ ومصلحین کو ان مسلم اقلیتوں کو شہری مقیم اور باشندہ حقیقی کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے۔ شہری مہاجر کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے، اسی وطن کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اسی اعتبار سے ان مسلم اقلیتوں کے بارے میں

اپنے فقہی اجتہادات کی عمارت کھڑی کرنی چاہئے، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ لوگ وہاں کے باشندے اور شہری ہیں، ہمیشہ کے لئے رہائش پذیر ہیں، مہاجر نہیں، اور دوسرے یہ کہ کسی جگہ اقامت اختیار کرنے، وہاں کی آب وہوا سے مستفید ہوجانے، وہاں بس جانے نیز وہاں کی تعلیم وثقافت سے مالا مال ہوجانے کے بعد انسان کے اندر اس جگہ کے تئیں وفاداری لازمی ہوجاتی ہے، جس کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اس جگہ اور ملک پر اپنا حق سمجھے، وہاں کے اصلاحی امور میں خود کو شامل کرے، اس کی تعمیر وترقی میں ہاتھ بٹائے، اور یہ چیز اپنے آبائی وطن سے لگاؤ کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ خود نبی ﷺ کی حالت یہ تھی کہ اپنے آبائی وطن مکہ کی تعریف سن کر رو پڑتے تھے، اسی طرح حضرت بلال اور دیگر صحابہ کی بھی یہی حالت تھی جنہوں نے مکے سے ہجرت کرکے مدینہ کو اپنا وطن بنالیا تھا، اور اس کو خیر وبرکت اور نور وروشنی سے آباد کردیا، نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے صاع ومد (پیمانوں) کے بارے میں برکت کی دعائیں کیں، وہاں کے وبائی بخار کی بیماری کے خاتمہ کے بارے میں دعا فرمائی کہ اللہ اسے جحفہ کی وادیوں میں منتقل کردے، چنانچہ ان اصلاحی کاوشوں سے مدینہ کے اندر، وہاں کی آب وہوا میں، وہاں کے پیڑ پودوں اور باشندوں میں پاکیزگی اور خوشگواری رچ بس گئی۔

میرا مقصد یہ باور کرانا ہرگز نہیں کہ غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلمان وہاں کے بارے میں وہی احساس قائم رکھیں جو مدینۃ الرسول کے بارے میں صحابۂ کرام کا تھا، جہاں شرعی نص کی روشنی میں ان نفوس قدسیہ نے عملی تطبیق سے ایک شرعی اتھارٹی اور ایک اسلامی ریاست کے حوالے سے نمایاں چھاپ چھوڑی اور یوں اس ریاست کو انسانیت کے لئے منارۂ نور بنادیا۔ میرا مقصود تو یہ ہے کہ جائے ولادت اور آبائی وطن سے لگاؤ بجا ہے۔ یہ چیز کسی دوسرے ملک میں آباد ہونے کے بعد ممنوع نہیں ہوجاتی، لیکن وہاں آباد ہونے کے بعد وہاں کی اصلاحی کاوشوں میں حصے داری بھی ضروری ہے، وہاں سے بھی لگاؤ ہونا چاہئے،

وہاں کے حقوق بھی پورے کرنے چاہئیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر مسلم ریاستوں میں مسلم اقلیتوں کی اکثریت میں ان لوگوں کا تناسب زیادہ ہے جنہوں نے خود وہاں آنکھیں کھولی ہیں، وہیں وہ لوگ پروان چڑھے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے حقیقی باشندوں کی بھی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا سارا کا سارا سرمایۂ الفت وانسیت وہی ملک ہے، اس لئے منجملہ ساری مسلم اقلیتوں کو وہاں کی تعمیر وترقی میں حصے دار ہونا چاہئے۔

غیر ملکوں میں جا کر آباد ہوجانے کا مسئلہ آج تک اگر معرض اختلاف میں رہا ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ جو فتوی اور اجتہاد کے کا زانجام دے رہے ہیں وہ خود غیر مسلم ممالک میں اسلامی دعوت کو پہنچانے، اس امانت کو ادا کرنے اور خیر کی تبلیغ کے لئے مامور جماعت کو وہاں رہائش پذیر ہونے کو خود بجا قرار دیتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**کنتم خیر أمة أخرجت للناس**'' (آل عمران۔۱۱۰) (یعنی تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کے لئے بھیجے گئے ہو)، اور نبی پاک ﷺ کا فرمان ہے: ''مجھے اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے''۔ امت محمدیہ کے لوگوں کی بھلائی کی غرض سے مبعوث کئے جانے کی فکر اس قدر عام ہوچکی تھی کہ اعرابیوں میں بھی ربیعہ بن عامر کا یہ مقولہ گردش کرتا نظر آتا ہے، ''اللہ تعالی نے ہمیں بھیجا ہے، تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی عبودیت سے نکال کر انہیں ان کے رب کی عبودیت کی راہ دکھائیں، دنیا کے ادیان ومذاہب کے ظلم وجور سے اسلام کے عدل کی طرف بلائیں اور دنیا کی تنگی سے دنیا وآخرت کی وسعت وخوش حالی کی طرف بلائیں۔

اگر تمام حالتوں میں دنیا بھر کے فقہاء اس بات پر اتفاق کرلیں کہ غیر اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کا رہائش پذیر ہونا صحیح نہیں تو بھی وہاں کے اصلی مسلمان باشندوں کو نہیں بدل سکتے (ان کے بارے میں اقلیت کا تصور قائم رہے گا اور ان کے لئے فقہی اجتہاد کی ضرورت باقی رہے گی) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے مہاجر مسلمانوں کی اکثریت نے ہجرت کے بعد دوبارہ ان ممالک کا رخ نہیں کیا جہاں سے انہیں مشقت اٹھا کر ہجرت کرنی پڑی

تھی، تو کیا فقہ کا کام یہی رہ گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گنہ گار کرے، یا ان کے شانوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے اور اٹھانے کا کام انجام دے؟ اس لئے میری نظر میں ہر ملک میں آباد مسلم باشندہ وہاں اپنے وطن سے محبت کرے، جو لوگ وہاں تباہی و بربادی پھیلانا چاہتے ہوں ان کو ناپسند کرے، کیونکہ وہ بھی اس ملک کا محافظ ہے، اسے بھی وہاں کے حال و مستقبل کی بہتری کے لئے کوشاں رہنا چاہئے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں رائج تباہی پھیلانے والے مذاہب یا تباہی برپا کرنے والے، صلح وصفائی کے دشمنوں اور اسلام مخالف قانون ساز سرکاروں سے دوستی کرے، بلکہ وہ اس ملک سے محبت کرے، تاکہ اسلام کے دونوں جہاں کے لئے رحمت بن کر آنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو اور تمام لوگوں کے اندر خیر و برکت کی تخم ریزی ہو۔

اس بنیاد پر وہاں کے مہاجر مسلمانوں کے لئے یہ کہنا جائز ہے کہ میں فرانسیسی مسلم یا امریکی مسلم، یا جاپانی مسلمان یا ہندوستانی مسلمان ہوں، اسی طرح وہاں کے حقیقی باشندوں کی طرح ان کو بھی اپنے ملک پر فخر کرنا درست ہے۔

دوسرا ضابطہ: وطن کی اصلاح کے تئیں ذمہ داریوں کی اہمیت:

اقلیتوں کے فقہی اجتہاد میں وطن اور سماج کے تئیں اصلاح میں مسلمانوں کے رول کو غیر معمولی طور پر اہمیت دی جانی چاہئے، صرف آزمائشوں اور مصیبتوں سے بچنے کے لئے فقہی اجتہاد کا دروازہ کھٹکھٹانا کافی نہیں، جیسے چند حضرات اپنے بچوں کو فتنوں سے بچانے اور برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مدارس اور اسکول قائم کرنے کی دہائی دیتے ہیں، لیکن ان کے یہاں اپنے بچوں سے کوئی ایسی زندہ قیادت تیار کرنے کی کوئی سوچ نہیں پائی جاتی جو سوسائٹی اور سماج کے لئے سودمند ہو اور اسے رشد و ہدایت کی راہ دکھائی جاسکے۔ اس طرح چند حضرات انتخابات میں حصہ لینے پر زور دیتے ہیں، تاکہ اقلیتوں کے حقوق نہ مارے

جائیں، حکومتیں ان کے حقوق غصب نہ کرسکیں اور فرقہ وارانہ فساد اختلاف یا ظلم وقہر کے شکار نہ ہوسکیں، جیسا کہ فلسطین، عراق، افغانستان اور چیچنیا وغیرہ میں ہو رہا ہے یہ فقہ واجتہاد رسالت اور نبوت کے مشن کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے، نیز یہ مسلمانوں کے ایسے رول کو بھی یقینی بنانے سے قاصر ہے جس سے خود انہیں اور ان کے گھر والوں کے حق میں سودمندی ثابت ہوسکے اور بیک وقت اس کے اچھے اثرات ان کے سماج پر مرتب ہوسکیں خواہ وہ سماج اچھا ہو یا برا، اس ملک کا بھی بھلا ہو، اگرچہ اس میں برائیوں کا فیصلہ ہوتا ہے، اس لئے کہ حقیقت میں یہی دعوت کا میدان ہے (اصلاح ودعوت کا کام وہی ہوتا ہے جہاں بگاڑ ہوتا ہے) ورنہ (جب ہر جگہ اچھائی ہی اچھائی ہو تو وہاں) ہمیں دعوت واصلاح کا میدان کہاں مل سکتا ہے؟ جسے انجام دینے کا ہمیں اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اس قسم کی بہت سے دلیلیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقلیتوں کے فقہی اجتہاد کی بنیاد ایسی چیزوں پر ہونی چاہئے جو انہیں اپنے ملک اور سماج کی اصلاح پر ابھارے، ان میں سے چند دلیلیں حسب ذیل ہیں:

پہلی دلیل: اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ جو امتیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں ان میں ایسے ہوش مند کیوں نہ ہوئے جو ملک میں خرابی و بربادی پیدا کرنے سے روکتے؟ ہاں (ایسے) تھوڑے سے (تھے) جن کو ہم نے ان میں سے مخلصی بخشی اور جو ظالم تھے وہ انہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش وآرام تھا اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور تمہارا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو جب کہ وہاں کے باشندے نیکوکار ہوں از راہ ظلم تباہ کردے۔

یہ دونوں آیتیں سورہ ہود کی ہیں اور انبیاء کی رسالت کے بارے میں خلاصہ ہیں جو انہیں ہلاکت و بربادی سے بچانے کا ضامن بھی ہے۔ پہلی آیت ایک قوم کے باعقل اور دیندار افراد کی باقی ماندہ جماعت کے بارے میں خبر دیتی ہے، جیسا کہ علامہ قرطبی نے اس کا

ذکر کیا ہے اور ان کا مشن اصلاح کی ذمہ داری اور زمین سے فساد کو مٹانا بتایا ہے۔ یہ مشن صرف دیار اسلام میں نہیں، بلکہ پورے کرۂ ارض کے لئے ہے۔ اصلاح کے اس مشن کی ادائیگی ہی ہلاکت سے روکنے اور تباہی سے بچانے والی ہے۔ دوسری آیت میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے۔

دوسری دلیل: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی پہلی بیوی سارہ سے اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی عظیم خوشخبری نے متوجہ کیا اور اسی رشتے نے انہیں لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب مسلط کرنے والے فرشتوں سے عذاب میں جلدی نہ مچانے کو لے کر بحث ومباحثہ کرنے پر بھی تیار کیا، تاکہ انہیں اپنی اصلاح کے چند مواقع مزید مل سکیں۔ قرآن مقدس نے داعی کے اپنی قوم کے تئیں اصلاح کے جذبات کے حوالے سے اس واقعہ کو نہایت ہی موثر کن انداز میں ان آیتوں میں کیا خوب بیان کیا ہے جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور ان کو خوش خبری بھی مل گئی تو قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے، بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے تحمل والے، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس بات کو جانے دو، تمہارے رب کا حکم آں پہنچا ہے اور ان لوگوں پر عذاب آنے والا ہے جو کبھی نہیں ٹلنے کا۔

یہ موقف جو ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے بارے میں اپنایا اللہ تعالیٰ نے اس کے باوجود بھی انہیں حلم وبردباری سے متصف کیا، لہذا یہ اصلاح کاروں کے لئے ایک ضروری صفت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی اس تڑپ کو اللہ تعالیٰ نے سراہا بھی ہے، لیکن اس کے باوجود چونکہ اللہ کا حکم صادر ہو چکا تھا، اس لئے وہ آ کے رہا، ان پر سارے تجربات آزمالئے گئے، اصلاح کے تمام وسائل بروئے کار لانے کے باوجود بھی کچھ ہاتھ نہ آیا، ان کی فطرت کی گنگا الٹی ہی بہتی رہی، اس لئے ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آیا، ہاں ابراہیم علیہ السلام کی تڑپ اور جذبے کو مستحسن کہا گیا۔

تیسری دلیل: امام بخاریؒ نے اپنی سند سے عروہؓ سے اور عروہ نے عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ پر اس (احد) کے دن سے بھی زیادہ اور کوئی گراں دن گذرا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ایک دن کا تذکرہ کیا، جس دن آپ کی قوم نے آپ پر بہت سخت مظالم کئے، تو جبرئیل علیہ السلام پہاڑ کے فرشتے کے ساتھ آئے اور یہ پیشکش کی کہ (اے نبی محترم) اگر آپ چاہیں تو میں پورے مکے والوں کو تباہ وبرباد کردوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، میں تو ان کے حق میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے، وہ نادان ہے (جو مجھے ستا رہی ہے، آپ نے مزید فرمایا) مجھے امید ہے کہ اللہ تعالی ان کی نسل میں سے ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جو اللہ عزوجل کی عبادت کریں گے (وہ مسلمان ہوں گے)۔ یہ اچھوتا موقف نبی کریم ﷺ نے اس وقت اپنایا تھا جس وقت قریش آپ کی ایذا رسانیوں پر تُلے ہوئے تھے، مسجد حرام بتوں سے بھرا پڑا تھا، خانۂ کعبہ کے گرد بت ہی بت تھے، مرد وزن برہنہ طواف کیا کرتے تھے، اور عورت کہا کرتی تھی:

آج سب برہنہ ہوجائے یا کچھ، جو حصے بھی ظاہر و برہنہ ہوں گے میں انہیں حلال نہیں سمجھتی۔

اگر مسجد حرام سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالی جاتی تو اسی مکہ میں زنا کاری کے اڈے بنے ہوئے تھے، ان پر سرخ رنگ کے نشانات ہوا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری میں عائشہؓ سے مروی ہے، ساتھ مالدار لوگ غریبوں پر ظلم کرتے تھے، سردار غلاموں کو ظلم وجبر کا تختۂ مشق بناتے، طاقتور غریب کو اور مرد عورت کو ستاتا تھا (۸)، مگر ان ساری برائیوں نے نبی کریم ﷺ کو اس بات پر قطعاً آمادہ نہیں کیا کہ آپ ان کی ہلاکت وبربادی کے طالب ہوں اور ان کی بربادی کے لئے بددعائیں کریں، بلکہ آپ تو برابر ان کی اصلاح کے لئے کوشاں رہے جس کی وجہ سے وہی مخالفین جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور مسلمانوں کی

نصرت کے سامان بنے۔

چوتھی دلیل: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے زمانۂ جاہلیت میں ''حلف الفضول'' نامی معاہدے میں شرکت کی دعوت دی گئی، اگر عہد اسلام میں بھی مجھے اس قسم کا معاہدہ کرنے کی دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر کسی مسلمان کو اخلاقی یا انسانی یا اصلاحی بہتری کے لئے کسی تنظیم یا ادارے میں کام کرنے یا شریک ہونے کا موقع ملے تو اسے ضرور اس میں شامل ہونا چاہئے، بلکہ اس میں اسے پہل بھی کرنا چاہئے۔

پانچویں دلیل: اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''**کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر وتؤمنون بالله.**'' (یعنی تم بہترین امت ہو، جو برپا کئے گئے ہو لوگوں کے لئے، تم اچھائیوں کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور خود اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمان کو اصلاح کا مشن صرف اپنے اردگرد یا اپنی ذات تک محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ یہ امت ایک برپا کی ہوئی امت ہے، قرآن وسنت کی روشنی کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے، یہ ایسی امت ہے جو روشنی لئے ہوئے عام لوگوں میں پھرا کرتی ہے، صرف مسلمانوں ہی میں نہیں، یہ تو ایک ایسی امت ہے جسے اللہ نے قرآن مقدس میں بارہ مقامات پر دنیا میں لوگوں کے درمیان نکلنے، چار مرتبہ سیر فی الارض اور چار بار یہاں گھومنے کا حکم دیا ہے، یوں چلنے، پھرنے، کرنے کے بارے میں بیس مرتبہ اللہ نے حکم دیا ہے۔

جب ہم ان واضح نصوص اور دلائل کا اپنے احوال وظروف سے موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارا مغربی معاشرہ اس کے لئے بہت مناسب ہے، اس میں پوری طرح سانس لینے کی آزادی ہے، جو ہمارے لئے بہت اچھا موقع ہے، ایک شاعر کے بقول:

رائے میں عاجز رہنے والا اپنے موقع کو گنواتا ہے، جب کوئی فرصت کی گھڑی اس سے رائیگاں جاتی ہے تو تقدیر کو بُرا بھلا سناتا ہے۔

ہمارے لئے حسین موقع کی طرح ہے کہ جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کے لئے اصلاحی پروگرام بنا سکتے ہیں۔ میں اس حوالے سے ایک مثال بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۸۱ء میں امریکہ کے وزیر تعلیم نے تعلیم وتربیت اور اقتصادیات وسماجیات کے ماہرین کی ایک اٹھارہ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد امریکہ میں تعلیمی بیداری کے طریقے اور امکانات پر جائزہ لینا تھا۔ اس کمیٹی نے والدین، اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبہ وطالبات کو اپنی گفتگو میں شریک ہونے کا بھرپور موقع دیا۔ اس کمیٹی نے اپنی تجزیاتی رپورٹ میں لکھا کہ امریکہ انیس ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم میں سب سے پیچھے ہے۔ اس میں کئی چیزیں کھل کر سامنے آئیں، یہ بھی پتہ چلا کہ تئیس ملین امریکی ناخواندہ ہیں اور باصلاحیت لوگوں میں سے نصف تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی موجودہ لیاقتوں کے باوجود اس معیار کی صلاحیتوں سے محروم ہیں، اور اسکول میں زیر تعلیم طلبہ میں سترہ سال کی عمر کے چالیس فیصد ایسے ہیں جو لکھے ہوئے مواد کو نقل نہیں کر سکتے۔ اس رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ اگر امریکی قوم کی تعلیمی بہتری کے لئے کچھ ارادی زور صرف کیا جائے تو یہ ایک اعلان جنگ کی حیثیت اختیار کرنے کے لائق ہوگا، لیکن ہماری یہ لڑائی یا کوششیں غیر ارادی سمت میں ہو رہی ہیں، آگے بڑھنے کے لئے ہم نے جو بھی صلاحیتیں حاصل کی تھیں وہ پھیکی پڑ گئیں اور مصنوعی سیارچہ کو چھوڑنے کے بعد علمی سطح کو بلند کرنے کے لئے ہمیں جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اس کے سامنے گذشتہ تعلیمی کوششیں ماند نظر آنے لگیں اور اس سیارچہ کو چھوڑنے کے بعد سامنے آنے والی ابتری نے سارے باشندوں کو تعلیم میں اصلاح لانے کے لئے متحدہ کوشش کرنے کی طرف دعوت دی۔

میرا ماننا ہے کہ اگر مسلمانوں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا ہوتا اور تعلیم وتربیت کا ایک

ایسا خاکہ پیش کیا ہوتا جس میں جسم وروح، اخلاق وحقیقت حال، فرد وسماج، مرد وعورت کے ممکنہ کردار اور جرائم سے نمٹنے کے طریقے کا حسین امتزاج ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا، بلکہ کیا ہی اچھا ہوا ہوتا اگر مسلمانوں نے تئیس ملین امریکیوں سے جہالت وناخواندگی کو مٹا دیا ہوتا تو کتنے ہی لوگ اسلام قبول کر لیتے، (اگر نہیں کرتے تو کم از کم) اسلام اور مسلمانوں کی خیر وبرکت ان تک پہنچ جاتی یا کم از کم اپنوں ہی کے لئے ایسا کام کر کے خود مسلمانوں سے جہالت کو مٹا دیا ہوتا۔

اس لئے فقہی اجتہادات وفتاویٰ کا طریقۂ کار ایسا ہونا چاہئے جو مسلمان کو ایک اصلاح پسند شہری اور سب انسانوں کے لئے سودمند بنائے، وہ گھوم پھر کر ادارے قائم کرنے اور ان میں ہاتھ بٹانے ہی تک خود کو محدود نہ رکھیں، بلکہ اپنے وطن کے مسلم اور غیر مسلم تمام شہریوں کے ساتھ ظلم وزیادتی روکنے، ماحول کو تحفظ فراہم کرنے، اجتماعی تشدد پر قدغن لگانے، والدین کی ذمہ داریوں کو فروغ دینے، بیماروں، یتیموں، غریبوں اور مسکینوں کا خیال رکھنے، صفائی ستھرائی پر زور دینے، صحت وتندرستی کی خدمات عام کرنے، جانوروں کے ساتھ رحمدلی کا سلوک کرنے، نشہ آور تمباکو نوشی کے خلاف محاذ کھولنے، دنیا بھر کے اندر غریبی کے مارے ہوئے لوگوں، جنگوں کے ستائے ہوئے اور پناہ گزینوں کی نگہداشت کرنے میں ایک دوسرے کو تعاون بہم پہنچائیں۔

اس طرح کرنے سے ہمیں امید ہے کہ دشمنان اسلام ہمیں یہ طعنہ نہ دے سکیں گے کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو ذاتی منفعتوں ہی کا خیال رکھتی ہے، وہ مال، علم اور آزادی کے خواہاں صرف اور صرف اپنے لئے ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے ملک اور وطن کو کچھ نہیں دیا۔ بلکہ ہمارا عملی نمونہ تو زبان حال سے کہتا ہے کہ 'ہم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جس کی ذات سے دوسرے لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

تیسرا اصولی ضابطہ: نفس مسئلہ اور حقیقت حال دونوں کو سمجھنے کی ضرورت:

میرے علم کے مطابق مسلم علماء میں سے کسی نے اس بات کی مخالفت نہیں کی کہ فتویٰ یا اجتہاد ان لوگوں کو کرنا چاہئے جو نصوص شرعیہ کے ساتھ حقیقت حال کو بھی یکساں طور پر سمجھتے ہوں، نصوص اور دلائل کو حقیقت حال پر منطبق کرنا چاہئے، لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ مسلم اقلیتیں اس سلسلے میں بہت زیادہ بے راہ روی کا شکار ہیں، مثال کے طور پر:

امریکہ میں دو ہزار سے زیادہ اسلامی مراکز موجود ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی نے مختلف اسلامی اداروں کی مدد سے ایک سروے رپورٹ شائع کی تھی جس کے مطابق ان اسلامی مراکز کے قائدین کی تعداد دو ملین مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے، اور سچائی یہ ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود:

الف- ان کے پاس فقہ ودعوت اور عام اسلامی مطالعات میں صرف دو سو چالیس ائمہ ان علوم کے ماہر ہیں، بقیہ غیر متخصص ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کے اندر علمی وشرعی مہارت تو پائی جاتی ہے، لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بے ربط افکار کے حامل ہیں، چنانچہ وہ اپنے خطبے یا درس کے لئے یونہی کسی موضوع کو اٹھا لیتے ہیں، یا فتوی دینے کے لئے کوئی باب الفتاوی کسی کتاب کا پڑھ لیتے ہیں اور اسی کے مطابق فتوی دے دیا کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد اور حقیقت حال کو سمجھنے، نفس موضوع پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے اور جزئیات سے مقاصد شرع تک رسائی حاصل کرنے، نیز فقہی حس پیدا کرنے کے لئے علوم قرآن وحدیث اور اصول فقہ کا منظم مطالعہ تو دور کی بات، کم ہی ان میں مہارت رکھنے والے دیکھے جاتے ہیں۔

ب- اپنے فضل وبرتری، مشن کی بلندی، نیز اس کاز کی اہمیت اور کردار کی عظمت کے باوجود ان میں سے بہت سے ائمہ ایسے ہیں جنہیں شرعی مدارس میں یا تو اچھی طرح ٹرینڈ

نہیں کیا گیا یا سطحی فکر کے ساتھ ان کی تربیت کی گئی جس میں صلاحیت سے زیادہ جلد بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ علم کا سب سے بڑا دشمن ترک ہے، چنانچہ جو علم کو چھوڑ دیتے ہیں تو علم جاتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ ان ائمہ میں سے بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اس لئے جو کچھ سیکھا تھا وہ بھی بُھلا بیٹھے۔ وہ تقریر، وعظوں اور خطبوں کی وادیوں میں سرگرداں ہو گئے جس کی حیثیت جلدی جلدی نگلے گئے لقموں سے کچھ زیادہ نہیں۔

ج- تمام لوگوں کو وہ جس بھی سوسائٹی میں رہ رہے ہوں اسے سمجھنے کی ضرورت ہے، وہاں کے ماحول کو جاننے کے ساتھ اس کی تاریخ کو بھی جاننا چاہئے۔ وہاں درپیش مسائل، چیلنجز، وہاں کی ضرورتوں، وہاں کے لوگوں کی امیدوں، امنگوں، وہاں درآنے والے جرائم اور ان کے خاتمے کے تئیں سوچنا چاہئے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی زندہ شخصیت سازی کا کسی ایسی سوسائٹی میں رول ادا کیا جاسکتا ہے جہاں اعتدال پسندی ہو، ظلم وجبر یا مسائل سے بے توجہی و بے رخی کی لعنت نہ ہو۔ اس لئے یہ تمام ائمہ وقائدین منظّم تربیت اور مطالعات کے سخت محتاج ہیں، بے ربط اور پراگندہ مطالعہ اس کام کے لئے ناکافی ہے، تدریجی مراحل ہی سے موجودہ مشکلات میں گرفتار سماج کی اصلاح ممکن ہے۔

سچائی یہ ہے کہ انتظامی علوم بہت ترقی کر گئے ہیں، حال اور مستقبل کی منصوبہ بندی پر ان کا انحصار ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ یہ منصوبہ بندی فہم وبصیرت کی بنیاد پر چار مراحل میں کی جائے۔ ان چاروں مراحل کو ماہرین نے چار حرفوں (S.W.O.T) میں یکجا کر دیا ہے:

۱- طاقت کے عناصر کو جاننا۔

۲- کمزوری کے اسباب کو جاننا۔

۳- فراہم شدہ مواقع اور امکانات جاننا۔

۴- خطرات وچیلنجز سے آگاہی حاصل کرنا۔

یہ صرف ایک قاعدہ ہے، اس سے پہلے کلی ہدف تیار کرنا، تفصیلی مقاصد پیش کرنا، پھر عملی تطبیق کے وسائل کی فہرست تیار کرنا، پھر کم یا زیادہ وقت کے حساب سے ان کاموں کو مختلف مرحلوں میں تقسیم کرنا، پھر زمینی طریقۂ کار اپنانا اور ضروری وسائل فراہم کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں اخراجات کا بجٹ بھی تیار کرنا شامل ہے، نیز مختلف میدانوں میں علم وفن کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کرنا اس کا ایک حصہ ہے۔ تو کیا ان زندہ پہلوؤں سے صرف نظر کر کے ہم کوئی اصلاحی پروگرام چلا سکتے ہیں۔ یقیناً اپنے گردوپیش سے پہلوتہی اختیار کر کے ایسا کام کرنا ناممکن ہے۔

میرا ماننا ہے کہ نص، حقیقت حال کو سمجھنا اور فتاوی کی ایسی تربیت دینا جو موجودہ مشکلات کا حل پیش کر سکے، نہایت اہم ہے مگر اس کے ساتھ یہ کام مختلف مسائل سے گھرا بھی ہے۔ اس کاز کے لئے ایسے مفتی اور فقیہ درکار ہیں جو جوانمردی اور پامردی کے ساتھ علمی مسائل کی تہہ تک پہنچیں اور خشیت الٰہی کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، تاکہ وہ اپنے حال درپیش مسائل ومشکلات کی اصلاح کر سکیں۔

میری نگاہ میں ہمارے فقہاء کی کامیابی نفس مسئلہ وموضوع اور حقیقت حال دونوں کو سمجھنے کے اسی معیار پر اترنے ہی سے ممکن ہے، اسی معیار نے حضرت عمرؓ کو فتوؤں اور سرکاری قراردادوں کے مابین متردد رہنے سے روک دیا، حضرت ابوبکرؓ سے ہٹ کر بھی فیصلے دیئے۔ فقہ کی روشنی میں نئے مسائل کو حل کیا، حضرت علیؓ بھی اسی ڈگر پر چلے انہوں نے شرابی کو چالیس کوڑے رسید کرنے کا حکم صادر فرمایا جبکہ حضرت عمرؓ نے اس کی حد اسّی کوڑے حدقذف پر قیاس کرتے ہوئے مقرر کیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ کے اندر صاحب حق کے بارے میں صرف ایک گواہ اور ایک قسم سے فیصلہ کر دیا کرتے تھے (اور شام میں دو گواہوں اور ایک قسم کی شرط لگاتے تھے)، اختلاف زمانہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں امام ابویوسف، محمد شیبانی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ نے اپنے امام کے برعکس فتوے

دیئے، دلائل کے مختلف ہونے سے انہوں نے فتوے نہیں دیئے، بلکہ زمانہ کے بدلنے اور مختلف ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایسے فتاوے دیئے۔ امام شافعیؒ کے مصر اور عراق کے فتاویٰ میں اختلاف اسی بناء پر ہے۔ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم نے ایسے فقہی مسائل میں بھی مناقشہ اور از سر نو بحث کی جن کے بارے میں فقہاء کے حکم اجتہادی کے اجماع کا دعویٰ کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے وقت اور حال کے تقاضوں کے مطابق نئے مسائل کو بیان کرنے سے چوکے نہیں۔ ابن قیم نے زمانہ بدلنے کی وجہ سے ایسے فتاوی کے بارے میں کلام کیا جو تقریباً متفق علیہ چلے آرہے تھے، ان میں اس سے پہلے اختلاف رائے دیکھا ہی نہیں گیا تھا۔ ہمیں ڈاکٹر مقری الادریسی المغربی کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لینی چاہئے کہ ''پچاس سال کی مدت گذرنے یا ایک ہزار میل کا فاصلہ ہونے کے بعد فروعی مسائل کے فتاوی کو بغیر اجتہادی نظر ثانی کے صادر کرنا جائز نہیں''۔

یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ ٹھوس بنیادوں اور اصول کو چھوڑ کر فروع میں ہر عرف (زمان ومکاں) کا اپنا اعتبار ہوتا ہے۔ قطعی مسائل میں مزید دلائل کی تو ضرورت نہیں، البتہ فقہی اکادمیوں، ائمہ کی ٹریننگ اور اسلامی لیڈرشپ (قیادت) کی حالت میں بہتری اور ترقی لانے کے لئے زبردست کوشش کی ضرورت لازمی طور سے ہے، تاکہ ایسے فتاوی صادر کئے جائیں جن میں فقہ نصوص، اس کے شرعی مقاصد کے ساتھ ساتھ وقت کے حقیقی مسائل کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

چوتھا اصولی ضابطہ: عام مسائل میں اجتماعی اجتہاد کی طرف رجوع:

جزوی اور انفرادی مسائل میں کوئی تنہا عالم یا امام فتویٰ دے سکتا ہے، خواہ وہ دوسرے سے فتوی نقل کرکے دے یا ذاتی اجتہاد کی بنیاد پر دے، لیکن مسائل یا فقہاء کی زبان میں عموم بلویٰ والے مسائل میں اجتماعی فقہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اس طرح کسی ایک ہی

عالم یا امام کے فتوی سے احتراز کرنا چاہئے، اس میں سلف صالحین کی اقتداء ہے جو اجتماعی وباہمی صلاح ومشورہ سے فتوی دیا کرتے تھے، انفرادی طور پر نہیں، اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱- امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی بصری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ آتا تو اس کے حل کے لئے سب سے پہلے اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرتے۔ اگر اس میں فیصلہ دینے والی کوئی آیت اس سلسلہ میں ملتی تو اس کے مطابق فیصلہ دے دیتے، ورنہ حدیث کی طرف رجوع کرتے۔ اگر اس میں اس چیز کے بارے میں فیصلہ دینے والی حدیث ملتی تو اس کے مطابق فیصلہ دیتے۔ اگر دونوں میں نہیں پاتے تو لوگوں سے پوچھتے کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس معاملے میں کیا فیصلہ دیا تھا؟ تو کبھی کبھی کوئی کھڑا ہوتا اور کہتا کہ ہاں اللہ کے رسول نے اس معاملہ میں ایسا اور ویسا فیصلہ دیا تھا اور اگر سنت رسول میں بھی وہ چیز نہیں ملتی تو سرغنہ مسلمانوں کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے پھر جس چیز پر اتفاق رائے حاصل ہوجاتی اسی کے مطابق فیصلہ کردیتے۔

۲- علامہ ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں بیان کیا ہے کہ غیر منصوص مسئلوں میں فیصلہ دینے کے لئے عمرؓ صحابہ کرام کے ساتھ مل کر بیٹھ کر باہم مشورہ کرتے، جس چیز پر اتفاق رائے حاصل ہوجاتی اسی کے مطابق فیصلہ کردیتے اور جب انہوں نے ابوموسیٰ اشعری کو (گورنر بناکر) بصرہ کی طرف روانہ کیا تو انہیں بھی اسی طریقۂ کار کی ہدایت دی۔

۳- امام دارمی نے اپنی سنن میں اپنی سند سے مسیّب بن رافع سے روایت کی ہے کہ جب صحابہ کرام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ درپیش آتا جس میں اللہ کے رسول کا کوئی فیصلہ نہ ہوتا تو اس کو حل کرنے کے لئے وہ یکجا ہوتے اور کسی چیز پر اتفاق رائے قائم کرکے اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ دے دیتے۔

۴- امام طبرانی نے ''الاوسط'' میں اپنی مسند سے علی بن ابی طالبؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت فرمایا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جس کے بارے میں کتاب وسنت میں صریح حکم موجود نہ ہو تو میں کیا کروں؟ آپ اس بارے میں مجھے کیا ہدایت فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم اپنے میں سے فقیہ، عبادت گزار مومنوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کر کے فیصلہ دو، صرف اپنی رائے سے خاص طور سے فیصلہ نہ دیا کرو۔ اسی وجہ سے امام ماوردی نے اسی مفہوم پر زور دیتے ہوئے اپنی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' کے ابتدائی صفحات میں اس قسم کی باتیں بیان کی ہیں اور شاعر کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے:

یعنی ایسے پراگندہ لوگوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی جن کا کوئی قائد نہ ہو اور جہاں جاہلوں کی سیادت کا سکہ چلتا ہو وہاں ایسے سردار نا پید ہوتے ہیں۔

میری نگاہ میں اجتماعی اجتہاد کے لئے فقہی اکادمیوں میں ماہرین فن، مثلاً ماہر طب، ماہر فلکیات، نیز اقتصادیات، سیاسیات، سماجیات اور قانون وغیرہ کے ماہرین کا ہونا از حد ضروری ہے، ایسا اس لئے ہے کہ موجودہ زندگی ترقیات کی وجہ سے پیچیدہ تر ہوگئی ہے اور یہ ترقی ہر سمت میں پھیلتی جارہی ہے، فروعات اور اجنبی پہلوؤں میں بھی وسعت آتی جارہی ہے، اب زندگی میں وہ سادگی نہ رہی جو پہلے تھی، نہ ہی وہ آسانیاں رہیں جس کی وجہ سے اس وقت صرف عالم دین ہی تمام امور حیات کے بارے میں فتوے دے دیا کرتے تھے، لیکن آج کے زمانے میں صرف علماء دین زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں فتوی دینے سے قاصر ہیں، اس میں لازمی طور سے اجتہاد یا فتوی کے متعلقہ موضوع کے ماہرین کی مدد لینا ہوگا، یہ استیناس کے قبیل سے نہیں، بلکہ تأسیس کے قبیل سے ہوگا، یہی نہیں بلکہ شرعی اور عقلی طور سے غیر مسلم ماہرین کی خدمات حاصل کرنا اس سلسلے میں ان سے مدد لینا بھی کوئی ممنوع بات نہیں ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ وہاں

کے حقیقی باشندوں، حقیقی امریکیوں، حقیقی یورپین مسلمانوں کے علماء اور فقہاء کو تمام میادین حیات میں تربیت دینے کی کوشش بھی جاری رکھنا چاہئے (تاکہ ممکنہ حد تک غیر مسلم ماہرین کی خدمات سے بے نیازی حاصل ہوسکے) ہاں جلدی نہیں مچانا چاہئے، اسی طرح اپنوں کو ٹرینڈ اور تیار کر کے اپنی فقہی اکادمیوں کا انہیں ایک حصہ اور رکن بنالیں، لیکن اس معاملہ میں احتساب کی ضرورت ہے، اس کے لئے پروگرام سازی کی ضرورت ہے، تب کہیں جا کر یہ چیز عملی طور پر معرض وجود میں آسکتی ہے۔

پانچواں اصولی ضابطہ:

شریعت کے دلائل کے ساتھ خشیت سے لبریز دل:

شاید سب سے زیادہ تقویٰ اور دل کی خشیت کے محتاج اور ضرورت مند علماء دین ہوتے ہیں، اس لئے کہ ایک عالمِ کی لغزش ایک عالم کو لغزشوں میں ڈال سکتی ہے، اور صحیح اجتہاد میں شرعی دلائل وبراہین کے لئے دل کی پارسائی اور خشیت قلب کا اجتماع وامتزاج ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس لئے کہ شرعی دلائل وبراہین کے قحط سے اجتہاد کمزور ہوجاتا ہے، فتووں میں شکوک وشبہات در آتے ہیں اور یہ انسان کو جہنم کے کنارے پہنچا دیتے ہیں، اللہ کی پناہ! جو لوگ بغیر علم اور دلائل سے ناواقفیت کے باوجود فتوی دیتے ہیں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بناتے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ رقمطراز ہیں کہ فتوی کی کثرت وقلت علم کی کثرت وقلت پر منحصر ہوتی ہے۔ دوسری طرف دل کی پارسائی اور خشیت قلب کی اس باب میں حیثیت نمایاں تر ہے، اور یہ شرعی دلائل سے ثابت شدہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے 'جو لوگ اللہ کے پیغامات (دوسروں تک) پہنچاتے ہیں، اس سے ڈرتے ہیں، خشیت کھاتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے'، مزید فرماتا ہے 'اللہ کے بندوں میں اللہ سے (زیادہ) ڈرنے والے علماء ہی ہوتے ہیں' جن لوگوں کو اللہ تعالی علم کے باوجود خاموش رہنے کی وجہ

سے جہنم رسید فرمائے گا ان کے بارے میں بہت زیادہ احادیث وارد ہیں، نیز ان کے بارے میں بھی جو بغیر علم کے فتوی دیتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالی فرمائے گا' میں زیادہ حقدار تھا کہ تم مجھ سے ڈرتے پھر اس کو جہنم میں اوندھے منہ کر کے ڈال دے گا۔'

خشیت قلبی یہ آج ایک ضرورت بن گئی ہے، چنانچہ علماء کی اکثریت نے اس ضرورت کو محسوس کیا، یہ صفت ان کے اندر کارفرما رہی، چنانچہ ائمہ اربعہ کو اس حوالے سے ابتلاء وآزمائش کی صبر آزما گھڑیوں سے گذرنا پڑا، مگر ان میں سے ہر ایک نے وہی بات کہی جس کا انہیں علم تھا، خلاف علم کوئی بات نہیں کہی، ابن تیمیہ اور عز بن عبد السلام نے حق کا ببانگ دہل اعلان کیا، ان کے ذریعہ اللہ تعالی نے امراء وسرداران قوم کی اصلاح فرمائی، جن میں سے سیف الدین قطز، خاص طور سے قابل ذکر ہے، ان کی یہی حق گوئی وبے باکی تاتاریوں کے ٹڈی دل لشکر سے ٹکر لینے کی وجہ بنی جنہوں نے دنیا میں لوٹ مار اور قتل وخونریزی برپا کر رکھی تھی، انہوں نے عزتوں کو پامال اور علمی ذخیروں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ انہیں جیت محض علوم ومعارف کے ذریعہ عقل وخرد کی پختگی کی وجہ سے نہیں ملی، بلکہ اس کے راہرووں کے دلوں میں خشیت الہی کی وجہ سے انکساری نے جگہ بنائی جس نے انہیں حق گوئی کے لئے بے باک بنا دیا انہیں حق بولنے پر آمادہ کیا، خواہ وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، اور درحقیقت یہی دل کی پارسائی عوام کو علماء کے عزت واحترام، ائمہ کی اقتداء تسلیم کرنے، اور قوم کے چنندہ لوگوں سے بنیادی مسائل حل کرانے پر آمادہ کرتی ہے، جس سے دین پھیلتا اور فروغ پاتا ہے اور اصلاح اور مناسب تبدیلی کا کام انجام پاتا ہے۔

یاد رہے کہ یہاں اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ان علماء اور ائمہ میں سے ایسے مشن برداروں کو تیار کرتی ہے جو اکادمیوں، مساجد کی دیواروں سے نکل کر ہر اُس جگہ پہنچتے ہیں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ وہ ترش روئی کی وجہ سے بکھر جانے والوں یا علیحدگی کے ذریعہ گوشہ نشینی اختیار کرنے والوں کے مابین امن کے

پیامبر بن کر ابھرتے ہیں۔ اس ماحول میں لوگوں کو وسطیت اور اعتدال پسندی کا درس دیتے ہیں، حسن گفتار اور خوش گوار مباحثے کا ماحول بناتے ہیں، اسی وجہ سے علامہ شیخ قرضاوی نے ۲۰۰۲ء میں فرانس کے اندر منعقد ہونے والے اجلاس میں کہا تھا ''عوام کی خواہشات کا اتباع اور ان کی پیروی بادشاہوں اور امراء وسلاطین کی خواہشات کے اتباع سے کم نہیں، چنانچہ چند علماء اور ائمہ ''سامعین کی پسند ومطالبے'' کے نام پر قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں، پس اگر ان کے اردگرد کسی خاص مسلک کے پیروکاروں کا مجمع ہوتا ہے تو وہ ان ہی کی پارسائی بیان کرتے ہیں، یا کسی خاص جماعت کا سایہ ان پر قائم ہوتا ہے تو ان کی مرضی کے آگے سپر ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر وہ تشدد وسخت گیری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو آسانی والے احکام بتانے سے گریز کرتے ہیں اور اگر وہ سست اور غافل لوگوں کے مابین رہتے ہیں تو سہل انگیز یکسانیت پر مبنی احکام انہیں بتاتے ہیں، ایسا مغربی ممالک میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کے ائمہ کی تنخواہیں وہاں کی مختلف منتظمہ کمیٹیاں ہی دیتی ہیں جو مختلف نظریات اور رجحانات کی حامل ہوتی ہیں، اس طرح ٹالنے والا اظہار اپنے تمام اصلاحی آثار کو آپ ملیامیٹ کر دیتا ہے، اور یوں مشرقی ممالک میں امراء وسلاطین کی خواہشات کا اتباع اور مغربی ممالک میں عام مسلمانوں کی خواہشات کا اتباع علماء کے رول کو کمتر اور کمزور کر دیتا ہے، الا یہ کہ جسے اللہ اپنے رحم خاص سے نوازے، اسے علم کی قوت سے سرفراز فرمائے، اور اس کے دل میں یقین کی شمع جلائے، ان کے اندر شجاعت وبہادری کو پیدا کر دے، جس سے وہ مصالح ومفاسد کا اندازہ لگانے اور اسباب ومقاصد کو تلاش کرنے کی ذمہ داری خوب محسوس کرتے ہیں اور لوگوں کو ایسے فتوے دیتے ہیں جس سے رب کی مرضی حاصل ہو، وہ اس پر بھروسہ کرتے ہیں، حفظ وامان کے طالب ہوتے ہیں اور سچ پوچھو تو اللہ ہی بہتر محافظ اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اگر اس کو ابتلاء وآزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ صبر وشکیبائی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنے صبر اور اللہ پر بھروسہ کی وجہ

سے اللہ کے پیغام کو زندہ دلوں اور پاکیزہ ذہنوں تک پہنچانے میں ضرور کامیاب ہوگا، چنانچہ اللہ کے حکم سے اس کی یہ کاوشیں رنگ لاتی ہیں، جیسا کہ آج ہم طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اپنے ائمہ اعلام کے علم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ اللہ رحمٰن کے طریقے اور سنتیں ہیں جس میں کسی بھی وقت اور زمانے میں بحران یا تبدیلی نہیں دیکھی جاتی۔

چھٹا اصولی ضابطہ: عبادات اور معاملات میں فقہ مقاصد پر اعتماد:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالی کے جملہ افعال واوامر ہر قسم کی لغویات سے پاک ہیں، بلکہ اللہ کے ہر ایک حکم کے پیچھے ایک یا ایک سے زیادہ مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں، خواہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اقلیات کے فقہ کے تئیں گفتگو کرتے وقت ہمیں اسی فقہی میراث کی طرف پلٹنا چاہئے، چناں چہ ہم اس حوالے سے تتبع کے بعد اپنے فقہاء میں سے کسی کو بھی فقہ مقاصد اور تعلیل سے خالی نہیں پائیں گے، سوائے علامہ ابن حزم اور ان کے مکتب فکر ''ظاہریہ'' کے مگر جمہور نے فقہ تعلیل ومقاصد کی بھرپور تائید کی ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں نے اشارہ کیا ہے، اور بعض نے اسے اصل کی حیثیت دی ہے اور بعض نے اسے صوابدید پر منحصر بتایا ہے، لیکن ان میں سے غالب اکثریت نے عملی طور پر اپنے فتوؤں اور اجتہادات میں تعلیل ومقاصد کے مصالح کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، ہاں وضاحت واصل کی صورت میں اسے قیاس کا نام دیا ہے۔ دراصل قیاس ہی تعلیل محدد اور مصالح کا جوہر ہے، اسے تعلیل موسع، استحسان، سد ذرائع بھی کہا جاتا ہے اور یہ ساری چیزیں مجموعی حیثیت سے فقہ مقاصد کے گرد گردش کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں اس سلسلے میں لکھی گئیں تصنیفات کی نظر ثانی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

یہ سب عظیم علمی سرمایہ تحلیل وتجزیہ، نظر ثانی اور تحقیق نو کا محتاج ہے تاکہ جملہ مقاصد کی

درجہ بندی کی جاسکے۔ میں یہاں عبادات اور معاملات کے مقاصد کو سمجھنے، اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے مابین کوئی فرق نہیں قائم کرسکتا، کیونکہ یہ مقاصد بسا اوقات کسی فقیہ کو معلوم ہوجاتے ہیں اور بعض لوگوں کو معلوم نہیں ہوتے مگر اتنا ضرور ہے کہ معاملات کے اکثر مصالح اور مقاصد معلوم ہوجاتے ہیں اور عبادات میں کم معلوم ہو پاتا ہے پھر بھی عدم علم سے کسی چیز کا عدم وجود لازم نہیں آتا، اس لئے (مخفی حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر) حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مسجد کے اندر نماز تراویح بیس رکعت کرنے، حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں چھتیس رکعت تک اس کو بڑھا دینے، نیز جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لئے زوراء نامی بازار میں ایک اور اذان دینے، زکوۃ الفطر میں نقد رقم یا اہل شہر کی عام غذا کو نکالنے نیز عورتوں، کمزوروں اور بیماروں کو (زنا کی وجہ سے) سنگسار کرنے کے لئے آسان وقت اختیار کرنے میں میری نگاہ میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن فقہ مقاصد کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجتہد کے ذہنی اختلاف سے فقہ مقاصد جزوی احکام میں صریح نصوص سے تجاوز کر جائے، بلکہ فقہ مقاصد میں بھی نصوص کا اعمال اہمال سے بہتر ہے، نسخ یا ترجیح کے بجائے جمع وتطبیق کی صورت اختیار کرنا چاہئے۔ یہ ہر مجتہد کی اولین کوشش ہونی چاہئے، اس لئے کہ کلی مقصد جزوی نصوص ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں، اور شرعی نصوص میں جزوی کا کلی کے ساتھ ٹکراؤ ناممکن ہے، اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگوں کو اس میں شدید اختلاف نظر آتا، (لیکن نصوص شرع منجانب اللہ ہیں اس لئے یہ تعارض ناممکن ہے)۔

شاید جن فقہاء نے سب سے پہلے جزوی نص اور مقصد کلی کے مابین جمع وتطبیق کی ان میں اولین حیثیت حضرت عمر بن خطابؓ کو حاصل ہے، جنہوں نے نص کی وجہ سے حجر اسود کو بوسہ دینے، اصطباع اور رمل میں توقف کرنے، مصارف زکوۃ میں ''مولفۃ القلوب'' کی حصہ داری، عقوبات کے باب میں چور کا ہاتھ کاٹنے، تین طلاق کو ضروری قرار دینے، ابوحذیفہ کو کتابیہ سے شادی کرنے سے روک دینے، ارض سوداء کی تقسیم پر پابندی لگانے،

میراث کے مسئلے میں باپ کو ماں سے دوگنا حصہ دینے شوہر کے بعد ماں کو باقی ثلث (ایک تہائی) حصے کا وارث بنانے، نیز عول اور مسئلہ مشترکہ میں مقصدی اجتہاد کو وسعت بخشی ڈاکٹر محمد بلتاجی نے اپنی کتاب ''منہج عمر بن الخطاب فی التشریع'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جملہ احکام ومسائل میں فقہ مقاصد اور فقہ مصالح کا راستہ اختیار کیا۔

شاید ہم اپنے موضوع اور گفتگو سے بہت قریب ہوجائیں اگر اس حقیقی تاریخی روایت کا حوالہ دیا جائے کہ بنی قریظہ میں نماز عصر کا واقعہ ایک تعبدی مسئلہ میں قطعی دلائل سے ثابت معاملہ میں ایک مقصدی اجتہاد کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جن لوگوں نے راستے میں نماز ادا کرلی وہ اہل معانی اور اہل قیاس تھے اور جنہوں نے نبی ﷺ کے حسب ارشاد زوال وقت کے بعد) بنوقریظہ ہی میں پہنچ کر نماز ادا کی، وہ اہل ظاہر کے سلف تھے، جیسا کہ ابن قیم نے بیان کیا ہے، یہ دونوں فکری زاویے درست تھے (ایک نے عقل وقیاس کا استعمال کیا کہ اللہ کے رسول نے جو یہ کہا ہے کہ ہمیں بنوقریظہ میں چل کر عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ اس کا مقصد ہے وہاں جلد از جلد پہنچنا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وقت ختم ہورہا ہے تو انہوں نے راستے ہی میں نماز پڑھ لی۔ یہ اجتہادی نظریہ تھا جب کہ دوسرے گروہ نے صرف اللہ کے رسول کے الفاظ سنے اور اس کو گرہ سے باندھ لیا کہ چونکہ اللہ کے رسول نے ہمیں بنوقریظہ میں عصر کی نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، اسلئے نماز وہیں ہوگی خواہ وقت رہے یا نہ رہے، یہ اہل ظاہر کا نظریہ تھا)، یہ فکری اختلاف تھا، لیکن اس سے دل کا اختلاف نہیں پیدا کرنا چاہئے، اس لئے کہ فکری اختلاف نعمت ہے، لیکن دلوں میں پیدا ہونے والا اختلاف وبا ہے۔

ساتواں اصولی ضابطہ: داخلی اور خارجی احوال وامکانات کے مطابق ترجیحات کا تعین:

خارجی اور داخلی احوال وظروف ومکانات کے ان دو معیاروں کے مطابق ترجیحات کے تعین میں کسی اقدام کو اولیت دینا بہت ہی ضروری ہے۔ اس میں قرآنی نصوص اور پیغمبر

عالم ﷺ کی اقتداء ہے، جس کی روشنی میں کوئی بھی دانا دعوت وتبلیغ کے جملہ مراحل میں سے کسی بھی مرحلہ میں غلطی نہیں کرسکتا۔

چنانچہ (نبوی آئینہ میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ) دعوت نبوی کے پہلے مرحلے میں خفیہ دعوت کا خیال رکھا گیا، مسلمانوں کے نام ظاہر نہیں کئے گئے یہاں تک کہ حمزہ اور عمرؓ مشرف بہ اسلام ہوئے (جن کے اسلام سے اعلانیہ دعوت ترقی کرنے لگی) اور دعوت کے اعلانیہ مرحلے میں بھی کمزور اور غریب مسلمانوں کے نام پوشیدہ رکھے گئے اور ٹکراؤ سے بچنے، گفتگو کا دروازہ کھولنے اور ایک ایسی سرزمین میں دعوتی کاز کو انجام دینے کی خاطر جہاں کسی پر ظلم نہ ہوتا ہو کچھ لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی، اس مرحلہ میں جو منہج کار فرما تھا وہ تھا ''**کفوا أیدیکم و أقیموا الصلاۃ**'' تم اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو۔

اس مرحلے میں آپ ﷺ خارجی احوال وظروف مثلاً دشمنوں کی ایذا رسانیوں، سزاؤں اور تمسخر کی طرف توجہ نہیں دی، (ان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے باز رہے، یہاں تک کہ حضرت سمیہؓ کی شرمگاہ میں، نیزہ مار کر انہیں شہید کردیا گیا اور ان کے شوہر کو قتل کردیا گیا تو انتقامی کارروائی کے بجائے نبی پاک ﷺ فرماتے رہے 'اے یاسر کی اولاد! صبر کرو تمہارا ٹھکانہ جنت ہے'، اسی طرح آپ ﷺ نے سعد بن ابی وقاص کو وقت سے پہلے (انتقامی) کارروائی سے منع فرمادیا، حضرت سعدؓ نے جلدی اس لئے کی کہ انہوں نے یہ آیت پڑھ لی تھی 'اور ایمان ویقین سے محروم لوگ تمہیں ذلیل نہ سمجھیں'، لیکن نبی ﷺ جب بااقتدار ہوئے اور مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی تو بنوقینقاع کے بازار میں ایک مسلم خاتون کے بے لباس کردینے پر (جو کہ سمیہؓ کے حادثہ سے کہیں کمتر تھا) بنوقینقاع سے باقاعدہ مقابلہ کیا آپ نے اس واقعہ میں بھی ہمیں عدل وانصاف کی تعلیم دی، اس لئے کہ مدینہ میں آباد سارے یہودیوں سے آپ نے انتقام نہیں لیا، بلکہ جن لوگوں (بنوقینقاع) نے یہ شرارت کی تھی صرف ان ہی سے جنگ کی، ان کے پڑوس میں آباد یہودیوں کے دیگر

قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ کو کچھ نہیں کہا، اس لئے کہ اس وقت تک ان کی طرف سے کوئی خیانت سرزد نہیں ہوئی تھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک ریاست کے حکمراں ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر جب کفار ومشرکین کے دس ہزار لشکر نے مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے مدینہ پر حملہ کیا تو آپ نے بنوغطفان کے بعض قبائل سے مدینہ کے ایک تہائی پھلوں پر معاہدہ بھی کیا، خندق کی کھدائی کے وقت بنو قریظہ نے خیانت کی، جس کی وجہ سے مسلمان جنوب کی طرف سے غیر محفوظ ہوگئے اور مدینے کا کوئی دیگر قبیلہ حامی نہ رہا، لیکن اس برے وقت میں بھی حکمت عملی سے پیارے نبی ثابت قدم رہے۔ اگر مدینہ کی قیادت نے سپر ڈال دیا ہوتا تو معاملہ کب کا تمام ہوجاتا۔

اس طرح آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامے کے بعض کلمات اور دفعات میں بھی سہل انگیزی کا مظاہرہ کیا، مثلاً (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے) باسمک اللھم لکھا، رسول اللہ کا لفظ مشرکین کے کہنے اور ضد کرنے کی وجہ سے مٹا دیا، نیز ان کی اس شرط کو بھی منظور کرلیا کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہوکر مکہ سے مدینہ جاتا ہے تو مسلمان اسے واپس مکہ لوٹا دیں گے، آپ ﷺ نے یہ سب اس لئے برداشت کیا کہ آپ کے سامنے اس سے بھی بڑی چیز تھی جسے آپ ان باتوں اور تنگیوں پر فوقیت دے رہے تھے، وہ چیز تھی جزیرۂ عرب اور اس کے باہر اسلامی دعوت کو عام کرنے کا موقع اور صلح کے نتیجے میں ملنے والی مدت دراز، چنانچہ موت اور جہاد پر بیعت کرنے والے صحابہ ومومنین کے اس عزم نے اور مسجد حرام سے روک کر اور دیگر شرطیں لگا کر مشرکین کے غضب آور رویہ نے آپ ﷺ کو چنداں نہیں متاثر کیا، بلکہ آپ ﷺ نے جزیرہ عرب کے اندر اور اس کے باہر اسلامی دعوت کی تبلیغ واشاعت کے کاز کو ان ساری چیزوں پر فوقیت دی، عمر بن الخطاب اور دیگر صحابہ کی حمیت دین جو اس وقت بھڑک اٹھی تھی، آپ ﷺ کے کہنے کے باوجود صحابہ کے سر منڈنے اور قربانی کرنے کچھ دیر تک احرام نہ کھولنے کے تذبذب نے بھی آپ کی اس فوقیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا، بلکہ

آپ ﷺ نے انہیں نظر انداز کردیا اور ان شدید خواہشات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ میں ترجیحات کے تعین کا معاملہ اس وقت مزید نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے جب فتح مکہ کے باب کو تاریخ پڑھتی ہے کہ آپ ﷺ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور لوگ جوق در جوق اس وقت اسلام میں داخل ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے اپنی مرضی اور شدید خواہش کے مطابق بھی خانۂ کعبہ کو ڈھا کر ابراہیمی بنیادوں پر محض اس لئے از سر نو تعمیر نہیں کرایا کہ اس وقت لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لئے آپ نے اس اقدام کو مصلحت پر فوقیت نہیں دی، اسی طرح جاننے کے باوجود بھی آپ ﷺ نے منافقین کے قتل کا حکم محض اتحاد اور مسلمانوں کے شیرازے کو بنے رہنے کو فوقیت دیتے ہوئے نہیں دیا، نیز یہ مقصد بھی تھا کہ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی مسلمان ہوجائے، یہی چیز موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے قرآنی واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے جس وقت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل نے ایک بچھڑے کی پوجا شروع کردی تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو (جو اس وقت موجود تھے اس کو نہ روکنے پر) ڈانٹ لگائی، جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

یہ وہ بعض دلائل ہیں جنہیں شیخ علامہ یوسف قرضاوی نے ترجیحات کے تعین اور فوقیت کے بارے میں ذکر کیا ہے اور اس میں ان کے شریک کار کئی دیگر علماء بھی رہے ہیں۔ انہوں نے یہ باتیں اقلیتوں کی فقہ، ترجیحات کے تعین، انجام کار اور تقابلی مطالعہ کے حوالے سے کی ہیں۔ اس میں اجتہاد کی دیگر صورتوں بالخصوص اقلیتوں کے فقہی اجتہادات میں مزید توسیع، گہرائی وگیرائی اور جڑوں تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں اجتماعی اجتہاد کی بھی ضرورت ہے، تاکہ مغربی ممالک میں اس کے مسلم اقلیتوں کی ترجیحات کا تعین ہوسکے۔ اور حسب ذیل امور پر توجہ دی جاسکے۔

۱- آدم سازی اور ادارہ سازی میں توازن۔

۲-اصلی باشندوں کی زندہ قیادتوں کا احیاء۔

۳-تمام نوجوانوں کی دعوتی اور تربیتی پروگراموں میں شمولیت۔

۴-مختلف ممالک کے باشندوں اور شہریوں میں اسلامی وحدت اور یگانگت کا فروغ۔

۵-اسلامی اداروں کو چلانے اور جاری رکھنے کے لئے رفاہی اوقاف کا قیام۔

۶-ٹیلی ویژن کیبل، نیز دنیا کی زندہ زبانوں میں انفارمیشن انسٹی ٹیوٹ کا قیام۔

۷-غیر مسلموں کے ساتھ گفتگو وڈائیلاگ اور تعلقات کی بہتری کے لئے پیش رفت۔

۸-اسلامی بنیادوں پر ایسے اقتصادی منصوبوں کا خاکہ جو مسلمانوں کی مالیات میں اضافے اور معاشی ترقی کا حل پیش کر سکے۔

آٹھواں اصولی ضابطہ: مختلف مسالک کے مابین قربت پیدا کرنا اور اجتہاد میں انتخاب یا جدت کی راہ اختیار کرنا:

جو لوگ مسالک کو بالکلیہ ختم کرنے کے لئے نیا مسلک اسلام، یا مسلکوں کے رایوں میں منحصر ہونے کو مسلکی تعصب کا نعرہ دیتے ہیں ان کے یہاں زبردست غلو پایا جاتا ہے۔ یہ استدلال کی کمزوری ہے۔ وسطیت واعتدال کو فراموش کر کے یہ لوگ زمان ومکان کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے تقاضوں سے نابلد ہیں۔ اس سلسلے میں اعتدال کا راستہ یہی ہے کہ ان مسلکوں کے بیچ پائی جانے والی خلیج کو ختم کیا جائے، باہم قربت پیدا کی جائے، جیسا کہ شیخ ابوزہرہ نے ''الوصیۃ عند الجعفر'' یہ میں ذکر کیا ہے۔ مزید رقمطراز ہیں کہ ''یہ مسالک چھوٹی چھوٹی نہروں کے مانند ہیں جو اسلام نامی واحد ندی میں جا کر گرتی ہیں، کرۂ ارضی کے مسلسل سمٹنے اور ایک چھوٹے سے گاؤں یا ایک بڑے ہوٹل میں تبدیل ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں یہ مسلکی تعصب اور مصیبت نہ تو رواج پا سکتی ہے، نہ ہی یہ کوئی قابل تعریف چیز ہو سکتی ہے۔

یہاں ہم دوسروں کے آراء کو اخذ کرنے اور انہیں ماننے سے متعلق چند ضروری چیزیں بیان کر رہے ہیں:

۱-بنی قریظہ سے جنگ کے وقت تم سب لوگ بنی قریظہ میں عصر پڑھے، کے مسئلے میں دو گروہ ہو گئے اور آپ ﷺ نے دونوں کے اجتہاد کو پسند فرمایا۔

۲-حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار ایک شخص نے ان سے کوئی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے حضرت علیؓ کے پاس بھیج دیا کہ جاؤ علیؓ سے اس کا حکم دریافت کر لو۔ وہ آدمی حضرت علیؓ کے پاس گیا اور ان سے دریافت کر کے حضرت عمرؓ کے پاس واپس آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ حضرت علیؓ نے کیا بتایا ہے؟ اس آدمی نے جب حضرت علیؓ کی رائے بیان کی تو عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں اس مسئلے کا جواب دیتا تو میرا جواب اس سے مختلف ہوتا، اس آدمی نے کہا: تو آپ نے کیوں نہیں بتایا اور امیر المومنین ہونے کے باوجود کون سی چیز مانع رہی؟ تو عمرؓ نے جواب دیا کہ اگر قرآن وسنت (میں اس کا حکم موجود ہوتا اور اس) کے مطابق جواب دینا ہوتا تو میں نے ضرور تمہیں جواب دیا ہوتا، لیکن (چونکہ قرآن وحدیث میں اس کا حکم موجود نہیں ہے، اس لئے) رائے سے اس کا جواب دینا پڑتا اور رائیں مشترک ہوتی ہیں۔

۳-بیان کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سے کسی غیر منصوص مسئلے کا فتوی پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی رائے سے اس کا جواب دیا، سائل نے پوچھا کہ کیا آپ کے علاوہ کسی دوسرے کا فتوی بھی صحیح ہو سکتا ہے یا صرف آپ ہی کا؟ امام ابوحنیفہؒ نے یہ آیت پڑھی 'ہم تو ظن کی بنیاد پر ایسا کہتے ہیں ہم کو اس کے بارے میں یقین اور پختہ علم نہیں ہے'، اس لئے امام ابوحنیفہ کے شاگردان رشید امام ابو یوسف، ابن ابی لیلی اور محمد بن حسن الشیبانی نے اپنے استاذ کے بہت سے مسئلوں میں اختلاف کیا ہے۔ ان کی سوچ اور عقل میں اختلاف پایا گیا، لیکن انہوں نے اس اختلاف سے اپنے دلوں کو پراگندہ نہیں کیا۔

۴-فقہی عرف میں اجتہاد کی رائج تعریف یہ ہے کہ اجتہاد فقیہ کے شریعت کے کسی ظنی حکم کو دریافت کرنے کی انتہائی کوشش کو کہا جاتا ہے اور ظن اجتہاد میں نظر ثانی کرنے یا کوئی دوسرا حکم اخذ کرنے کے کسی دوسرے کے حق کو سلب نہیں کرسکتا۔

موجودہ حقائق نے ثابت کردیا ہے کہ ہمارے اسلامی ممالک میں بغیر کسی مسلکی تعصب یا حساسیت کے دوسرے مسالک سے بہت سی چیزیں اخذ کی گئی ہیں، جن میں سے چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

الف- مصر، اردن، شام اور مغرب میں وصیہ واجبہ کی تعلیم شیعوں کی فقہ جعفری سے لی گئی ہے۔

ب- ائمہ اربعہ کے برخلاف ایک مجلس میں تین طلاق کے بارے میں علامہ ابن قیم وغیرہ کی رائے کو زیادہ تر اسلامی ممالک میں ترجیح دی گئی ہے۔

ج- بہت سے ممالک میں قتل خطا کو بھی وراثت سے محرومی کا سبب مانا گیا ہے جبکہ بہت سے لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ مانع ارث صرف قتل عدوانی اور دشمنی کی وجہ سے قتل ہے، ایسا اس لئے ہے کہ آج کل قتل عمد اور دشمنی کی وجہ سے ہونے والے قتل پر پردہ ڈالنے کے لئے لوگ فوراً قتل خطا کا بہانہ پیش کرنے لگتے ہیں۔

ا- تمام فقہی اکادمیوں میں آٹھ مسالک سے اخذ وقبول کی روایت چل پڑی ہے اور وہ مسالک ہیں (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ظاہری، زیدی، جعفری، اور اباضی) تو اس کے باوجود بھی کیا مغربی یا مشرقی ممالک میں رہنے والی مسلم اقلیتیں اس کشادگی اور رواداری سے طوطا چشمی برت سکتی ہیں، اور یہ کیا ان کے لئے صحیح ودرست ہوگا، جہاں بھی یہ اقلیتیں ہیں ان میں تمام فرقے اور مسالک کے ماننے والے ہیں؟، اسی لئے ضروری ہے کہ ہمارے اندر لچکیلا پن ہو اور جس فرقے کی دلیلیں زیادہ قوی ہوں یا حالات کے اعتبار سے زیادہ موزوں ومناسب ہوں اس میں ان کی وہ بات لی جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے

کہ مسلمان کسی بڑی مصلحت کی خاطر مرجوح مسلک کی مرجوح رائے کو اختیار کرسکتے ہیں۔ اس بنیاد پر یورپی افتاء کونسل کے اس فتوے کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان غیر مسلم کا وارث بن سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی معاذ بن جبل، معاویہ بن ابی سفیان، محمد بن حسن، سعید بن المسیب، مسروق، یحی بن معمر، اسحاق بن راہویہ، علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کی رایوں سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے اگرچہ ائمہ نے ان سے اختلاف کیا ہے اور وہ سارے اس کے برعکس فتوے پر متفق ہیں۔ اسی طرح مسلمان عورت کے اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ زوجیت میں رہنے کے جواز والے اس کی طرف سے شائع ہونے والے فتوی کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس میں اختلاف ہے، نیز اس میں شرعی اور دعوتی مصلحتیں بھی کارفرما ہیں، اگرچہ جمہور علماء کی رائے اس کے برخلاف ہے اور وہی رائج بھی ہے۔

نواں اصولی ضابطہ: فقہ التیسیر اختیار کرنا اور تدریج کا لحاظ کرنا:

آسانی اسلام کی خصوصیات میں سے ہے، حرج اور ضیق وتنگی ودشواری کو ہٹانا، نقصان دہ چیزوں کو دور کرنا اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، رحمت اس کی ایک عظیم نشانی ہے، ایسے معالم وآثار اور قواعد کا پایا جانا ضروری ہے جن کی روشنی میں اجتہاد کا عمل انجام پائے، خواہ اسے کوئی بھی نام دیا جائے، رعایت کہا جائے یا دین کی رسی میں ڈھیل سے تعبیر کیا جائے، اس لئے کہ یہی شریعت اسلامیہ کا اصل جوہر اور لب لباب ہے۔ نبی پاک ﷺ کے بارے میں صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو اگر دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا تو حتی الامکان ان میں سے آسان چیز کو اختیار کرتے جب تک کسی گناہ کا امکان نہ ہوتا، علاوہ ازیں ''محترق'' کے اس واقعہ میں آسانی کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت کی واضح دلیل موجود ہے جس نے رمضان میں دن کے اندر اپنی بیوی کے ساتھ ہمبستری کرلیا تھا، اسی طرح مسجد نبوی میں اعرابی کے پیشاب کرنے والے واقعہ سے بھی اسی آسان پسندی پر روشنی پڑتی

ہے، ان میں سے ہر ایک میں آپ ﷺ کی رحمت، آسانی، اور تنگی کو ختم کرنے کی صفت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ ﷺ کے موقف اور معاملات میں یہ خوبیاں شامل حال نظر آتی ہیں، اس کا آپ نے اپنی زندگی میں عملی مظاہرہ کر کے دکھایا، آسان پسندی اور رفع حرج آپ کا طریقہ کار تھا۔ اس شخص نے رمضان کے مہینے میں (دن میں) اپنی بیوی سے ہمبستری کی اور بطور کفارہ دو مہینے کے روزے رکھ پایا نہ ہی انفاق اور (ساٹھ مسکینوں کو) کھانا کھلانے کی طاقت تھی، تو آپ ﷺ نے (رحمت، آسان پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے) اس غلطی کے باوجود اسے ڈھیر ساری کھجوریں دیں (جو اس کے کفارے کے لئے تھا)، مگر اس نے کہا کہ مجھ سے غریب کوئی ہے ہی نہیں آپ ﷺ نے اس سے فرمایا اچھا اسے اپنے اہل وعیال کو کھلا دو، مگر دوبارہ ایسی حرکت مت کرنا۔

شاید اسی چیز نے علامہ شیخ قرضاوی کو فقہی تاریخ کے استقراء وتتبع پر آمادہ کیا۔ انہوں نے اس زاویہ کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آسان پسندی، رفع حرج اور تدریجی عمل کا سب سے زیادہ عنصر نبی پاک ﷺ کے فقہ میں، پھر صحابہ کرامؓ میں تھا، لیکن مرور ایام اور گردش زمانہ کے ساتھ جستہ جستہ اس میں کمی آتی گئی، یہاں تک کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آسانی کے سارے راستے مسدود ہوتے دکھائے دینے لگے، بہتر یہی ہے کہ ہم امت کے سلف کی اور اس کے صدر اول کی طرف رجوع کریں۔ علامہ شاطبی شارع کے شرعی تکالیف (ذمہ داریوں) کے حوالے سے مقاصد کے تحت مشقت میں تخفیف کے تئیں تحقیق میں ید طولی رکھتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں کہ شارع نے اغلال اور عقوبات میں مشقت اور شدت کو ملحوظ رکھا ہے، جبکہ دین میں غلو کی صورت میں مثلاً عبداللہ بن عمرو بن عاص کے روزے اور قیام، سعد بن ابی وقاص نے اپنے سارے مال کو راہ الٰہی میں صدقہ کر دینے میں آسانی کی راہ دکھلائی، اور مشقت کو مصلحتوں سے جوڑا ہے، چنانچہ نماز فجر کی ادائیگی میں محدود مشقت ہے، جہاد میں یہ مشقت غیر محدود اور بہت زیادہ ہے، اور حج میں ہونے والی

مشقت کے بین بین ہے، ان مشقتوں کے پیچھے شریعت نے مصلحتوں کا خیال رکھا ہے، اس لئے مشقت کے حساب سے تکلیف اور ذمہ داریاں ڈالی ہیں، لیکن اگر یہ مصلحتیں ناپید ہوں تو ایسی صورت میں آسانی کو اپنانا ہی بہتر ہے۔ جہاں تک تدریج کو ملحوظ رکھنے کی بات ہے تو نومسلموں یا اسلامی تعلیمات سے دور رہنے کے بعد تائب ہونے والے مسلمانوں کی نسبت سے اس کی خاصی اہمیت ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اگر ہم سے کسی چیز کے بارے میں اس کا حکم دریافت کیا جائے تو قطعی طور پر نص سے ثابت شدہ مسئلوں میں شریعت کی مخالفت کریں، بلکہ ایک مسلمان ڈاکٹر کو نشہ آور چیزوں کی حرمت اور ہلاکت خیزی کی معرفت اور اس کے لین دین کو ختم کرنے کے طریقۂ علاج میں تدریجی عمل کے مابین فرق کو پہچاننا چاہئے۔

دسواں اصولی ضابطہ: اقلیتوں کے احوال کے تناظر میں ممنوع چیزوں کے مشروع متبادل دریافت کرنے کیلئے اجتہاد:

فقیہ یا امام کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ شریعت کی طرف سے ممنوع چیزوں کے متبادل کی بسا اوقات ضرورت پیش آسکتی ہے، ممنوعات ومحرمات کے متبادل ڈھونڈھنے کی کوشش کرنی چاہئے، صرف ان کی حرمت یا کراہت بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، مسلم اقلیتوں کے احوال کے تناظر میں ان میں سے چند متبادل بطور مثال پیش کئے جارہے ہیں:

۱- اگر شوہر بیوی کو بہت زیادہ ستائے، اسے نقصان پہنچائے اور اس کی بیوی کسی مغربی ملک میں شریعت کے مطابق فیصلے کی طرف بلائے اور وہ اس کے لئے راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں فقیہ یا امام ملک کے غیر اسلامی کورٹ میں جانے کا فتوی دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲- اگر باپ غریب ہو اور کوئی اسے شرعی طور پر قرض دینے والا یا شرعی طریقے کے مطابق اسے اپنی تجارت میں شریک کرنے، یا اسے شریک بنانے پر بھی راضی نہ ہو، تو دریں صورت امام کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ سودی قرض پر اپنے گھر کو بیچنے کا فتوی دے دے، تاہم یہ شرط ہے کہ یہ اس وقت جائز ہے جب اس کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہ ہو اور خاندان کے بکھر جانے کا ڈر ہو۔

۳- اگر ہندوستان میں رہنے والے مسلم اداروں اور مسلمانوں کے گھروں کو (فرقہ وارانہ) ظلم وزیادتی سے نجات نہیں ملتی ہے (انہیں خطرات لاحق ہیں تو اس صورت میں ہندوستان کی فقہی مجالس اداروں اور گھروں کے انشورنس کے جواز کا فتوی دے سکتی ہیں، اگرچہ اس میں سود، قمار اور غرر کا شائبہ پایا جاتا ہے، تاکہ مسلمان زندگی کی سانسیں لیتے رہیں اور ٹوٹ کر بکھرنے نہ پائیں۔

یہ مثالیں بطور حصر نہیں بیان کی گئی ہیں اور متبادل کا مطلب سہولت و رخصت اور ضرورت کی آڑ میں حرمت کا ارتکاب کرنا بھی نہیں

اگر یہ مسلم اقلیتیں ایک ہی جگہ اقامت پذیر ہوں تو وہ حلال ذبیحہ کا انتظام کرسکتی ہیں، لیکن دوسری منتشر جگہوں میں (جہاں مسلمان کسی ایک جگہ آباد اکٹھے نہ ہوں تو) اس کا کوئی متبادل نہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمارے اس اجتہاد میں اگر ہم صواب وصحیح رائے تک پہنچے ہیں تو ہمیں اس کا اجر عطا فرمائے اور اگر غلطی ہوگئی ہو تو ہمیں مزید فہم وفقہ اور تدبر کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆

خاندان کی تشکیل کے اسلامی اصول

● مولانا بدرالحسن قاسمی، کویت
رکن رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرّمہ

خاندان ایک چھوٹی سی ریاست کا نام ہے جس میں وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک حکومت وسلطنت کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں، اس کی حقیقت ایک تربیت گاہ کی بھی ہے جہاں آدمی اچھے یا برے اخلاق سیکھتا ہے۔ اس کے دل میں رحم دلی، ہمدردی اور جود وسخا کے اوصاف پروان چڑھتے ہیں۔ قربت انسانوں کو اچھے برتاؤ کا خوگر بناتی ہے، اس میں مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ دوسرے کی خاطر ایثار وقربانی پر ابھارتی ہے۔

کسی معاشرہ کی اچھائی اور برائی کا بڑی حد تک انحصار مختلف خاندانوں کے اچھے یا برے اخلاق کا خوگر ہونے پر ہے جن سے پورا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اسلام نے خرد کی تربیت کے ساتھ خاندان یا اسرہ کے سدھار پر بھی زور دیا ہے اور ایک خاندان جن افراد سے مل کر بنتا ہے سبھوں پر کچھ ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں۔ اور کچھ فرائض بھی متعین کئے ہیں اور ان کے حقوق بھی متعین کئے ہیں۔

بنیادی طور پر ایک طرف تو خاندان یا گھر کے ان افراد کے درمیان جو ہمہ وقت یکجا رہتے ہیں اور جن میں باہم احترام وادب کا رشتہ قائم ہے جنسی تعلق کی راہ اسلام نے بند کردی ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ماں، بہن، بیٹی، پوتی، نواسی، پھوپھی، خالہ،

بہواور خوشدامن وغیرہ سے ازدواجی رشتہ کو ہمیشہ کے لئے حرام کردیا ہے، تاکہ رشتوں سے مربوط افراد کے درمیان ماحول پورے طور پر پاکیزہ رہے اور اس میں کسی طرح کے شیطانی وسوسہ کا احتمال بھی پیدا نہ ہو۔ ان قرابتداروں کے درمیان میں مقدس رشتہ قائم ہے کہ جو کسی طرح کی آلودگی کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے ہر ایک کے حقوق متعین کردئے ہیں۔ سب سے زیادہ ماں باپ کے حقوق پر زور دیا گیا ہے، قرآن کریم کی متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں خدا کے حق کے بعد ماں باپ کے حق کا ہی ذکر کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے:

"وقضیٰ ربک أن لا تعبدوا إلا إیاہ وبالوالدین إحسانا إما یبلغن عندک الکبر أحدھما أو کلاھما فلا تقل لھما أف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً"۔ (سورۃ اسراء 24-23)

اور تیرے رب نے یہ طے کیا ہے کہ تم صرف اس کی پرستش کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان سے اف تک نہ کہو نہ ان کو جھڑکو، اور ان کے ساتھ نرمی کی بات کیا کرو باز و کو جھکا کر اور عاجزی اختیار کرو اور ان کے ساتھ محبت کی وجہ سے کہو کہ اے رب تو ان پر اسی طرح رحم فرما، جس طرح کے ان دونوں نے بچپن میں ہماری پرورش کیا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ماں باپ کے حقوق کی پاسداری اسلام میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف اسلام نے یہ بھی سکھایا ہے کہ اولاد پر ظلم نہ کرو، انہیں فقر وفاقہ کے خوف سے قتل مت کرو بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ کیا ماں باپ بھی اپنے بچوں کو قتل کرسکتے ہیں، لیکن قدیم جاہلیت میں تو بچیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا ہی آج ترقی یافتہ دور میں بھی اسقاط حمل سے لے کر قتل اولاد کی اور نہ جانیں کتنی شکلیں پائی جاتی ہیں، اسی لئے اسلام نے سختی سے روکا ہے اور قرآن میں کہا گیا ہے کہ:

"قد خسر الذین قتلوا أولادھم سفھا بغیر علم". (الانعام:140)

(یقیناً وہ لوگ انتہائی خسارہ کا شکار ہوئے جنہوں نے اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل کرڈالا)۔

"ولا تقتلوا أولادکم خشیۃ إملاق نحن نرزقھم وإیاکم" (الاسراء:31)

(تم اپنی اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل مت کرو، ہم انہیں بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی)۔

عورتوں کے ساتھ اسلام سے قبل کسی بھی قوم کا برتاؤ اچھا نہیں تھا، خاص کر جزیرہ عرب کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ اس آیت سے کیا جاتا ہے:

"وإذا بشر أحدھم بالانثیٰ ظل وجھہ مسودا وھو کظیم، یتواریٰ من القوم ما بشر بہ أیمسکہ علی ھون ام یدستہ فی التراب الا ساء مایحکمون". (النحل:59-58)

(اور جب ان میں سے کوئی کسی کو بچی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پہ کلونس چھاجاتی ہے اور غصہ سے گھٹ کر رہ جاتا ہے، وہ اپنی قوم سے اس خبر کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اس شش وپنج میں پڑجاتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھے رہے یا مٹی میں دبادے، یاد رکھو کہ یہ نہایت ہی برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں)۔

قرآن نے زندہ درگور کئے جانے والی بچیوں کے بارے میں کتنا دل دہلا دینے والا اور رونگٹے کھڑا کردینے والا یہ سوال کیا ہے۔

"وإذا الموؤدۃ سئلت بأی ذنب قتلت". (التکویر: 9-8)

(اور جب یہ زندہ درگور کی جانی والی بچیوں سے پوچھا جائے گا کہ آخر اسے کس جرم میں قتل کیا گیا ہے؟) کیا ظالموں کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب ہوسکتا ہے؟۔

ایک تو یہ ماحول تھا اسلام نے اس کے بعد کیسا انقلاب پیدا کیا اس کا اندازہ اس ارشاد

ربانی سے کیا جاسکتا ہے:

" ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة".

(البقرہ:228)

(اوران کا اسی طرح کے حقوق ہیں جس طرح کہ ان کے اوپر حقوق ہیں اور جن میں خوس اسلوبی مطلوب ہے، اور مردوں کو ان پر ایک گونہ برتری حاصل ہے)۔

مردوں کے ذمہ عورتوں کی دیکھ بھال اس کا نان ونفقہ، اس کی حفاظت کا فریضہ بتایا گیا اور مردوں کو گھر کا نظام چلانے کے لئے ان کی طاقت وقت اور فطری خصوصتیوں کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا گیا جو خاندان کے داخلی نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ضروری بات تھی اس کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔

"الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما انفقوا من أموالهم". (النساء:34)

(مردوں کو عورتوں کا نگراں ومحافظ بنایا گیا ہے اور اس کی وجہ وہ خصوصیتیں ہیں جو خدا نے بعض کو بعض پر دے رکھی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں)۔

یہ ایک انتظامی معاملہ ہے۔ ورنہ اصل انسانیت میں مرد وعورت دونوں کی حیثیت برابر ہے، خدا سے قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے میں ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ بچیوں کی حضانت وتربیت میں عورت کا حق مرد سے بڑھا ہوا ہے۔

غرض یہ کہ اسلام نے انسانی فطرت، مرد وعورت کی علیحدہ علیحدہ خلقی اور جسمانی اور مزاجی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک کی حیثیت متعین کی ہے اور ہر ایک کو خدان کی تشکیل اور نسل انسانی میں اضافہ اور اس کی پرداخت وپرورش کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی غیر فطری آزادی اور مسائل کا نعرہ بہت بلند کیا جاتا ہے، لیکن عملاً جو کچھ عورتوں کو اب تک مل سکا ہے۔ وہ اس کی عریانی اور ذلت کے علاوہ اور کچھ

نہیں ہے، نعرہ بلند کرنے والے عورتوں کے واقعی مفادات کے حصول سے زیادہ اس لئے کوشاں رہے ہیں کہ ان کے لئے عورتوں تک پہنچنے کی راہ زیادہ آسان ہوجائے۔ خواہ اس میں خود عورت کی عصمت وعفت کا جوہر ہی کیوں پامال نہ ہوجائے۔

کارخانوں اور آفسوں میں کام کا موقع فراہم کرنے کو عورتوں پر بڑا احسان تصور کیا جاتا ہے، جبکہ اس کی جو گھریلو ذمہ داریاں ہیں اس کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جس کے نتیجہ میں عورتیں دوہری مصیب کا شکا ہوکر رہ گئی ہیں۔ اور ان کا سکون غارت ہوکر رہ گیا ہے جو ان کی فطرت کا اصل تقاضا تھا اور ان کی گود میں پلنے والے بچوں کا جو حشر ہوا وہ بھی کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔

اسلام نے ایک سکھ اور چین کا گھرانہ فراہم کرنے کے لئے ان امکانی مشکلات کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کے اشتراک سے پڑتی ہے، جو شرعی ضابطہ کے تحت نکاح کے مقدس رشتے سے مربوط ہوکر اس بات کا پیمان باندھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے باعث سکون ہوں گے اور نسل انسانی کی افزائش اور اچھی اور شائستہ نسل تیار کرنا ان کا مشن ہوگا قرآن نے شادی کے مقصد پر روشنی ان الفاظ میں ڈالی ہے:

"ومن اٰياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة"۔(الروم:21)

(اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے خود تم میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرسکو اور تمہارے درمیان محبت ورحمت کا رشتہ قائم ہو)۔

نکاح کے رشتہ سے جڑ جانے کے بعد ہونا تو یہی چاہئے کہ مرد وعورت کے درمیان تعلق مثالی ہو اور ایک دوسرے کی غلطیوں سے فروگزاشت کا ذہن دونوں میں پایا جاتا ہو، لیکن ہر شخص کی طبیعت نہ یکساں ہوتی ہے اور نہ ہر کسی کے بارے میں عقل ودانشمندی کی

امید کی جاسکتی ہے۔اس لئے مختلف اسباب سے کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے کہ مرد وعورت کے درمیان باہم زندگی کا سفر دشوار ہوجائے۔اب دو ہی صورتیں ہیں کہ باہمی ہم آہنگی نہ پائے جانے کے باوجود عورت کو اس رشتہ سے جڑا رہنے پر مجبور کیا جائے، جو سراسر اس کے لئے ظلم کے مترادف ہے یا اس کے لئے گلو خلاصی کی راہ کھولی رکھی جائے۔ اسلام نے اس کا حل طلاق کو جائز کرکے نکالا ہے۔لیکن ساتھ اس کی تاکید کی ہے کہ یہ انتہائی بری اور نامناسب چیز ہے۔اور انتہائی ناگزیر حالت کے علاوہ اس کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے۔

جن مذاہب اور قوانین نے کسی حال میں طلاق کی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی اب مجبور ہوکر انہوں نے بھی اسی راہ کو اپنانے کی کوشش شروع کردی ہے جو اسلام نے بتائی تھی، اس سلسلہ میں چرچ نے مجبور ہوکر پچھلے دنوں جو فیصلہ کیا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کس قدر فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہے اور جس کا کوئی بدل ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا مسئلہ ایک سے زائد شادی کا ہے، اسلام نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آدمی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، ورنہ پھر اس کو ایک ہی شادی کرنی چاہئے۔اب واقعی انسانی زندگی کے مسائل کا جائزہ لیجئے تو مختلف صورتیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ جن میں اسلام کا بتایا ہوا راستہ ہی صحیح اور مبنی بر عدل وانصاف معلوم ہوتا ہے۔شادی کے بعد کسی کی عورت اگر کسی دائمی مرض کا شکار ہوجائے تو اس عورت کے حق میں بھی ہمدردی کی بات یہی رہ جاتی ہے کہ اس کا رشتہ ازدواج اس تکلیف اور مصیبت کے وقت میں منقطع نہ کیا جائے اور مرد کو دوسری شادی کی اجازت دیدی جائے۔

اسی طرح بچہ کی فطری خواہش بھی کبھی انسان کو ایک سے زائد شادی کرنے پر مجبور کرسکتی ہے، جنگوں اور دوسری مشکلات کے بعد بھی ایک سے زائد شادی کے بغیر بعض

حالات میں کوئی چارہ کار نہیں رہتا، اور ان سب سے بڑھ کر بعض مردوں کی ایک پر عدم قناعت کا ذہن بھی یہ چاہتا ہے کہ ایک سے زائد شادی کی راہ کو کھلی رکھی جائے، کیونکہ اس پہ غیر فطری طور پر قدغن لگانے کا نتیجہ وہ سامنے آئے گا جو آج یوروپ وایشیا کے متعدد ملکوں میں بے راہ روی اور بدچلنی کی شکل میں نظروں کے سامنے ہے، کسی عورت کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور اس کی غیرت کے لئے چیلنج نہیں ہوسکتی جتنی مرد کے کسی ناجائز رشتہ کا معاملہ ہے۔

اسلام چونکہ اوہام پر مبنی مذہب نہیں ہے، بلکہ خالق کائنات کا نازل کردہ دستور حیات ہے، اس لئے اس کے قوانین فطرت کے عین مطابق ہیں اور انہیں ان میں انسانیت کے مسائل اور انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا صحیح حل ہے۔اور اسلامی تعلیمات کو برت کر ہی گھر اور خاندان کے سکھ اور چین کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔اور ان مشکلات سے بھی نکلا جاسکتا ہے جو زندگی میں پیش آیا کرتی ہیں۔

☆☆

اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ

● شاعر اسلام ڈاکٹر علامہ اقبالؒ

ایشیائی مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ باوجود ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ ہونے کے ایشیا کے تمام ممالک، یعنی ہندوستان، ایران، افغانستان، شام، حجاز اور چین کے سامنے اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے اس کے حل کرنے میں محققین نے جو طریق کار اختیار کیا اور اس کا جو حل تجویز کیا ہے، اس کے اصولوں میں ایک نمایاں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ خیالات کا یہ اتحاد ایشیا کے مستقبل کے لئے ایک نیک شگون ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ایشیاء کو پھر عروج حاصل ہوگا۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت مختلف قوموں کے اتحاد کی ہے اور میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ایک دوسرے کے مسائل پر دونوں پہلوؤں سے غور کر کے ایک مصالحانہ نتیجہ پر پہنچنا چاہئے۔

''مجھے یقین کامل ہے کہ پرانی دنیا جس کا پیرو یورپ بنا ہوا ہے خاتمہ پر پہنچ رہی ہے۔ اب نئی دنیا معرض ظہور میں آنے والی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ ہندوستان ہی ہے جو مادہ پرستوں کی مغربی دنیا کو عظیم القدر پیغام پہنچانے کے قابل ہوگا۔''

7 رجنوری 1929 کو ''انجمن خواتین اسلام'' مدارس نے علامہ سر محمد اقبال کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں حضرت علامہ نے درج ذیل تقریر فرمائی:

''میں آپ کے ایڈریس کا کس زبان میں شکریہ ادا کروں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ

اگر میری تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے کہ تو رب کعبہ کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ میرا عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں آپ کے ایڈریس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پرواہی ہوئی، مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا، لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو یا بہنوں کی محبت اس کے دل پر اپنا نشانہ نہ چھوڑتی ہو، وہ خوش نصیب شوہر، جن کو نیک بیویاں ملی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقاء میں کس حد تک اس کی ممد و معاون ہے۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے۔ وہ مشہور ہے: ''**الرجال قوامون علی النساء**''۔ (النساء: پ۵، ر۲) عربی محاورے کی رو سے اس کی یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ عربی گرامر کی رو سے قائم کا صلہ جب علی پر آئے تو معنی محافظت کے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے فرمایا: ''**ھن لباس لکم و أنتم لباس لھن**''. (البقرہ) لباس بھی محافظت کے لئے ہوتا ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہے۔ دیگر کئی لحاظ سے بھی مرد عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں۔

''قرون اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ پردہ میں بیٹھ کر لوگوں کو درس دیتی رہیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہئے۔ خلافت اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب میں ہر شخص کو

رائے دینے کا حق حاصل تھا، نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔اسلام تمام معاملات میں اعتدال کو مدنظر رکھتا ہے۔'' **أمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس** '' اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام افراط وتفریط سے پرہیز کیا جائے۔

تمام مسائل کے حل کرنے میں علماء نے اعتدال کے طریق کو بطور اصل الاصول رکھا۔ انسانوں کی زندگی مدنی ہے، یعنی مل کر زندگی بسر کرتے ہیں، اس لئے انسانوں کی مختلف جماعتوں سے مختلف فرائض متعلق ہیں۔ایک سلسلہ فرائض انسانی زندگی میں مردوں کا ہے، اور ایک عورتوں کا، یہ فرائض بعض تو خدائی احکام کی رو سے ہیں اور بعض خود وضع کردہ ہیں۔ بعض فطری طور پر ہیں۔عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد، بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ان فرائض میں اختلاف ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔فرائض کا اختلاف دیگر وجوہ پر مبنی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد وزن میں کوئی فرق نہیں۔تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔مدنی زندگی کے لئے جو احکام ہوں گے وہ فرائض کو مدنظر رکھ کر ہوں گے۔

اگر آپ ان حقوق پر نظر ڈالیں جو اسلام نے عورتوں کو دئے ہیں تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ اس مذہب نے عورت کو کسی طرح مرد سے ادنیٰ درجہ پر نہیں رکھا۔سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ ماں بچوں کی وراثت کا حق رکھتی ہے۔سب سے اول اسلام ہی نے اس امر کا اعلان کیا کہ عورت اپنی علیحدہ جائیداد کا حق رکھتی ہے، یوروپ کے کئی ملکوں میں اب تک آپ کی بہنوں کو علیحدہ جائداد رکھنے کا حق حاصل نہیں۔غالباً 1888 میں کوئی انگریز اپنی مرحوم بیوی کی بہن سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔اسلام نے اس قسم کی شادی کی اجازت شروع سے ہے، تعجب کی بات ہے کہ اولاد کی ولایت کا حق انگریز ماں کو اس وقت تک بھی نہیں، اسلام میں یہ حق ہمیشہ سے موجود ہے، ان تمام امور میں یوروپین قومیں یا اسلام کا تتبع کررہی

ہیں یا خود فطرت نے اب انہیں اس طرف توجہ دلائی ہے، مجھے یقین ہے کہ یوروپ نے بھی وضع قانون کے معاملے میں اسلام سے بہت کچھ سیکھا ہے، یوروپ میں طلاق کا حاصل کرلینا مشکل تھا، مسلمانوں میں یہ شکایت کبھی خاص طور پر پیدا نہیں ہوئی۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو (مرد کی طرح) طلاق دینے کا حق نہیں، حال ہی میں ترکی میں یہی اعتراض کیا گیا، لیکن ہم تو محکوم ہیں، اپنی مرضی کے مطابق اپنی تعلیم کو نہیں چلا سکتے۔تعجب ہے کہ ترکی میں بھی اس اعتراض کا جواب نہ دیا گیا۔اسلام نے اس مسئلے کو عجیب طرح بیان کیا ہے۔جو حل اسلام نے اس مسئلہ کا تجویز کیا ہے وہ نہایت عمیق تجربے پر مبنی ہے، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے علماء نے کبھی اس بات کی توضیح ہی نہیں کی کہ نکاح کے وقت عورت کہہ سکتی ہے کہ جو حق اسلام نے طلاق کا تم کو (مرد کو) دیا ہے، وہی اس وقت مجھے (عورت کو) دے دو تو پھر نکاح ہوگا یا یہ حق میرے کسی قریبی تعلق والے کو دے دیا جائے۔پنجاب میں آج سے دس سال پہلے کسی کو معلوم نہ تھا کہ عورت کو نکاح کے وقت یہ حق بھی حاصل ہے اور نہ جہالت کی وجہ سے آج تک کسی نے دریافت ہی کیا۔جب انگلستان میں طلاق کی آسانی ہوئی تو بیشتر عورتیں ہی تھیں جنہوں نے عدالتوں میں طلاق کی درخواستیں دینا شروع کردیں، حالانکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ مرد عورت کو بہت جلد طلاق دے دیتا ہے۔

آپ نے اپنے لئے ایڈریس میں اسیران قفس کے الفاظ کے استعمال کئے ہیں، ان سے مجھے مغربی عورتوں کی اس تحریک کا خیال ہوا جسے ترکی میں یا اور جگہ یوروپ میں ایمنسی پیشن (Emancipation) (مردوں کے غلبہ سے آزادی) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اپنی اصل میں قیود میں ہیں یا نہیں۔اگر مصطفیٰ کمال کے خیال کے مطابق یہ قیود اٹھا بھی دی گئیں تو آخر نتیجہ کیا دیکھنے میں آرہا ہے۔ابھی چند دن ہوئے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت ترکیہ کو معلوم ہوا

ہے کہ عورتوں میں خودکشی کے واقعات بہت بڑھ رہے ہیں، عورت خود زندگی کا سرچشمہ ہے، اگر عورت ہی زندگی سے بیزار ہوجائے تو پھر زندگی کے آگے بڑھنے کے کیا امکان باقی رہ گئے، اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ترکی نے کمیشن بٹھایا، پھر اپنے علماء کو جو اس قدر مورد عتاب تھے، بلا کر کہا کہ اپنے وعظوں کے ذریعہ عورتوں کو سمجھائیں کہ اسلام میں خودکشی گناہ ہے، یہ نتیجہ ہوا ایمنسی پیشن کا ترکی میں!

میں حیران ہوتا ہوں کہ جب عورتوں نے تمام ان باتوں سے، جن کو وہ قیود کہتی تھیں، آزادی حاصل کرلی تو پھر خودکشی پر کیوں آمادہ ہوئیں۔ انگلستان میں بیشتر عورتوں کا طلاق کے لئے عدالتوں میں جانا اور ترکی میں خودکشی کی وارداتوں کا ہونا ایسے دواہم واقعات ہیں کہ ہمیں ان کی علتوں پر گہری نظر سے غور کرنا ہوگا۔ یہ مشکل مسئلہ ہے اور بغیر انسانی فطرت کے گہرے اور صحیح مطالعہ کے اس کے عمل پر پہنچنے کی امید کرنا مشکل ہے۔

انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے انبیاء کے طبقے سے بڑھ کر اور کوئی طبقہ مفید نہیں ہوسکتا۔ اس وقت بھی دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ انبیاء کے زیر ہدایت زندگی بسر کررہا ہے، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ جو قوانین انبیاء نے وضع کئے ہیں وہ کن حکمتوں پر مبنی ہیں۔ قرآن پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں فرماتا ہے: "**یعلمهم الکتاب والحکمة**" (سورہ جمعہ)۔ "**یعلمکم مالم تکونوا تعلمون**" (البقرہ)

آپ کو غور کرنا ہو چاہئے کہ حکمت کے کیا معنی ہیں، احکام انبیاء کے اندر کیا حکمتیں مضمر ہیں، انبیاء نے زندگی کے جس قدر احکام ہمیں دئے ہیں وہ مختلف حالات کو مدنظر رکھ کر وضع کئے گئے ہیں۔

پردہ کے متعلق اسلام کے احکام صاف اور واضح ہیں 'غض بصر' کا حکم ہے اور وہ اس لئے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے، خاص اس وقت کے لئے یہ حکم ہے، دیگر حالات کے لئے اور احکام ہیں، پردے کے سلسلے

میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔

ان تمام امور میں شریعت اسلامی نے ایک عام اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ "**الدین یسر**" پھر اسلام میں تعدد ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا محض اجازت ہے۔ زندگی میں ایسے حالات یقیناً پیدا ہوتے ہیں جب تعدد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ مسلمان مردوں نے اس اجازت سے بے جا فائدہ اٹھایا۔ اس میں اصول وقوانین کا کیا قصور؟ جس سوسائٹی میں اس قسم کی اجازت نہ ہو، اس کو ضرورت کے وقت جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اس سے آپ ناآشنا نہیں، جرمنی میں ایک موقع پر یہ ضرورت پیش آگئی تھی، آخر عہد نامہ ویسٹ فیلیا (Westphalia) میں بیس سال کے واسطے ہر مرد کے لئے تعدد ازدواج جائز قرار دیا گیا۔

جب جنگ میں کسی قوم کے مردوں کی تعداد میں خاصی کمی واقع ہوجائے تو آئندہ ملکی حفاظت کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ ایک مرد ایک سے زائد بیویاں کرے، قرآن پاک نے انہیں مصالح کو ملحوظ رکھ کر اس قسم کی اجازت دی ہے، مردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ حالات کو دیکھیں۔ قرآن یا شرعی اجازت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں، اس لئے فقہ میں 'فرض' اور 'رخصت' میں فرق کیا گیا ہے۔ 'رخصت' ترک کی جاسکتی ہے 'فرض' ہرگز نہیں۔ اگر نکاح کے وقت عورت مرد سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس رخصت کو اپنے حق میں ترک قرار دو، جو تعدد ازدواج کے بارے میں از روئے قرآن تمہیں حاصل ہے، تو وہ اس مطالبہ کا حق رکھتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک الزام میں لڑکیوں کے باپوں کو بھی دوں گا کہ وہ نکاح کے وقت عورتوں کے حقوق پر نگاہ نہیں رکھتے۔ مگر ایک الزام خود عورتوں کو بھی دئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ یہ کہ کیوں بوقت ضرورت عورتیں مردوں سے قانونی ذریعہ سے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتیں؟ کیوں بھائیوں سے جائداد کا حصہ طلب نہیں کرتیں؟۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کی عدالتیں قائم نہیں، تاکہ یہ معاملے شریعت اسلامی کے ذریعہ طے ہوں۔ میں نے تو اب کے سرجان سائمن سے بھی کہا کہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں خانگی تنازعات کے تصفیہ کے لئے اسلامی عدالتیں قائم ہونی چاہئیں۔ گذشتہ پانچ یا چھ سو سال سے شریعت اسلامیہ جامع رہی ہے۔ انگریزی قانون والے شریعت اسلامی کو نہیں سمجھ سکتے۔ چند فقہ کی کتابیں مشہور ہیں جو آج سے پانچ سو سال قبل لکھی گئی تھیں، اس وقت جو فتوے دیے گئے وہ ان حالات کے مطابق تھے۔ آج حالات اور ہیں اور اب ان حالات کو ملحوظ رکھ کر شرعی مسائل پر غور کرنا چاہئے۔

جیسا کہ آپ نے اپنے ایڈریس میں کہا، ایک حد تک ضرور مردوں کا قصور ہے۔ مگر ایک دوسری حد تک آپ کا بھی ہے، کیوں نکاح کے وقت آپ کے والدین نے لائق اور حقیقت فہم علماء سے آپ کے حقوق کے متعلق مشورہ نہیں کیا؟ جن بہنوں کی شادی ابھی نہیں ہوئی، وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے والدین سے اصرار کریں، اگر عورتیں اپنے حقوق کی حفاظت پر پورے طور سے آمادہ ہو جائیں اور وہ حق جو شریعت اسلامی نے اسلامی عورتوں کو دے رکھے ہیں، آپ مردوں سے لے کر رہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ مردوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی، عورتیں دودھ پلانے کی اجرت طلب کر سکتی ہیں، کھانا پکانے کی اجرت بذریعہ عدالت حاصل کر سکتی ہیں۔ مردوں کو آپ الزام دیتی ہیں، مگر آپ خود الزام سے بری نہیں ہیں۔ آپ کو اپنے حقوق پر شدت کے ساتھ اصرار کرنا چاہئے۔ جہاں تک شریعت اسلامی کا تعلق ہے، مسلمان عورتیں یہ شکایت نہیں کر سکتیں کہ انہیں شریعت نے حقوق نہیں دیئے یا وہ حقوق ایسے ہیں جن سے انہیں مردوں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل نہیں۔ وہ حق، جس کا عورت انصاف و عقل کے ساتھ کبھی مطالبہ کر سکتی ہے، وہ قرآن پاک نے دے دیا ہے۔ اگر آپ اس سے جاہل و غافل رہیں یا اس سے فائدہ اٹھائیں یا اس کے حاصل کرنے پر اصرار نہ کریں، بوقت ضرورت قانونی چارہ جوئی نہ کریں تو یہ قرآن

یا شریعت اسلام کا قصور نہیں۔

ترکوں نے، جیسا کہ سننے میں آ رہا ہے، بظاہر ایسے قانون بنائے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں، مگر ترک ایک فوجی قوم ہے۔ مسائل میں موشگافی نہیں کر سکتی۔ وہ قوم کے سپاہی ہیں اور صحیح اجتہاد کرنے والے فقیہ نہیں پیدا کر سکے، جو انہیں صحیح راستہ دکھائیں، اس لئے انہوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں، اپنی غلطیوں کو ترک خود آئندہ دس سال میں محسوس کریں گے۔ میں آپ سے پرزور استدعا کرتا ہوں کہ آپ ہرگز ترکی عورتوں کو تقلید کے لئے نمونہ نہ بنائیں، نہ مصطفیٰ کمال کی نام نہاد اصلاحات پر جائیں۔ ملک کو فوجی قوت و تنظیم کے بل پر بچانا اور بات ہے، مگر آئندہ زندگی کیلئے قانون وضع کرنا بالکل علیحدہ بات ہے۔ پہلی بات کے لئے محض قوت کی ضرورت ہے، دوسری کے لئے خاص قابلیتوں کی ضرورت ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے جو کچھ اصلاحات کے سلسلے میں کیا ہے، وہ ہرگز حکمت پر مبنی نہیں۔ عورت کو آزادی خود شریعت اسلامی نے دے رکھی ہے، مصطفیٰ کمال کیا دیں گے؟ ہاں! 'مادر پدر آزادی' کی شریعت نے کبھی اجازت نہیں دی، نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔ بے جا آزادی سے ترکی میں یوروپین قسم کا ناچ شروع ہوا۔ اسی مصطفیٰ کو وہ ناچ حکماً بند کرنا پڑا۔

لالہ راجپت رائے آنجہانی نے اپنی کتاب میں ترکوں کا ایک سرکار نقل کیا ہے، جس میں وہ باتیں درج ہیں جن سے ترکی عورتوں کو باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان ہدایتوں میں یہ بھی ہے کہ جوان عورتوں کو رات کے نو بجے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ اگر نکلیں تو ان کے باپ بھائی کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ ہو۔ اسی طرح تھیٹر کے متعلق بھی ایسی ہدایت ہے۔ یوروپ کے اور ملکوں کو بھی اس قسم کی ہدایت جاری کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ جو فطری پردہ غیر محرم مرد اور عورت میں ہونا چاہئے، وہ ان قوموں میں موجود نہیں رہا اور آخر ان سرکاروں کے ذریعہ سے اختیار کرنا پڑا۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ فقہ کی طرف متوجہ ہوں، جو حقوق ملت اسلامیہ نے عورتوں کو دیئے ہیں، وہ ان کے حصول پر اصرار کریں۔ شوہر، باپ، بھائی کون سیاہ دل مرد ہوگا جو آپ کو آپ کے حقوق دینے سے انکار کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کر دینی چاہئے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ زندگی میں عورت کے کون کون سے حقوق ہوں گے اس وقت تک نکاح نہ پڑھا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہئے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقلمندانہ راستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یوروپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔

مسلمان عورتوں کے لئے بہترین اسوہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ کامل عورت بننا ہو تو آپ کو فاطمۃ الزہراؓ کی زندگی پر غور کرنا چاہئے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرنی چاہئے۔ عورت کو اپنی انتہائی عظمت تک پہنچنے کے لئے فاطمۃ الزہراؓ کا نمونہ بہترین نمونہ ہے۔ میں ان خیالات کا اظہار 'اسرار خودی' میں کر چکا ہوں۔ حضرت زہراؓ کی عظمت بیان کرنے کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حسینؓ کی ماں تھیں ؎

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوہ زہرا بلند
تا حسینے شاخ تو بار آورد

غرض یہ کہ آپ کو لفظی آزادی پر نہیں جانا چاہئے، آزادی کے صحیح مفہوم پر غور کرنا چاہئے۔ یوروپ کی آزادی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ یوروپین تہذیب باہر سے دیکھی جا رہی ہے کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہوں۔ بڑھتے ہوئے معیار زندگی کا وہاں کے لوگوں پر یہ اثر پڑا ہے کہ بعض ماں باپ یوروپ میں بچے کی زندگی کا بیمہ (Insurence) کرا دیتے ہیں۔ پھر بچے کو تھوڑی خوراک دے کر ہلاک کر دیا جاتا

ہے۔ بچوں کو اس قسم ہلاکت سے بچانے کے لئے یوروپ میں کئی سوسائٹیاں مقرر ہیں۔ پنجاب میں تو اچھی اچھی عدالتوں میں کہہ دیتے ہیں کہ ہم رواج کے پابند ہیں، شریعت کے پابند نہیں۔ محض اس لئے کہ بیٹیوں کو جائیداد سے حصہ نہ دینا پڑے۔ ہم کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہم رواج کی قیود سے آزادی حاصل کریں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجھے قانون پیشہ ہونے کی وجہ سے کئی بار عدالتوں میں لڑکیوں کے حقوق کے لئے لڑنا پڑا ہے، اور کئی دفعہ یہ خدمت میں نے بغیر کسی فیس کے انجام دی ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایڈریس دیا اور میں امید کرتا ہوں کہ جن خیالات کا اظہار میں نے آپ کے سامنے کیا ہے ان پر پورے طور سے غور کریں گی اور اسلام کی اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش فرمائیں گی۔

☆☆

باب چهارم

عدالتی دائرے اور اسلامی اصول

طلاق کے مسائل اور عدالتوں کے فیصلے

● محمد عبدالرحیم قریشی

سابق سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

طلاق کے مسئلہ پر ملک کی عدالتیں جس انداز میں فیصلہ دے رہی ہیں اسکی وجہ سپریم کورٹ کے فیصلے اور سپریم کورٹ کی جانب سے اسلامی قانون کی تعبیر ہے۔اس میں کیا قانونی چارہ کار اختیار کیا جائے کہ جسکے نتیجہ میں سپریم کورٹ کے ان فیصلوں کا اثر ختم ہو اس بارے میں بورڈ کی لیگل سیل کے کنوینر اور دیگر ماہرین قانون بہتر رائے دے سکتے ہیں۔مگر اس سے پہلے علمائے کرام کو بعض نکات کو واضح کرنا اور اپنے موقف کی معقولیت کی نشاندہی کرنا ضروری ہوگا۔اس نقطہ نظر سے یہ نوٹ میں آپ کے توسط سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ میں پیش کررہا ہوں۔

کیا طلاق سے پہلے تحکیم کا مرحلہ ضروری ہے اور تحکیم کے مرحلے سے گذرے بغیر طلاق دی جائے تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس پر جس فیصلہ کے نتیجہ میں انتہائی پیچیدہ اور تشویشناک صورتحال یہ سامنے آتی ہے کہ عورت جو طلاق کے بعد بیوی کی حیثیت کھوچکی ہے قانونی اعتبار سے وہ طلاق دینے والے شخص کی بیوی ہے۔ یہ فیصلہ جسٹس بحرالاسلام کا ہے جو انہوں نے ۱۹۷۸ء میں دیا تھا اور جو ۱۹۸۱ء کے گوہاٹی لا رپورٹس میں شائع ہوا۔

(1981 1 Gauhati Law Reports 358) جسٹس بحرالاسلام اس

وقت آسام ہائی کورٹ گوہاٹی کے جج تھے بعد میں یہ سپریم کورٹ کے جج بھی بنے۔انہوں نے اپنے اس فیصلے میں لکھا ہے کہ'' طلاق کے مسئلہ پر قرآن مجید کی متعلقہ آیات کا حوالہ ضروری ہے کہ قرآن مجید اسلامی قانون کا بنیادی سرچشمہ ہے اور یہ آیتیں شوہر اور بیوی کے درمیان تعلق کی نوعیت اور شوہر کی جانب سے بیوی کو طلاق دینے سے متعلق ہیں۔''اس کے بعد اس فیصلے میں قرآن کی مختلف آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے جو اے۔یوسف علی صاحب کے ترجمۃ القرآن سے لیا گیا ہے۔ذیل میں ان آیات کا اُردو ترجمہ جو مولانا فتح محمد جالندھری نے کیا ہے وہ درج کیا جارہا ہے۔(سورۃ النساء:۱۲۸تا۱۳۰)

۱۲۸۔اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کرلیں۔اور صلح خوب چیز ہے۔اور طبعیتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔اور اگر تم نیکوکاری اور پرہیزگاری کروگے تو خدا تمہارے کاموں سے واقف ہے۔

۱۲۹۔اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکوگے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو ایسی حالت میں چھوڑ دو کہ گویا ادھر میں لٹک رہی ہو۔اور اگر آپس میں موافقت کرلو اور پرہیزگاری کرو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۳۰۔اور اگر میاں بیوی میں موافقت نہ ہوسکے اور ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں تو خدا ہر ایک کو اپنی دولت سے غنی کردے گا۔اور خدا بڑی کشائش والا اور حکمت والا ہے۔
(سورۃ البقرۃ:۲۲۹تا۲۳۲)

۲۲۹۔طلاق صرف دوبار ہے(یعنی جب دو دفعہ طلاق دے دی جائے تو) پھر عورتوں کو یا تو بہ طریقہ شائستہ نکاح میں رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے واپس لے لو۔(یہاں عبداللہ یوسف علی صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم نے جو بھی تحفے دیئے

ہوں ان میں سے کچھ واپس لو) ہاں اگر زن اور شوہر کو خوف ہو کہ وہ خدا کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے ڈالے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں' ان سے باہر نہ نکلو اور جو لوگ خدا کی حدوں سے باہر نکل جائیں گے وہ گناہ گار ہوں گے۔

۲۳۰۔پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دیدے تو اسکے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔ہا ں اگر دوسرا خاوند بھی طلاق دیدے اور عورت اور پہلا خاوند ایک دوسرے کی طرف رجوع کرلیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ دونوں یقین کریں کہ خدا کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ اور یہ خدا کی حدیں ہیں ان کو وہ لوگوں کیلئے بیان فرماتا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔

۲۳۱۔اور جب تم عورتوں کو دو دفعہ طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہوجائے تو انھیں یا تو حسن سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا بہ طریق شائستہ رخصت کردو اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہئے کہ انھیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔خدا کے احکام کو ہنسی اور کھیل نہ بنالو اور خدا نے تم کو جو نعمتیں بخشی ہیں اور جو تم پر کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تم سے نصیحت فرماتا ہے ان کو یاد رکھو اور خدا سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

۲۳۲۔اور جب عورتوں کو طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہوجائے تو ان کو دوسرے شوہر کے ساتھ جب وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہوجائیں نکاح کرنے سے مت روکو۔اس حکم سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں خدا اور آخرت کے روز پر یقین رکھتا ہے یہ تمہارے لیئے نہایت خوب اور پاکیزگی کی بات ہے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جسٹس بحرالاسلام نے ان آیات کے بعد جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کے ترجمہ

میں دیئے گئے فٹ نوٹ بھی نقل کئے ہیں۔ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کا انگریزی ترجمہ حکومت سعودی عرب کی جانب سے ''**الرئاسة العامة لادارات البحوث العلمية والافتاء والدعوة والارشاد**'' کی تصحیح اور تنقیح کے بعد شائع کیا گیا ہے اور اس میں بھی فٹ نوٹس موجود ہیں یہ فٹ نوٹس درج ذیل ہیں۔

'' دوطلاق کے بعد ملاپ کی اجازت ہے'' تیسری دفعہ کی طلاق ناقابل تنسیخ ہے تا آنکہ عورت کسی مرد سے شادی کرے اور وہ اس کو طلاق دے دے یہ تقریباً ناممکن نوعیت کی شرط ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ایک مرد عورت سے محبت کرتا ہے تو وہ زود رنجی، تنک مزاجی اور اچانک غصہ کو یہ اجازت نہ دے کہ وہ عجلت میں یہ قدم اٹھائے۔۔۔ اگر دو طلاقوں کے بعد ایک مرد اپنی بیوی کو واپس لیتا ہے تو یہ عمل بھی عادلانہ انداز میں ہونا چاہیئے، مثلاً اس کو عورت پر اپنے کسی حق کو کسی انداز میں چھوڑنے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے اور ان کو ایک دوسرے کی شخصیت کا احترام کرتے ہوئے پاکیزہ اور باعزت زندگی گذارنی چاہئے۔''

'' رشتۂ مناکحت کا ٹوٹنا خاندان اور سماجی زندگی کیلئے ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ ہر جائز طریقے کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جو عادلانہ طریقے پر ان کو واپس لے آئے جو پہلے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذار چکے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں باہمی محبت ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ باعزت شرائط پر زندگی گذار سکیں اگر ان شرائط کی تکمیل ہوتی ہے تو کسی باہر والے کو دوبارہ ملاپ کو روکنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ (مخالفت کرنے پر) جائیداد کی وجہ سے یا کسی دوسرے احساسات کی بناء پر مائل ہو سکتے ہیں۔''

جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کے ان حاشیوں کے بعد جسٹس بحرالاسلام نے سورۂ النساء کی ۳۵ ویں آیت کا حوالہ دیا ہے۔

۳۵۔ ''اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف' مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔ وہ اگر صلاح

کرا دینا چاہیں گے تو خدا ان میں موافقت پیدا کر دے گا کچھ شک نہیں کہ خدا سب کچھ جانتا اور سب باتوں سے خبردار ہے۔''

اس آیت پر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کا حاشیہ درج ذیل ہے۔

''یہ حکم خاندانی تنازعات کو زیادہ تشہیر' ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور قانونی موشگافیوں کا سہارا لیے بغیر طے کرنے کا ایک عمدہ منصوبہ ہے۔ لاطینی ممالک نے اس منصوبے کو اپنے قانونی نظام میں تسلیم کیا ہے، یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے جس طرح قبول کرنا چاہیئے تھا عام طور پر قبول نہیں کیا، ہر خاندان کا حکم دونوں فریقین کی طبیعت اور مزاج کی خصوصیات سے واقف ہوگا۔ اور اللہ کی مدد سے صحیح مفاہمت کرا سکے گا۔''

جسٹس بحرالاسلام نے اسکے بعد شقاق اور طلاق کے موضوع پر مولانا محمد علی' جسٹس عبدالرحیم' جناب اے' اے' اے فیضی کے حوالے دینے کے بعد جسٹس کرشنا ایّر کے ایک فیصلے کا حوالہ بھی دیا ہے جو انہوں نے کیرالا ہائیکورٹ کے جج کی حیثیت سے دیا ہے۔

A. Yousuf Rowther Vs Sowramma Air 1971) Kerala 261) اس فیصلے میں جسٹس کرشنا ایّر نے بھی قرآن کی شقاق والی آیت اور اس کی تشریح نقل کی ہے۔

جسٹس بحرالاسلام نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں طلاق دینے کی اجازت ہے، لیکن یہ اختیار غیر معمولی حالات میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ طلاق کیلئے اس سے پہلے مفاہمت کی کوشش لازمی شرط ہے۔

جسٹس بحرالاسلام نے بحیثیت چیف جسٹس گوہاٹی ہائی کورٹ طلاق کے مسئلہ پر قرآن کی سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۵ کا ترجمہ ایک اور کیس میں دیا۔ اور آیت شقاق کو بنیاد بناتے ہوئے یہ اصول اخذ کیا کہ طلاق دینے کیلئے کوئی معقول سبب ہونا چاہیے اور طلاق سے پہلے تحکیم یا مفاہمت ضروری ہے اسکے بغیر طلاق کے واقع ہونے کو تسلیم نہیں کیا جائے

گا۔(1981 Gauhati Law Reports 375)

سپریم کورٹ نے شمیم آراء بہ نام ریاست اُتر پردیش ودیگر میں یہی فیصلہ دیا۔جسٹس آر۔سی۔لاہوتی نے اپنے فیصلے میں مسلم پرسنل لاء پر مُلاّ اور ڈاکٹر طاہر محمود کی کتابوں کے حوالوں کے بعد جسٹس کرشنا ایّر اور جسٹس بحرالاسلام کے متذکرہ صدر فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ طلاق کسی معقول سبب کی بنیاد پر دی جائے اور طلاق سے پہلے بیوی اور شوہر کے درمیان دو حکم صاحبان کے ذریعہ تحکیم یا مفاہمت کی کوشش ہو۔اس کوشش کے ناکام ہونے کے بعد ہی طلاق کو تسلیم کیا جائے گا اور طلاق موثر ہوگی۔سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد ملک کی ہر عدالت قانون کی اسی تشریح کی روشنی میں فیصلے دینے کی پابند ہے۔

طلاق کے سلسلہ میں ایک اور مسئلہ بھی عدالتوں میں زیر بحث آتا رہا ہے۔وہ یہ ہے کہ بیوی کی جانب سے نفقہ دلانے کیلئے عدالت میں پیش کی گئی درخواست کے جواب میں شوہر کی طرف سے یہ عذر دیا جاتا رہا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے کسی گذری ہوئی تاریخ پر طلاق دے چکا ہے، اسلئے عورت بیوی باقی نہیں رہی اور اس لئے وہ نفقہ کی مستحق نہیں ہے۔بیوی کی طرف سے قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا جاتا رہا اور یہ کہا جاتا رہا کہ نہ طلاق دی گئی اور نہ طلاق دینے کی کوئی اطلاع ملی۔اس تعلق سے ہائی کورٹس کا کئی فیصلوں میں یہ رجحان رہا کہ مرد کی جانب سے طلاق دئے جانے کی بات کو اس تاریخ سے تسلیم نہیں کیا جائے گا جس تاریخ پر طلاق دینے کا اس نے ادعا پیش کیا ہے، مگر اسکے جواب کی نقل بیوی کو ملنے کی تاریخ سے یا جواب کی تاریخ سے طلاق کو تسلیم کیا جائے گا۔ہائی کورٹ نے بعض فیصلوں میں جواب دعوے کی تاریخ کو بھی تاریخ طلاق تسلیم کرنے سے انکار کیا اور یہ فیصلہ دے دیا کہ جب تک مرد معتبر شہادت کے ذریعہ طلاق دینے کے اعلان کو ثابت نہ کرے طلاق کے واقع ہونے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اور متعلقہ عورت اس شخص کی زوجہ رہے گی اور بحیثیت زوجہ تمام حقوق کی مستحق رہے گی۔ایسا ہی فیصلہ بمبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ کے اجلاس کاملہ نے

دگڑو پٹھان بنام رحیم بی پٹھان ودیگر میں دیا ہے۔سپریم کورٹ کے متذکرہ صدر شمیم آراء کیس میں بھی یہ نکتہ زیر بحث آیا۔اور عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ طلاق کا اعلان (Pronouncement) ضروری ہے اور اس اعلان کو عدالت میں ثابت کرنا بھی ضروری ہے۔سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد ہندوستان کا کوئی ہائی کورٹ اور تحت کی عدالت شوہر کی طرف سے اس کے خلاف نفقہ کی کاروائی میں ماضی کی کسی تاریخ پر طلاق دینے کے عذر کو تسلیم نہیں کرے گی۔اور یہی فیصلہ دے گی کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔اور اگر طلاق کا اعلان کیا گیا تھا تو اس کو عدالت کے سامنے ثابت کیا جائے۔

ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے ان فیصلوں کی روشنی میں کچھ سوالات اُبھرتے ہیں جن کے بارے میں علمائے کرام کو غور کرکے بورڈ کے لیگل سیل اور اس کے کنوینر کی رہنمائی کرنی ہوگی۔

۱۔کیا طلاق دینے کی وجہ یا سبب کا ظاہر کرنا اور اس سبب کا معقول ہونا ضروری نہیں ہے؟ (اس سوال کا حضرات علماء جو جواب دیں گے ان کے علاوہ ایک معقول جواب جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی مطلقہ عورت کی آئندہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی کا دروازہ بند نہیں کرتی۔شوہر اور بیوی کے درمیان تعلقات اتنے گہرے اور اتنے قریبی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان کے کئی پہلوؤں سے کوئی تیسرا شخص واقف نہیں ہوسکتا۔زن وشو کے تعلقات کی کسی ایسی بات کا اظہار عورت کے مستقبل کیلئے نقصان دہ ہوسکتا ہے اور اسکے دوسرے نکاح کیلئے رکاوٹ بن سکتا ہے، اس لیے طلاق کے سبب کا ظاہر نہ کرنا عورت ہی کے مفاد میں ہے)۔

۲۔کیا طلاق شقاق کے بغیر بھی واقع ہوتی ہے یا شقاق ہی وہ صورتحال پیدا کرتی ہے جس میں مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے؟

۳۔اگر شقاق طلاق کا اہم سبب ہے تو پھر شقاق کے سلسلہ میں قرآن کی سورۃ النساء

کی آیت نمبر ۳۵ میں جو حکم ہے اس کی تعمیل ضروری کیوں نہیں ہے؟

۴۔ شریعت اسلامی میں کیا اور کوئی حکم ایسا موجود ہے جس میں قرآن کریم کے کسی واضح حکم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے؟

۵۔ کیا طلاق کا اعلان ضروری ہے۔ متعلقہ عورت کو طلاق بغیر اطلاع دی جائے تو کیا طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

۶۔ اگر عورت کو طلاق دینے کی اطلاع دینا ضروری نہیں ہے تو اس کی شریعت اسلامی میں کیا مصلحتیں بتائی گئی ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس سے اس عورت کی حیثیت اور حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں معقولیت تو اس میں یہ نظر آتی ہے کہ عورت کو اس سے واقف کرایا جائے اور اس کی اطلاع دی جائے۔

شریعت اسلامی کے ان موضوعات پر احکامات کو بیان کرنے کے سلسلے میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ سپریم کورٹ اس اصول کو تسلیم کر چکا ہے کہ کسی مسئلہ پر کسی پرسنل لاء کے اطلاق کے بارے میں کسی جج کو جدید دور کے اپنے تصورات داخل نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس پرسنل لاء کے اصل ذرائع و سرچشموں سے جو قانون اخذ ہوتا ہے اس کے مطابق یا پھر اس کی تشریح جو ہائی کورٹس نے کی ہے انکے مطابق فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ بہت ہی مشہور کیس کرشنا سنگھ بنام متھرا آہیر و دیگر میں دیا ہے۔ اس فیصلے میں سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ:

''فریقین کے پرسنل لاء کے اطلاق میں کوئی جج ماڈرن زمانے کے اپنے تصورات کو داخل نہیں کر سکتا، مگر اس کو اس قانون کا نفاذ کرنا چاہئے جو مسلمہ اور مستند منابع سے اخذ کیا گیا، جیسے ہندو لاء میں شروتیوں اور انکی تفسیروں جن کی تشریح مختلف ہائیکورٹ میں فیصلوں میں کی ہے۔ بجز ان معاملات کے جہاں ایسے قانون کو عمل درآمد یا رواج نے تبدیل کر دیا ہو یا ملکی قانون نے بدل دیا ہو یا منسوخ کر دیا ہو۔''

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی روشنی میں شریعت کے احکامات کی ان بنیادوں کو واضح کرنا ضروری ہوگا جو قرآنی آیات اور احادیث نبوی ﷺ پر مبنی ہیں اس کے علاوہ ان احکامات کی معقولیت اور مصلحتوں کی وضاحت ضروری ہے، کیونکہ جن میں معقولیت نظر نہ آئے ان کو عدالت کی جانب سے تسلیم کیا جانا دشوار، بلکہ ناممکن ہے مثلاً یہ کہ طلاق دیدی گئی اور مطلقہ عورت کو اس کی اطلاع نہیں پہنچائی گئی یہ بات معقولیت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی شرعی مصلحت ہے تو اس مصلحت کی معقولیت کو واضح کرنا ضروری ہوگا۔

اس سلسلے میں، میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ علمائے کرام ان مسائل پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ ہمارے مختلف احکامات اُس دور میں مستنبط ہوئے ہیں، جبکہ خلافتِ عباسیہ دنیا کے نقشے پر ایک طاقتور ترین حکومت کے طور پر اُبھر چکی تھی اور اس مسلم معاشرے میں طلاق عورت کیلئے عیب تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ کوئی بالغ عورت بے شوہر نہیں رہتی تھی مطلقہ ہو کہ بیوہ عدت کے ختم ہوتے ہی دوسرا شوہر مل جاتا تھا، اس طرح کوئی عورت بے سہارا نہیں رہتی تھی آج کی صورتحال اس سے بالکل مختلف ہے۔ طلاق کو عیب سمجھا جاتا ہے، ایک مطلقہ عورت کیلئے دوسرا نکاح بہت دشوار ہو جاتا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں جا سکتا کہ غریب اور مفلس خاندانوں کی مطلقہ لڑکیاں واقعی بے سہارا ہو جاتی ہیں، ایسی صورت میں وہ احکامات جنھیں ہمارے فقہائے کرام نے زمانے کی رعایت کرتے ہوئے مرتب کیا ہے ان پر غور کرتے وقت اس پہلو کو پیش نظر رکھا جائے، کیونکہ سپریم کورٹ کے محولہ بالا فیصلے کی روشنی میں ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم شریعت کے احکامات کو قرآنی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کی بنیادوں پر عدالتوں کے سامنے پیش کریں۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ علمائے کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اس تحریر میں پیش کئے گئے سوالات کا معقول انداز میں جواب مرتب کرے، تاکہ اگر ماہرین قانون، شریعت سے متصادم فیصلوں پر مکرر غور کیلئے کسی عدالتی چارہ کار کی شکل نکالتے ہیں تو ان کو ہمارا مقدمہ پیش

کرنے میں مواد اور مدد مل سکے گی۔

دوسرا مسئلہ مطلقہ کے نفقہ کا ہے جس میں سپریم کورٹ کے پانچ ججوں کے اجلاس نے فیصلہ کیا کہ نادار مطلقہ عقد ثانی یا تاحیات نفقہ پانے کی مستحق ہے۔ عدالت کا یہ فیصلہ قانونی اعتبار سے بھی درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ مسلم مطلقہ خاتون کے حقوق کا قانون بابت ۱۹۸۶ء ایک نادار مطلقہ کی کفالت کا انتظام کرتا ہے اور آخری صورت میں عدالت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ایسی عورت کے گذارہ کا انتظام وقف بورڈ کرے۔ اس فیصلے کو دوبارہ زیر بحث لانے کے لئے اب کیا تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے یہ ماہرین قانون بتاسکتے ہیں۔ ایک صورت اس میں یہ ہوسکتی ہے کہ کسی ہائی کورٹ نے سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی بنیاد پر اپنا فیصلہ دیا ہو تو اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل کروائی جائے اور اس میں سپریم کورٹ کے دانیال لطیفی کیس کے فیصلے کو زیر بحث لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ اور طریقۂ کار کیا ہوسکتے ہیں، اس کے لیے ماہرین قانون سے رائے لینا بہتر ہوگا۔

☆☆

نکاح رجسٹریشن سے متعلق سپریم کورٹ کی ہدایت

● مفتی محمد ارشد فاروقی
استاذ حدیث جامعۃ الامام انور، دیوبند

نکاح رجسٹریشن کے بارے میں سپریم کورٹ کی یہ ہدایت کہ رجسٹریشن کے فیصلے کا اطلاق ہندوستانی تمام اقوام اور تمام مذاہب کے ماننے والوں پر ہوگا اسی کے ساتھ یہ ہدایت کہ اس سلسلے کی تمام ضروری کارروائی تین مہینے کے اندر مکمل کرلی جائیں ہندوستان کے تمام شہریوں کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہے، جب کہ عدالتیں شہری حقوق کی حفاظت اور سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ہیں، فیصلے کا لب ولہجہ بتارہا ہے کہ اس کے پیچھے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی ذہنیت کارفرما ہے جس کا اعادہ وقفہ بہ وقفہ ملک کے ماحول کو گرم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا اور ہر نکاح کا رجسٹریشن کے عمل سے گزرنا کسی قدر دشوار اور ناممکن ہے اس کا اندازہ ان امور سے لگایا جاسکتا ہے۔ حکومت کے پاس ہر شہری کی موت اور ولادت کا سو فیصد ریکارڈ نہیں ہے۔ ابھی تک بڑے منصوبے کے باوجود ہر ہندوستانی کا الیکشن کارڈ نہیں بن سکا ہے، ہر شہری کا آئی کارڈ بنایا جانا تو ابھی صرف خواب وخیال ہے۔ جب کہ چین جیسے کثیر الآبادی والے ملک میں آئی سی (C.I) کا مکمل نظام ہے۔

ملک کی اس صورت حال میں عدالت عظمیٰ کا حالیہ فیصلہ اور فیصلے کے حدود اربعہ ومصداق کی باضابطہ تشریح وتوضیح کے ساتھ تین مہینے میں جملہ کارروائی کرلینے کی کڑی

ہدایت ہندوستانی شہریوں اور بالخصوص مسلمانوں اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے لئے باعث مشکلات اور الجھنیں پیدا کرنے کے ساتھ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی طرف بڑھتا ایک قدم ہے، جبکہ منطقی طور پر یہ واضح ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں یکساں سول کوڈ کی بات ہندوستانی اقوام و مذاہب کی فطرت کے خلاف ہے، اقلیتوں کے ساتھ اکثریت کے لئے بھی ناقابل قبول ہے۔

نکاح رجسٹریشن فیصلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یقیناً اس کے فوائد بھی ہیں جن کے پیش نظر ہندوستان میں رائج تمام نکاح ناموں کو منضبط کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک ماڈل نکاح نامہ تیار کرایا، تاکہ ہر مسلم زوجین کا نکاح تحریری شکل میں درج ہو اور بوقت ضرورت بطور سند پیش کیا جاسکے، لیکن مسلم پرسنل لا بورڈ کے سارے وسائل واسباب کے باوجود کروڑوں کی آبادی میں چند لاکھ زوجین کے نکاح کا ریکارڈ بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے پاس موجود نہیں ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور سپریم کورٹ کی منشا ومقصد میں ایک گونہ یکسانیت پائی جاتی ہے ہر شہری کے نکاح کا رجسٹریشن عدالت کا مقصد ہے اور ہر مسلمان کے نکاح کا رجسٹریشن مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہدف ہے اختلاف کا نقطہ دراصل لازمی وقانونی حیثیت کا ہے عدالت کے فیصلے نے ہر شہری کے نکاح کا رجسٹریشن لازم قرار دیا ہے جب کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے سفارشی واپیل کا اسلوب اختیار کیا ہے۔

عدالت کا فیصلہ مسلم لا سے اس وقت متصادم ہوگا جب کسی مسلم زن وشو نے نکاح کا رجسٹریشن نہ کرایا ہوگا اور نکاح کے شرعی شرائط کی تکمیل کر چکے ہوں گے تو عدالت سرے سے شادی کو تسلیم نہ کرے گی اور شریعت اسلامی مان رہی ہوگی، کیونکہ اسلامی قانون دو شاہدوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کو مہر کی شرط کے ساتھ نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کافی

مانتا ہے اس کے علاوہ کسی تحریری وثیقہ یا رجسٹریشن کو ضروری نہیں گردانتا۔ گو تحریری شکل دینے کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک کے بڑے شہروں اور قصبات میں مختلف نکاح نامے رائج ہیں اور نکاح خواں نکاح نامے کی کاپیاں زوجین کو دیتے ہیں اور ایک کاپی محفوظ رکھتے ہیں۔ ان احوال سے نمٹنے اور منضبط ومرتب شکل دینے کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ ماڈل نکاح نامہ رائج کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ لیکن بورڈ کی مساعی اور نکاح خواں وقاضیوں کی کوششوں کے باوجود مواضعات و دیہی علاقوں میں روزانہ بڑی تعداد میں ایسے نکاح پڑھائے جاتے ہیں جن کا انضباط واندراج نہیں ہوتا صرف گواہان کی گواہی نکاح کے ثبوت کی بنیاد ہوتی ہے۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ ایسے نکاح اور ایسی شادیاں جن کا رجسٹریشن نہیں کرایا گیا یا آئندہ نہیں کرایا جائے گا سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق کیا حیثیت رکھتی ہیں؟

جب زوجین کے پاس نزاع کی صورت ہو یا وراثت کے مسائل کے علاوہ اور قضیے پیش آئیں تو عدالتوں میں بطور ثبوت صرف سرکاری طور پر رجسٹرڈ شادیاں ہی تسلیم کی جائیں گی۔ جن جوڑوں کی شادی کے گواہان ہوں گے انہیں عدالت ماننے سے انکار کرے گی ایسی صورت میں ملک گیر سطح پر لوگ دشواریوں کا سامنا کریں گے۔ رجسٹریشن کے لئے ہندوستانی مزاج کے مطابق رشوت کا بازار گرم ہوگا دلالوں کی چاندی ہوگی، انتشار وخلفشار کا ماحول ہوگا، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ابھی ہمارا ملک اس درجہ نہ ترقی یافتہ ہوسکا ہے اور نہ انتظامیہ کی ایسی گرفت اور استطاعت ہے کہ پورے ملک میں ہونے والے نکاح وشادی کا رجسٹریشن کر سکے اور صاف شفاف ریکارڈ رکھ سکے اور آئی سی الیکشن کارڈ ولادت وموت کے جامع ریکارڈ نہ ہونا اس دعوے کی بین دلیل ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ عدالت کے اس فیصلے سے صرف اقلیتیں متاثر نہیں ہوں گی، بلکہ ہندو برادری کو بھی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کہ ہندو سماج کی شادی چند پھیرے

کرنے یا زوجین کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہار ڈالنے یا سندور پیشانی میں بھرنے سے منعقد ہوجاتی ہے۔اب ہندوسماج کی شادیوں کا تحریری ریکارڈ تلاش کیا جائے تو مسلم اقلیت کے مقابلے اس کی شرح بہت کم ہوگی۔

حاصل یہ کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسائل میں ایک مسئلے کا اضافہ ہوا ملک کے تمام کروڑوں مسلمانوں کی نظر بورڈ کی طرف ہے، دیکھنا ہے کہ بورڈ کے اقدامات کس انداز کے ہوتے ہیں۔ نکاح رجسٹریشن کے سلسلے میں بورڈ کے فیصلے وتجاویز میڈیا کے ذریعے قارئین کے سامنے آچکے ہیں بات حالیہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کی ہے اگر سپریم کورٹ اپنے فیصلے میں تھوڑی ترمیم کرکے لازمی کی جگہ اختیاری کی تعبیر اپنالے تو دشواریوں کا بہترین حل ہوجائے اور مسلم پرسنل لا وسپریم کورٹ کے مابین اختلافی صورت ختم ہوجائے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے پورے وسائل کے ذریعے نکاح نامہ رائج کرنے کی تحریک چلائے ہوئے ہے اور عدالت اختیاری رجسٹریشن کے ذریعے کار خیر انجام دے تو بڑی حد تک کامیابی کی امید کی جاسکتی ہے اور جب تک ہمارے ملکی وسائل اجازت نہیں دیتے اس وقت تک ثبوت نکاح کے لئے نکاح رجسٹریشن بذریعہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ محکمہ شرعیہ دارالقضاء، نکاح خواں وقاضی، گواہوں کی گواہی کو عدالتیں تسلیم کریں اور یہی وجہ ہے کہ ان مذکورہ تمام نکاح ناموں کو غیر ملکی امیگریشن قبول کرتے ہیں۔

اگر مسلم پرسنل لاء بورڈ برادران وطن کے مذہبی رہنماؤں سے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کریں اور مشترکہ دشواریوں کو سامنے رکھ کر متحدہ پلیٹ فارم کے ذریعے (عوامی تحریک سے گریز کرتے ہوئے) عدالت کے فیصلے میں ترمیم کی مشترکہ کوشش کریں تو یہ قدم مسئلے کے حل کے ساتھ باہمی اتحاد کے مظاہرے کی بہترین صورت ہوگی۔

ہندوستانی ماحول میں مسلم اقلیت ایک عرصہ سے یہ بات محسوس کررہی ہے کہ عدالتی

فیصلوں وہدایات کے ذریعے مسلم پرسنل لا، شرعی قوانین ملی تشخص کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی خاموش تائید کی جارہی ہے، بلکہ حکمراں طبقہ براہ راست فیصلے نہ لے کر عدالتوں کے ذریعے مسلم مخالف فیصلے کراتا ہے تاکہ ان کے سیاسی استحکام کو ضرر نہ پہنچے۔اگر یہ رجحان پنپ رہا ہے تو ملک کے لئے بہت ہی نقصاندہ ہے۔عدالتوں کا وقار آج بھی ہندوستان میں قائم ہے، غایت درجہ عدالتی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہر قسم کے دباؤ اور جانب داری اور کسی مخصوص فکر ومنصوبے کی اجارہ داری سے عدالتوں کو دور رہنا عدالتی استحکام وعزووقار کے بقاء کے لئے ضروری ہے۔

☆☆

باب پنجم

برطانوی سماج اور اسلامی قوانین

برطانیہ میں اسلامی قانون کی گنجائش

● ڈاکٹر روون ولیمس

7رفروری 2008 کورائل کورٹ آف جسٹس برطانیہ میں ''دیوانی (سول) اور شرعی قوانین۔ایک مذہبی تناظر'' کے موضوع پر آرک بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمس نے ایک لکچر دیا جس پر برطانوی میڈیا اور سیاستدانوں میں کھلبلی مچ گئی، پیش ہے لیکچر کا متن۔ (ادارہ)

بعض اسلامی قوانین جو ہمارے معاشرے میں ایک بڑھتے ہوئے چیلنج کے طور پر شدت سے محسوس کیے جارہے ہیں، یعنی ملک میں ایسے فرقے جو اگر چہ دیگر باشندوں کی طرح قانون کے پابند ہیں، لیکن ان کا تعلق کچھ ایسی باتوں سے ہے جو برطانوی قانونی نظام سے پوری طرح تعلق نہیں رکھتیں، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ عوامی اور قانونی سطح پر جو مسائل ابھرتے ہیں انہیں اس مذہبی فرقہ کے شرعی قوانین کی دفعات کے تحت قابل اجازت ہونا چاہئے جو کہ محض اسلام کے ماننے والوں تک ہی مخصوص نہیں ہیں۔ ہمیں یادرکھنا چاہئے کہ اگر چہ کلیسائے برطانیہ کا قانون ہمارے ملک کا قانون ہے، لیکن اس پر عمل آوری کی ذمہ داری جن افراد کے ہاتھوں میں ہے انہیں خاصی آزادی عطا کی گئی ہے، اس پس منظر میں ایسے سوالوں کی ایک بڑی تعداد ہے جنہیں ہم سمجھتے ہیں اور قانون کے تحت ان کے حل

کی توقع کرتے ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو عمومی طور پر ایک سیکولر سماجی ماحول میں اور بھی زیادہ شدت سے ابھر کر آتے ہیں۔

میں اپنی بات کا آغاز اسلامی قانون سے متعلق بعض امور پر اپنی توجہ مرکوز کر کے کروں گا، تاکہ اس کے ذریعہ محض وسیع تر مسائل پر اظہار خیال کیا جا سکے۔

برطانوی معاشرہ میں مسلمانوں کے مقام کے بارے میں جو متعدد امور ہیں اور جن پر بحث ہوتی رہتی ہے ان میں سے جو ایک سب سے زیادہ واضح اور سنگین مسئلہ ہے اور عوامی رائے کے سروے کی سنسنی خیز خبروں سے وقتاً فوقتاً اس کی تائید ہوتی رہتی ہے، وہ یہ ہے کہ برطانیہ میں رہنے والے مسلم فرقے اپنے شرعی قوانین کے تحت زندگی گذارنے کی اجازت چاہتے ہیں اور بہت سے لوگ شرعی قوانین سے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ یہ کہ خواتین کے لئے یہ قوانین جابرانہ ہیں، یہ دقیانوسی اور وحشیانہ ہیں اور جسمانی سزاؤں پر مبنی ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے یہ خبر آئی تھی کہ ایک نوجوان خاتون کو جس کی جبری طور پر شادی کی گئی تھی بعض دشواریوں کی وجہ سے شرعی قوانین کے تحت سزا دی گئی۔ اس قسم کی خبروں سے جیسا کہ ہم اندازہ کرتے ہیں یہی تصویر سامنے آتی ہے کہ شریعت زیادہ سے زیادہ دور ماقبل جدید کا ایسا نظام ہے جس میں انسانی حقوق کا کوئی عمل نہیں ہے۔

اس مسئلہ کو مسلم اسکالرز بھی آزادانہ طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ نئے افکار پر مشتمل اپنی کتاب 'مغرب کے مسلمان اور اسلام کا مستقبل' میں طارق رمضان لکھتے ہیں کہ مغرب میں شریعت کے تصور سے اسلام کے تمام تاریک ترین پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ بہت سے مسلم دانشور بھی انتہا پسندوں کے خوف سے اس نظریہ کا حوالہ بھی دینے کی ہمت نہیں کرتے یا انہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ محض ایسی اصطلاح کے استعمال سے ان کی تمام تصانیف شکوک وشبہات کے دائرے میں آجائے گی۔ (ص31)

بعض ہنگامی خدشات سے قطع نظر ایک واضح غیر یقینی صورت حال یہ رہتی ہے کہ ملک

کا قانون کس حد تک ان اقلیتی طبقات کو ان کے سخت دستور اور قوانین پر عمل کی اجازت دے سکتا ہے۔ لہذا یہ مسئلہ صرف اسلام سے متعلق ہی نہیں ہے، بلکہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے فرقے مثلاً قدامت پرست یہودی بھی شامل ہیں اور درحقیقت گذشتہ ایک سال کے دوران بعض ایسے سوالات بھی ابھرے ہیں کہ جو مذہبی فرقوں کو بعض قانونی دفعات سے مستثنیٰ کئے جانے سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ رومن کیتھولک اڈاپشن ایجنسیوں کے مسائل سامنے آئے جو گذشتہ موسم بہار میں جنسی تعلیم سے متعلق دفعات کے سبب پیدا ہوئے تھے۔

اس لیکچر میں شریعت کی نوعیت کا تفصیلی جائزہ پیش نہیں کیا جائے گا، کیونکہ میں اس کا مجاز نہیں ہوں۔ میرا فیصلہ جیسا کہ میں نے بیان کیا یہ ہے کہ ایک سیکولر ملک میں مذہبی فرقوں سے متعلق بعض وسیع تر مسائل کو چھیڑا جائے۔ نیز کچھ اس پر بھی اظہار کیا جائے کہ برطانیہ میں اسلامی شرعی قوانین اور ملکی قوانین کے ایک تعمیری اور منصفانہ امتزاج کے کیا نتائج ہوں گے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ شریعت کے بارے میں بعض نیرنگیوں کا ازالہ کر دیا جائے شریعت کوئی ایک ہی طرح کے (یک سنگی) قوانین کا وسیع مجموعہ نہیں ہے پر بقول طارق رمضان یہ اسلام کے آفاقی اصولوں کی مظہر اور ایک ایسا ڈھانچہ بنیادی طور (دائرہ کار) اور فکر ہے جو انسانی تاریخ میں اسے روبعمل بناتی ہے۔ (ص32)

آفاقی اصول کی بابت ہر مسلمان مفسر واضح طور پر کہے گا کہ اس سے مراد کائنات اور بالخصوص سطح ارض پر بسنے والے انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی ابدی اور مطلق رضا ہے اسی کے ساتھ اسے اصلیت میں بروئے عمل لانا بھی ہے، کیونکہ یہ کوئی بنا بنایا (ریڈی میڈ) نظام نہیں ہے۔ اگر یہ سماوی قانون کا لب لباب ہے تو شریعت سے مراد اسے اصلیت میں بروئے کار لانا اور اس کا اطلاق کرنا ہے۔ شریعت کے بعض مخصوص عناصر وضاحت سے قرآن وسنت میں بھی بیان کئے گئے ہیں اور قرآن وحدیث کے یہ احکام حتمی تسلیم کئے

جاتے ہیں، لیکن کوئی ایسا واحد ضابطہ نہیں ہے جس کی بطور شریعت نشان دہی کی جا سکے۔

جب بعض ممالک شرعی قوانین کا نفاذ کرتے ہیں یا جب بعض سرگرم مسلم کارکن ملکی قوانین کے ساتھ ان شرعی قوانین کو بھی تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کی مراد وہ کامل اور آفاقی ضابطہ (کوڈ) سے نہیں ہوتی ہے جو مجموعی طور پر سب کے لئے قابل نفاذ ہے، بلکہ وہ چند مخصوص ضوابط کا نفاذ چاہتے ہیں جو کسی امام یا کسی روایت کے مطابق منضبط کئے گئے۔

عصر حاضر میں شریعت کے روایتی شارحین کے نزدیک اس سے شرعی قوانین کا نفاذ ان کے قدیم فقہی مسالک کی تعبیر کے مطابق کیا جائے۔ لیکن اب بہت سی آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ اجتہاد کے تحت دی گئی وسعت کو بروئے کار لایا جائے، یعنی روایتی فتوؤں اور فیصلوں کی پابندی کے بجائے ہمیں اولین اصولوں کی بنیاد پر مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ ملاحظہ ہو عبداللہ سعید کی کتاب ''عصری اسلام میں رجحانات۔ زمرہ بندی کی ایک ابتدائی کوشش۔''
(دی مسلم ورلڈ 9.3.2007)

اس طرح عام خیال کے برخلاف جب ہم اسلامی شریعت اور برطانوی قانون کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو ہمیں ان دونوں حریف نظام میں کوئی بیگانگی نظر نہیں آتی۔ ایک طرف شریعت اپنے جواز کے لئے کسی انسانی فیصلے ووٹ یا ترجیحات پر انحصار نہیں کرتی، بلکہ اس یقین پر قائم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر مبنی ہے اور اس کے حکم کا مظہر ہے، دوسری طرف جہاں تک تشریعی اور قطعی دفعات وضوابط کا تعلق ہے تو یہ ناقابل تبدیل ہیں۔ شریعت کو تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس فقہی طریقہ کو تسلیم کرنا جو وحی کے ذریعہ نازل شدہ متن وعبارت کے تحت مرتب کیا گیا ہے، نہ کہ کوئی ایک واحد نظام۔

گذشتہ سال مراکش کی الاخوان یونیورسٹی میں مولانا صدیقی کے مقالے پر بحث کے دوران ایک کانفرنس میں چند مسلم اسکالرز نے یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ اسلامی شریعت کو محض تنگ نظر ضوابط کا مجموعہ سمجھنا یا قرار دینا اسلام کے آفاقی نظریہ کی تحقیر کے مترادف ہے۔

ایک طرف تو ان آفاقی دعوؤں میں ترمیم وتبدیلی کا امکان نہیں دوسری طرف مومن رضا کارانہ طور پر اس بات کو تسلیم کرنے پر رضامند ہیں کہ طبعی طور پر وہ ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرتے کہ غیر مسلموں پر مسلمانوں کا غلبہ ہو۔ تاریخی طور پر بھی اور عصری حالات میں بھی مسلم ممالک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امت کا وجود سیاسی وجغرافیائی حدود میں محدود نہیں ہے۔ دور حاضر میں اس کی مثال پاکستان کے قیام کا نظریہ ہے جو جناح کی قیادت میں وجود میں آیا۔ دوسری مثالیں (اردن اور مراکش) بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایسے معاشرے ہیں جہاں شہریت کا وہ تصور نہیں ہے جو امت سے وابستگی سے مطابقت رکھتا ہو۔

ان معاشروں میں اگرچہ شریعت کے غلبہ اور آفاقیت کے تصور کی بابت نہ مصالحت کی جا سکتی ہے نہ اسے کمزور ہونے دیا جا سکتا ہے اور نہ اسلام کے اس ملک یا قوم کا امتیازی مذہب ہونے سے انحراف کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ معاشرہ کے سبھی مذاہب کے افراد کے حقوق ہیں۔ باہمی ربط اور فرد کے مقام کا بھی وہاں تعین ہے۔

اس طرح اس میں ایک مشترکہ بہبود کا تصور ہے جنکا سماوی ضوابط میں صراحتاً ذکر نہیں ہے، بہرکیف یہ ایک عبوری اور غیر تکمیلی صورت حال ہوسکتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان ایک غالب مسلم اکثریت والے ملک میں بھی ایک طرح سے دوہری شناخت رکھتا ہے بطور اس ملک کے شہری اور مسلمانوں کے طبقہ میں ایک مومن کے طور پر۔

یہ صحیح ہے کہ اس بات کی بعض مسلم بنیاد پرستوں کی طرف سے سختی سے تردید کی جائے گی، مثلاً سید قطب کے پیروکار اور ایسے دوسرے مناظرہ پسندوں کی جانب سے بھی۔ تاہم یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ عالم اسلام میں سنجیدہ مسلم مفکرین کی واضح اکثریت اس کو تسلیم کرے گی کہ یہ سیاسی تکثیر اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے، اس لحاظ سے (جیسا کہ میں نے پہلے کہا) ہم ایک ہی سطح پر دو حریف نظام کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ اسلامی معاشرتی فکر اور غیر مسلم دنیا میں ایک عمومی سیاق وسباق میں قانون کی تفہیم کے معاملہ میں

باہمی مفاہمیت موجود ہے۔

یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ہماری معاشرتی شناخت کسی واحد مخصوص تعلق کے ضابطے یا سلسلہ وابستگی پر تشکیل نہیں دی گئی ہے۔ اگر ان ضوابط میں سے وہ ضابطہ جو بے حد بنیادی مانا جاتا ہے اور جس کے بارے میں کسی قسم کی مصالحت نہیں کی جاسکتی جو کہ خالق ومخلوق کے درمیان ایک عہد کے طور پر طے پایا ہے (جیسا کہ یہودی اور عیسائی عقیدہ ہے۔ یہاں ایک بار پھر واضح کر دیا جائے کہ ہم کسی مخصوص مسلم مسئلہ کی بات نہیں کر رہے ہیں۔)

خطرہ نہ صرف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مذہبی پہلو سے یہ مفروضہ سامنے آتا ہے کہ فرقہ (کمیونٹی) کی رکنیت (امت سے وابستگی یا عیسائی فرقہ سے وابستگی وغیرہ) ہی صرف زمرہ میں شامل ہونا ہے۔ لہذا دیگر سیاسی وسماجی وابستگی یا سرگرمیوں میں حصہ لینا ایک قسم کا انحراف ہے اور جب ایک سیکولر حکومت عوامی اور سیاسی شناخت کی تعبیر کے کام کی اجارہ داری لے لیتی ہے تب بھی یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ ایک صورت حال جو کہ عصری مباحث میں غیر معروف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ کسی ملک کا شہری ہونے کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس ملک کے تمام قوانین کی پابندی کی جائے، یہ پابندی اس انداز سے کی جائے کہ کسی دیگر تعلق، پابندی ورسم رواج کی حیثیت نجی اور انفرادی ہو جائے۔

جیسا کہ میں نے دیگر متعدد مواقع پر کہا ہے کہ جدید معاشرہ میں سیاسی اصلیت کی بڑی غیر اطمینان بخش صورت حال ہے، لیکن شہریت اور انسان کے باہمی طور پر ایک دوسرے پر انحصار کے قانونی زمرے کی بابت فکر کی یہ ایک پیچیدہ بنیاد ہے۔ ایلاس ڈیر میکن ماٹر کی پیروی کرتے ہوئے ملیحہ ملک نے اپنے ایک مضمون ''عقیدہ اور قانون کی صورت حال'' (قانون میں عقیدہ)۔ لیگل تھیوری مضامین مرتبہ پیٹر اولیور سائنی ڈگلس اسکاٹ اور وکٹر ٹنڈروس (صفحہ 49-129) میں لکھا ہے کہ اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ مرکزی (مین اسٹریم) معمول کے مطابق کسی احتجاج یا اعتراض کے بغیر ان متفرق ذرائع کو نظر انداز کر دے جن

میں فی الحقیقت ان مختلف نوعیت کی فرقہ وارانہ وابستگی اور اعمال وافعال کو سمجھا جاتا ہے جو اس میں کارفرما ہوتے ہیں۔

اگر مفروضہ یہی ہے تو ان رجحانات کا تجزیہ کرنے کے لئے بنیادی عمل کو ہی مناسب مادی آلہ کار سمجھا جائے۔ فرد کے عمل یا معاشرتی رسوم پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے جو عمل کی بنیاد فراہم کرتے ہی، طرز عمل کا ایک علیحدہ اور انفرادی عمل کے طور پر جائزہ لیا جانا چاہئے۔ (ص40-139)

اسی مجموعہ میں ایک دوسرا مضمون انتھونی بریڈنی کا ''مذہب کے مدمقابل'' کے عنوان سے ہے (صفحہ 105-89) اس میں ان عدالتی فیصلوں کے حوالے دئے گئے ہیں جن میں عدالتوں نے مدعا علیہم کے ذریعہ لئے گئے فیصلوں کے محرکات کے جواز کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ صرف عدالت ہی ان کے دعوؤں کے ارتباط اور ان کے اخلاص کی بابت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے اور جب عدالتیں اس بنیاد پر جسے عام طور پر معاشرتی طرز عمل کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو بقول بریڈنی (ص103-102) انہیں یہ الزام دیا جاتا ہے کہ انہوں نے ان افراد کو اپنی بات کہنے کا موقع نہ دے کر وسیع تر تکثیر کے اصول سے انحراف کیا ہے۔

معزز مسیحی شرعی ماہر قانون چائسلر مارک ہل نے اپنے حالیہ متعدد مقالات میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مذہبی عناصر پر مبنی تنازعات میں ذہن واضح نہ ہونے کے سبب کیسے تباہ کن فیصلے لئے گئے ہیں۔ وہ مذہبی جذبہ اور ضمیر کے تحفظ کی جو شریعت میں مطلوب ہے کی بہتر تعبیر وتشریح پر زور دیتا ہے (خاص طور پر ملاحظہ کیجئے رسل سینڈ برگ سے اس کا مکالمہ کیا کچھ بھی مقدس نہیں ہے؟ سیکولر دنیا میں متضاد عناصر کا تصادم۔ پبلک لا مارچ، 2007 ص506-488)

اپنے ایک حالیہ مباحثہ کے دوران جو مذہبی منافرت بھڑکانے کے خلاف قانون

سازی کے اخلاقی پس منظر کے عنوان پر انہوں نے کہا کہ مذہبی جارحیت سے متعلق جرم کو اس ذہنیت کے تناظر میں دیکھا جانا چاہئے جس میں ایسی صورت حال پیدا کردی جاتی ہے کہ کوئی مذہبی شخصیت یا جماعت کو اپنی بات عوام تک پہنچانے کا موقع حاصل نہیں رہتا۔ ایسے جرائم کو مجرمین کی حیثیت اور طاقت کے لحاظ سے دیکھا جانا چاہئے، تاکہ کوئی باحیثیت فرد یا گروہ کسی ضرر رسیدہ مظلوم اقلیت کے بارے میں جارحانہ یا توہین آمیز باتیں کہے تو اسے مزید ایذا رسانی کا مجرم گردانا جائے۔

جونکتہ میں یہاں بیان کررہا ہوں وہ بھی ایسا ہی ہے، گرچہ ملکی قانون کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے جو بعض حلقوں کے نزدیک ایک خاص طرز عمل کا سبب بنتا ہو۔ بعض غیر متوقع پیشہ وارانہ ضروریات کے خلاف احتجاج جو مثال کے طور پر مذہبی عقیدہ پر اثر انداز ہوتا ہو تو یہ اس کی واضح ناکامی ہوگی کہ وہ اس شخص تک اپنی بات نہیں پہنچا سکا جو قانونی کارروائی میں الجھا ہوا ہے (یا فی الحقیقت ان کی ترسیل کو نہیں پاسکا) اس طرح ایک قانونی نظریہ (جسے مثال کے طور پر حال ہی میں آر اے ڈوف نے پیش کیا ہے) اپنے مقصد میں ناکام ہوگیا۔

اس کے دوہرے نتائج ہوتے ہیں۔ طریق کار سے متعلق ایک سیدھا سادا سوال ہے جس کا جواب بریڈنی یا مارلک دونوں ہی اس سے زیادہ نہیں دیتے۔ یہ کہ موجودہ عدالتیں کس طرح کام کرتی ہیں اور ان مسائل کو کس حد تک اہمیت دی جاتی ہے جن پر ہم یہاں بحث کررہے ہیں، لیکن ایک اور زیادہ وسیع نظریاتی اور عملی مسئلہ بھی ہے وہ یہ کہ ایک سے زیادہ عدالتی نظام کے تحت رہنا کیسا ہے یہ بات ہمیں اپنے موضوع پر واپس لے جاتی ہے جس سے ہم نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ یعنی برطانوی عدالتوں کے عمومی دائرہ سماعت کے تعلق سے شریعت کا کردار (یا فی الحقیقت قدامت پرست یہودی شعائر ورسوم) عام طور پر جب یہ پوری شدت سے کہی جاتی ہے کہ ملکی قانون کو افراد ان کی اجتماعی مذہبی شناخت کی بنیاد پر تحفظ دینا چاہئے اور انہیں اپنے مذہبی شعائر کی ادائیگی کی ضمانت دینی چاہئے تو اس

سے کئی باضابطہ سوالات سامنے آتے ہیں۔ میں یہاں مختصر طور پر تین مشکلات کا ذکر کروں گا، ان مسائل کا تعلق اس سوال سے ہے کہ آیا قانون کی پیروی میں مذہبی شناخت اور فرقہ وارانہ حقوق کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے یا ایک زیادہ وسیع مسئلہ جسے میں نے بیان کیا، یعنی یہ کہ کسی مذہبی فرقہ کی عدالت کو بعض قوانین پر عمل آوری کا اختیار دے دیا جائے، یعنی بعض قوانین شرعی عدالتوں کو منتقل کردئے جائیں اور یہ آخری سوال صرف اسلامی شرعی قوانین کے بارے میں ہی نہیں ہے، بلکہ قدامت پرست یہودی شرعی قوانین بھی اس کے تحت آتے ہیں۔

مذہبی شناخت کو وسیع تر قانونی اہمیت دینے کے خلاف پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے قانونی کارروائی کا عمل (بشمول تنظیموں میں معمولی تادیبی کارروائی) تکلیف دہ مذہبی رخصت اپیلوں کے رحم وکرم پر منحصر ہوکر رہ جائے گی۔ اس کی ایک حالیہ مثال یہ خبر ہے کہ مارکس اینڈ اسپنسر میں ملازم ایک مسلم خاتون نے انجیل کی کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب پر کام کرنے سے انکار کردیا۔ یا ہم اور بھی زیادہ سنگین سوالوں کی بابت غور کرسکتے ہیں جیسے جبری شادیوں کے بارے میں جہاں ثقافتی اور تنگ مذہبی پہلو کے درمیان امتیاز کرنا بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے۔

بریڈنی صحیح طور پر ان ججوں کو محتاط رہنے کا مشورہ دیتا ہے جو مذہبی رخصت کے نظریہ کو مسترد کردیتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ افراد کی معاشرتی شناخت کی تشکیل میں اس کا کیا کردار ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ اس قسم کی حساسیت کو تسلیم کرنے کے لئے ایسے ہی شعوری طور پر حساس دعویٰ کے تسلیم شدہ ذرائع بھی موجود ہونے چاہئیں۔ ایک طریقہ جس سے خالص ثقافتی عادات واطوار اور سنجیدہ مذہبی عقائد وشعائر کے درمیان امتیاز کیا جاسکے، نیز مذہبی افکار ونظریات اور مجہول تعصّبات کے درمیان بھی فرق ظاہر ہوسکے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مجاز مذہبی شخصیت تک رسائی حاصل کی جائے جو کسی

مذہبی جماعت کے لئے کام کرتی ہو۔ برطانیہ میں ایک اسلامی شرعی کونسل موجود ہے جس سے عائلی امور کے بارے میں فتوے طلب کئے جاتے ہیں اور اگر ہم مذہبی شناخت میں موجود حقوق واجازت (رخصت) کو قانون کے تحت مزید اعانت دیدیں تو ہمیں ایک زیادہ وسیع اور بااختیار ادارہ کی ضرورت پیش آنے لگے گی۔ جس کے پاس زیادہ وسائل ہوں اور اس فرقہ میں ایسے زیادہ وسیع اعتبار حاصل ہو، تاکہ پیچیدہ تنازعات پر بھی مجملاً کارروائی عمل میں آسکے۔ ایک سیکولر وکیل کو اس کا علم ہونا چاہئے کہ کونسا مقدمہ حقیقی امکانیات پر مبنی ہے قانون اور شرعی بنیادوں پر مستحکم ہے اور کہاں یہ محض لغویات اور ناواقفیت پر منحصر ہے، بغیر جانچ اور جرح کے کسی کو رخصت کا سادہ چیک نہیں دیا جاسکتا۔

ایک دوسرا مسئلہ جو بے حد سنگین ہے وہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں خصوصاً عائلی قوانین کے معاملے میں اگر ضمنی عدالتی کارروائی کا حق تسلیم کرلیا جائے تو اس سے اس فرقہ میں بعض بے حد انتہا پسند عناصر کو تقویت ملے گی اور ان کی جابرانہ اور رجعت پسندانہ سرگرمیوں سے خواتین کے کردار اور آزادیوں پر ناگوار اثر پڑے گا۔

یہاں جبری شادیوں کے مسئلے کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے اور بلاشبہ اس وقت یہ سب سے زیادہ سنگین اور مجرمانہ نوعیت کا مسئلہ ہے، لیکن حقیقتاً اس کا تعلق رسم ورواج اور تہذیبی روایات سے ہے نہ کہ مذہبی عقائد واحکامات سے۔ یہاں میں ایک اور مسئلہ کا حوالہ بھی دوں گا جو کہ وراثت سے متعلق ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شرعی قوانین کے تحت بیوگان کو وراثت میں جو حصہ دیا جاتا ہے اس میں انہیں نقصان ہوتا ہے اسے ہماری اکثریت ایک ناقابل قبول طریقہ سمجھے گی۔

ایک شرعی (دراصل قرآنی) ضابطہ جو کہ اس دور میں جب کہ تہذیبی طور پر خواتین کے حقوق کا مسئلہ بالکل غیر معروف تھا اک بیوی کی پوزیشن کو محفوظ رکھنے کا ایک واضح وسیلہ تھا، لیکن اگر آج اسے پوری طرح نافذ کیا جائے تو یہ موجودہ حالات میں ان کے عدم تحفظ پیدا

کرنے کا باعث ہوگا۔ بطور مثال ملاحظہ ہو این ایلزبتھ میسر کی کتاب ''اسلام اور حقوق انسانی''۔(1999 ص111)

یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی فرقہ کی شرعی عدالت کا یہ حق تسلیم کرلیا جائے کہ وہ ان امور میں قطعی اور حتمی فیصلے صادر کرسکتی ہیں تو نہ صرف یہ کہ تنازعات کے تصفیہ کی ایک اور سطح وجود میں آجائے گی اور نئے ضابطے شروع ہوجائیں گے، بلکہ اقلیتی طبقے کے افراد ان حقوق اور آزادیوں سے محروم ہوجائیں گے جس کے بطور شہری وہ حقدار ہیں، ایک قانونی نظام کے تحت ایک کثیر قومی معاشرہ میں کسی اقلیتی طبقہ کو اپنے مخصوص مسائل اپنے عقیدے کے مطابق حل کرنے کا حق دے کر حقوق ومراعات عطا کئے جاسکتے ہیں، لیکن کسی کو ایسے اختیارات کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو ان حقوق کو باطل قرار دیدیں جنہیں عام طور پر اختیارات تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسے سوالات اٹھانے کے لئے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے جوابات کیا ملیں گے، حالانکہ یہ کوئی جواب نہیں ہے جو کسی تنازعہ کے امکان کو ختم کردے اور کسی قسم کے تکثیری عدالتی نظام کو تسلیم کرلیا جائے تو وہ ان حدود کے تحت ہوگا کہ کسی ضمنی عدالتی نظام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو ان حقوق کی رسائی میں مانع ہو جو دیگر شہریوں کو حاصل ہیں یا ان حقوق کا مطالبہ کرنے پر انہیں سزاوار کرے۔

درحقیقت یہ وہ بات ہے جو ایک اقلیتی طبقہ خود اس کو چاہے گا کہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو کہ کسی فرقہ سے تعلق رکھنے کے سبب وہ ان حقوق ومراعات سے محروم ہوجائے جو ایک سیکولر ملک میں دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔ بہتر طور پر اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ شہریت خود کو ایک پیچیدہ منظر نامہ ہے جو کسی فرقہ وارانہ وابستگی سے علاقہ نہیں رکھتا، بلکہ سب ہی اس کے دائرہ میں آتے ہیں۔

لیکن اس سے تنازعہ ختم نہیں ہوجاتا۔ ایک مخصوص کیس میں ہم نے بیوہ کی وراثت کے حق کا حوالہ دیا ہے۔ یہ بات پہلے ہی ثابت ہوچکی ہے کہ بعض مسلم ممالک نے اس

معاملہ میں نرمی اختیار کی ہے (یہاں ملیشیا کا حوالہ دیا جاسکتا ہے) لیکن ہم یہاں ایک اور بے حد حساس مسئلہ کو لیتے ہیں، یعنی ارتداد کا مسئلہ، کہ صورت میں جو وحشیانہ سزا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مذہبی عقیدہ کی آزادی کو قانونی تحفظ حاصل ہے کوئی گروہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ کوئی دوسرا مذہب قبول کرنا ممنوع ہے، یا دوسرا مذہب قبول کرنے والے کو نشانہ تعزیر بنایا جائے۔ یہاں ہم ایک انتہائی حساس پہلو پر گفتگو کررہے ہیں جو نہ صرف قانونی عمل کے بارے میں سوچنے، بلکہ بین المذہبی تعلقات سے بھی وابستہ ہیں۔

عصر حاضر کے مسلم شارحین اور اسکالرز کی خاصی بڑی تعداد یہ دلیل پیش کریں گی کہ ارتداد کے بارے میں قرآنی حکم اور اس کی سخت سزا اس صورت حال کا پتہ دیتی ہے۔ جب اسلام ترک کرنے کا مطلب امت کے خلاف اعلانیہ جارحیت کے مترادف سمجھا جاتا تھا، لہذا اس کی سزا بھی ایسی سخت رکھی گئی ہے جو حالت جنگ کے دوران جاسوسوں اور غداروں کو دی جاتی ہے۔ لیکن عصر حاضر میں دنیا کے حالات کے مدنظر یہ دلیل مؤثر نہیں ہوسکتی۔

بلاشبہ قدامت پرست مسلمانوں کے لئے یہ بات قطعی ناقابل قبول ہوگی، کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایک عقلیت پسندانہ حکمت عملی ہوگی جو کہ شرعی اعتبار سے اجتہاد کی ایک شکل ہے اور مخصوص روایتی ضوابط کے تحت نہیں آتی، لیکن ابھی استعمال کردہ اصطلاح کو بروئے کار لاتے ہوئے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ایک غالب اسلامی معاشرہ میں بھی اس ملک کے قانون کے تحت لوگ تعلقات کی مختلف انداز میں تعبیر کرتے ہیں اس صورت حال میں ایسے قانون کا جواز ثابت کرنا مشکل ہوجاتا ہے، کیونکہ ان تعلقات کے درمیان رابطہ کا طریقہ ایک کھلی ہوئی دشمنی ہوگی۔ ایسے حالات میں مذہب تبدیل کرنے پر سنگین سزا کی موزونیت ایک خاصے تنگ مسلم دائرہ فکر کے تحت بھی واضح نہیں ہے۔

اس کے مدمقابل جہاں غالب قانونی ضابطہ غیر اسلامی ہے، لیکن امت کے اجتماعی مفاد اور حقوق کا سنجیدگی سے احترام کیا جاتا ہے وہاں ایسا کوئی مفروضہ نہیں کہ امت کے

دائرہ سے ماوراء کسی عدالتی نظام کا انجام تباہی ہے۔ لہذا یہ بات پھر تسلیم کی جاتی ہے کہ اختلاف مذہب خود بخود کوئی مہلک خطرہ نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر مسلم دانشوروں کے درمیان مختلف سیاق وسباق میں دبی دبی لیکن حقیقتاً بحث جاری ہے۔ میں نے یہاں جزوی طور پر اس کا ذکر کیا ہے، کیونکہ بین المذہبی مسئلہ کے طور پر بہت اہم ہے، نیز حقوق انسانی اور اقلیتوں سے متعلق بحث میں بھی اس کی اہمیت ہے اور جزوی طور پر یہ دکھانے کیلئے مختلف مگر قریبی معاشرتی تعلقات (جسے دوسرے لوگ تکثیری وابستگی سے تعبیر کرتے ہیں) عورتوں کی حیثیت اور تبدیلئ مذہب (ارتداد) کے اعصاب شکن سوالوں پر غور کرنے کے لئے ایک بنیاد فراہم کرسکتے ہیں۔

ایک ضمنی عدالتی نظام کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعض حلقوں میں اس کی مقامی اجارہ داری کو تسلیم کرلیا جائے۔ ایک یہودی ماہر قانون آئیلے شیکسر نے اپنے ایک بے حد اہم اور فکر انگیز رسالہ جو کثیر ثقافتی حدود کار اور خواتین کے حقوق کے موضوع پر ہیں۔ کسی ایسے ماڈل کے خطرے کی کھوج کی ہے جو ایک غیر ریاستی حدود کار کے حق پر منتج ہو، اس سے بے حد سنگین مسائل پیدا ہوں اور اپنے کمزور ترین ارکان کے مزید نقصان کا باعث بنے۔ وہ لکھتی ہے کہ ہمیں مختلف طبقات پر خارجی تحفظ کے امکانات کے خطرات واثرات کی بابت ہوشیار رہنا چاہئے۔ یہ اثرات جو پہلے ہی سے موجود اندرونی کشمکش کو غیر مقوی طور پر ابتر کرسکتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم ایک ایسے نظام سے بچنا چاہتے ہیں جو ایک عدالتی طریق کار کو معاشرتی کردار کی تعبیر اور تعلقات کی تشریح کی اجارہ داری سمجھتا ہے تو ہم محض ایک ایسے فرقہ وارانہ قانونی نظام کی غیر تنقیدی تائید کر کے مسئلہ حل نہیں کرسکتے، اس سے اجتناب اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ پورے فرقے کو الگ تھلگ کردیا جائے بقول شیکسر ”ضرورت یہ

ہے کہ ہم اس نظریہ کو یا تو تمہاری ثقافت یا تمہارے حقوق کے چیلنج پر قابو پائیں''۔

فرقہ وارانہ شناخت کو قانونی اعتبار سے تسلیم کئے جانے کے بڑھتے ہوئے اعتراض کا مقابلہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ہم ان بنیادی اصولوں کی بابت سوچیں تو مختلف عدالتی نظاموں کے درمیان تعلق کو مربوط کریں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ ہم کسی ایسے غیر تنقیح شدہ نظام سے رابطہ نہ رکھیں جو جابرانہ اثرات کا حامل ہے یا کسی ضمنی عدالتی نظام کے لئے مشترکہ عوامی آزادیوں کو فیصلہ کن طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔ یعنی یہاں بھی ہم کوئی سادہ چیک نہیں دے سکتے۔

میں شیکسپئر کی مثبت تجویز کی تفصیلات کی طرف لوٹوں گا، لیکن اس سے پہلے میں تیسرے اعتراض کی جانب متوجہ ہوتا ہوں جو مختلف عدالتی دائرہ کار کے درمیان تعلق کی وضاحت کی پیچیدگیوں کے سبب پیدا ہوا ہے۔ کیا نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے یہ غلط نہیں ہے کہ ہم قانونی نظام کی اجارہ داری سے وابستہ ہونے کا دعویٰ کریں؟ جدید دنیا میں ہماری فکر جس پر عالمی حقوق کے یوروپی نظریہ کا غلبہ ہے اس فکر کی بنیاد یہ ہے کہ قانون بہرحال قانون ہے اور ہر شخص عوامی قانون کے آگے مساوی حیثیت سے کھڑا ہے، لہٰذا اگر ہم مغرب کے قانونی نظام کی معاشرتی اور سیاسی پیش رفت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے مشترکہ شناخت کو تسلیم کرنا اور ضمنی عدالتی نظام کا وجود مربوط ہے۔

اس راہ میں تھوڑا خطرہ بھی ہے، ہم بعض اوقات روشن خیالی کے دور کے بعد کی سیاست کے عالمی نظریہ کی بات کرتے ہیں۔ عہد روشن خیال کا عظیم احتجاج اس اقتدار کے خلاف تھا جو صرف روایتوں سے واسطہ رکھتا تھا اور کسی دیگر معیار کو تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھا وہ کسی دلیل یا معیار سے بھی عوامی فلاح اور آزادیاں عطا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک عوامی نظام کو اپنانے کے لئے روایتی طرز حکومت سے دستبردار نہ ہونے کی اس کی روش قابل فہم تھی۔ اسے ان کے مطلق العنان اقتدار اور لامحدود موروثی مراعات کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے

جو کہ جدید یوروپ کے ابتدائی دور میں رائج تھے۔

ہماری تہذیبی تاریخ میں سب سے زیادہ مثبت لمحہ وہ تھا جب کہ ہر خاص و عام کے لئے عدالتی نظام تک رسائی اور ہر ایک کے لئے جوابدہی کی مساوی سطح کو اپنایا گیا۔ یہ دراصل اس نظام کی توسیع اور تجدید تھی جو پہلے سے ہی موجود تھا، یہ رومن اور وسطی عہد کی قانونی روایتیں جن کے تحت قانون کی اولیت اور ہمہ گیری پر اصرار کیا جاتا تھا۔ (اور خود بادشاہ بھی اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔)

لیکن پیچیدہ معاشرتی نظاموں کے حقائق کی بابت صرف انہی امور کو زیر غور لانا کافی نہیں ہوگا، یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ شہریت مساوی رسائی کے خلاصہ کی شکل ہے اور مساوی جوابدہی یا تو بنیاد ہے یا معاشرتی شناخت اور ذاتی محرکات کا مجموعہ ہے۔ جہاں کہیں اس کا نفاذ کیا گیا ہے تو یہ ایک معاشرہ کے لئے کمزور وسیلہ ثابت ہوا ہے اور اس کے نتیجہ میں شدید ناانصافیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ (فرانس میں 1790 میں شہریت کو معقول مساوات کے درجہ تک گھٹا دینے کی متعدد کوششیں اور 1970 کی دہائی میں چین میں ایسی ہی کوششیں اس کی مثال ہیں۔) وہ معاشرے جو نسلی ثقافتی اور مذہبی طور پر مختلف ہوتے ہیں ان میں شناخت کی تشکیل تکثیری تعلق کی بنیاد پر عمل میں آتی ہے، جیسا کہ ہم متعدد حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

خطرہ اس میں ہے کہ وہ مقتدر عناصر جو مساوی شہریت کے خلاصہ سطح کا نظم کرتی ہے وہ ایک حاکمانہ نظام کی نمائندہ بن کر دوسری سطحوں کے وجود کی اجازت دے، لیکن اگر معاشرہ کا وجود تکثیری ہے، جیسا کہ متعدد سیاسی مبصرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے تو اس سے مشترکہ عوامی زندگی کا ایک نقصان دہ نمونہ سامنے آتا ہے جس میں بعض وابستگیاں اور تعلقات کم کر دئے جاتے ہیں یا نجی انداز کے کر دئے جاتے ہیں اس حد تک کہ معاشرتی زندگی کی الگ تھلگ ہو کر رہ جاتی ہے جہاں مخصوص قسم کے مفادات و نظریات کو نجی امور سمجھا

جاتا ہے، لیکن انہیں عوامی مشترکہ فلاح اور ترجیحات کی بابت جاری بحث میں کوئی سند جواز عطا نہیں کی جاتی۔

بطور اختتامیہ اگر ہم اسلام اور برٹش قانون کے تعلق کے بارے میں معقول انداز میں سوچیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں غیر معقول مخالفت اور مفروضات کو ختم کرنا ہوگا۔ خواہ وہ شرعی نوعیت کے ہوں یا روشن خیالی نوعیت کے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ قانون کی نوعیت کے بارے میں غور کئے بغیر اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، یہ آسان ہے کہ کسی قسم کی معصومیت میں پناہ لی جائے اور جسے میں نے قانونی عالمگیریت سے تعبیر کیا ہے جب ایک سخت نظریاتی تائید (اور یہاں میری مراد مذہب سے ہے۔) سے محروم ہوجاتا ہے تو وہ انسانیت ایسی بے معنی ہوجاتی ہے جیسے کوئی دیگر نظریہ۔

اگر یہ نادر نظریہ جو میں نے پیش کیا ہے صحیح ہے، یعنی عالمگیر قانون اور عالمگیر حقوق اس جذبہ کو تسلیم کرنے کا ایک وسیلہ جسے انسان کے اندر وہ مشکل سے پایا جاسکتا ہے نہ کنٹرول کیا جاسکتا ہے تو ان مباحث کے درمیان مذہب ہمارا منتظر ہے، خواہ ہماری ثقافت اسے دور رکھنے کی کوشش کیوں نہ کرے اور جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں میں اس بارے میں کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔

☆☆

برطانیہ میں قانون شرعیہ کا اطلاق
آرک بشپ کی رائے

(اس پس منظر میں بھارت میں بھی ہر اقلیت کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کی آزادی دی جانی چاہئے)

● انور علی ایڈوکیٹ

انگلینڈ میں سرکاری مذہب عیسائیت ہے۔ 'چرچ آف انگلینڈ' رومن چرچ سے (پوپ کی اتھارٹی سے) آزاد ہے۔ آرک بشپ آف کینٹر بری'۔ (جو اینگلی عقیدہ کا پاسبان ہے) نے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ: ''انگلینڈ میں چند مسلم شرعی قوانین کو اپنانا ناگزیر ہے۔ شرعی قوانین کو ''مناسب حد تک'' انگلش سسٹم آف لاء میں شامل کرنا (Aceommodate) ضروری ہے''۔

آرک بشپ صاحب کے اس بیان سے انگلینڈ سمیت دوسرے ملکوں میں بھی یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ ''ملک کے لیگل سسٹم میں اقلیتوں کے مذہبی یا ادارتی قوانین کو مناسب حد تک شامل کرنا'' کی ''حد'' اور ''وسعت''۔ (LIMIT AND EXTENT) کیا ہے؟۔ آرک بشپ روون ولیمس نے یہ ریمارک رائل کورٹس آف جسٹس میں اپنے لیکچر (موضوع تھا ''سول اور مذہبی قوانین''۔) میں دیئے۔ برطانیہ میں -1.6- ملین مسلمان ہیں۔ ان کے نمائندے ہاؤس آف کامنز میں، اور ہاؤس آف لارڈز میں ہیں۔ دونوں ہاؤس نے آرک بشپ کی رائے کی مخالفت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اس سے انگلینڈ کی فرقہ وارانہ

رواداری کوضرر پہنچے گا'' جبکہ کچھ انگریز دانشوروں کی رائے ہے کہ ''اگر مسلمان اپنی پرائیوٹ اور عائلی زندگی کو اپنے مذہبی اور ادارتی قوانین سے ریگولیٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔'' لیکن آرک بشپ صاحب کے خلاف تنقید کرنے والے دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگر شرعی قوانین کو عائلی، پبلک لائف میں تسلیم کیا جاتا ہے تو اس سے عورتوں کی حیثیت پر اثر پڑے گا، جو ان کو انگریزی قوانین کے تحت حاصل ہے۔ طلاق، چہارزوجگی، وراثت کے قوانین (جو اِن دانشوروں اور سیاست دانوں کی نظر میں عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ ہیں) وغیرہ کو برداشت کرنا پڑے گا جو انگریزی روایات کے خلاف ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کچھ چنیدہ (Selective) مسلم شرعی قوانین کو لاگو کیا بھی جائے تو وہ برطانیہ کے موجودہ قوانین کے متضاد (Repucnant) ہوں گے۔ برطانوی روایات اور انسانی حقوق سے متصادم ہوں گے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ خط فاصل کھینچنا مشکل ہوگا کہ کس حد تک شرعی قانون لاگو کئے جائیں اور کس حد تک برطانوی قوانین اور روایات و رواجی قوانین تمام برطانوی شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔ مختلف مذہبی فرقوں پر، مختلف قوانین کا اطلاق برطانوی سماج کو منتشر کردے گا۔ مثلاً اگر مسلم شرعی قانون چہارزوجگی کو لاگو کیا جاتا ہے تو برطانوی یک زوجگی قانون (Monogamy) پر کیا اثر ہوگا؟ یہ تو انتہا پسندی کے سامنے جھکنا ہوگا۔'' یہ ہے آرک بشپ صاحب کے بیان پر تنقید کا دائرہ۔

لیکن برطانوی سماج کی صورت حال کیا ہے؟ برطانوی قانونی ڈھانچہ میں کچھ مخصوص دیوانی مذہبی قوانین شرعیہ کا سمویا جانا ناگزیر ہے۔ برطانیہ میں آبادی کا رنگ (Demography) میں تیزی سے بدلاؤ آیا ہے۔ 2001 کی مردم شماری بتاتی ہے کہ برطانیہ میں 78.8 فیصد لوگ مذہب کے پیروں ہیں۔ 71.6 فیصد عیسائی ہیں۔ 2.7 فیصد مسلمان ہیں۔ ایک فیصد ہندو ہیں، باقی سکھ، بودھ اور یہودی ہیں۔ آرک بشپ صاحب کا کہنا ہے کہ متنوع نسلی، تہذیبی، ثقافتی آبادی پر یکساں قوانین (Uniform-law) کا اطلاق مناسب نہیں ہے،

کیونکہ اصطلاحی طور پر انگلینڈ سیکولر نہیں، عیسائی ملک ہے۔ برمنگھم میں ایشائی آبادی اکثریت میں ہے، پھر ان میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ آبادی کے رنگ میں (Demography) بدلاؤ سے یہ ناگزیر ہے کہ مختلف لیگل سسٹموں کو برطانوی لیگل سسٹم میں مفید طریقہ سے سمویا جائے۔ آرک بشپ صاحب نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ ''مسلم شرعیہ قوانین کو لاگو کرنے میں اعتراض کیوں؟ جب کہ برطانیہ میں یہودی مذہبی عدالتیں کام کررہی ہیں۔ مذہب کی بات نہیں، مختلف فرقوں کے مختلف رواجی اور مذہبی قوانین کو آدر دیا جانا ضروری ہے۔ مختلف کلچرز کے قوانین محض شادی، طلاق وغیرہ سے متعلق ہی لاگو کیا جانا ہوگا۔ ٹریڈ کامرس اور معاہداتی قوانین شرعیہ بھی برطانوی قوانین سے متضاد نہیں ہیں''۔

ہندوستان میں مختلف مذہبی اکائیوں کے قوانین آدر سے لاگو کئے جاتے ہیں، ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور اکائیوں کے رواجی قوانین لاگو کئے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے شادی، طلاق کے قوانین، یہودی، اور پارسیوں کے قوانین اِن فرقوں پر لاگو کئے جاتے ہیں اور عدالتوں میں کسی طبقہ کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ کوئی ملک خواہ سیکولر ہو یا اسکا سرکاری مذہب کوئی بھی ہو، قوانین کے اطلاق میں آبادی کے متنوع فرقوں اور تہذیبی کلچر، مذہبی اکائیوں کے قوانین کو آدر سے لاگو کیا جانا سوسائٹی کے اتحاد کیلئے ضروری عُنصر ہے۔ آرک بشپ صاحب نے ایک اہم سماجی ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں جو سیاسی اور کلچرل عنصر، کامن سول کوڈ کی بات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ چانسلر سبحارک (1976) جرمنی سے سویت یونین اور یوگوسلاویہ کے بکھراؤ تک (1988) ہر جگہ، کامن سول کوڈ کا تجربہ ناکام ہوا ہے۔ ہندوستان کے مذہبی، کلچرل اور تہذیبی اختلاف اور تنوع (Diversity) کا تقاضہ ہے کہ ہر فرقہ کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو۔

☆☆

برطانیہ میں قوانین شرعی کے نفاذ کی تجویز

زعمائے ملت کی بصیرت کا امتحان

● مولانا محمد عیسیٰ منصوری
چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم، لندن

برطانیہ میں فروری ۲۰۰۸ء کے شروع میں چرچ آف انگلینڈ کے سربراہ آرچ بشپ ڈاکٹر روون ولیمز نے (جو دنیا بھر کے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے عالمی سربراہ ہیں) نے برطانیہ میں اسلامی شریعت کے چند قوانین کے نفاذ پر غور وفکر کی دعوت دے کر یہاں کی فضا میں ارتعاش بلکہ تہلکہ بپا کردیا۔ آرچ بشپ ڈاکٹر روون نے یہ تجویز غور وفکر کے لئے اپنی سنڈ (چرچ آف انگلینڈ کی پارلیمنٹ) میں پیش کی تھی، مگر یہاں کا میڈیا (جس پر صہیونیت کی گہری چھاپ ہے) نے اس طرح ہنگامہ بپا کردیا گویا صلاح الدین ایوبی نے برطانیہ پر حملہ کردیا ہو۔ مغربی میڈیا نے نائن الیون کے بعد اسلامی فوبیا کا جو ہوا کھڑا کیا ہے اسے اسلام کے خلاف شور شغب کا بہانہ مل گیا، چنانچہ میڈیا کی شرارت کے سبب ڈاکٹر روون ولیمز کو غصے میں بھرے دھمکی آمیز اور ناشائستہ الفاظ میں بہت سے فون، خطوط اور ای میل ملے، آرچ بشپ کی شریعت کے بعض قوانین کی حمایت میں ہمدردانہ بیانات پر میڈیا تو ان کی مخالفت میں پیش پیش تھا ہی خود چرچ کے بعض ممبران اور سابق آرچ بشپ آف کنٹربری لارڈ کیری نے بھی برطانیہ میں شریعت اسلام کے بعض قوانین کے نفاذ پر غور وفکر کی دعوت کو خطرناک قرار دے کر ڈاکٹر روون پر تنقید کی، حتیٰ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں بشپ ولیمز کے استعفیٰ کی

گونج سنائی دی۔ کینٹ پولیس کے سینئر ذرائع نے صورت حال کو دیکھتے ہوئے آرچ بشپ کو چوبیسوں گھنٹہ پولیس تحفظ کی پیش کش کی اور ان کی سیکوریٹی کے حوالے سے گہری تشویش کا اظہار کیا، لیکن آرچ بشپ ڈاکٹر ولیمز نے پولیس کی پیش کش کو مسترد کردیا، انہوں نے پریس کو بتایا کہ وہ نہ اپنے بیان پر معذرت کریں گے نہ ہی استعفیٰ دیں گے اور وہ اپنا موقف پریس کے بجائے اپنی سنڈ (چرچ آف انگلینڈ کی پارلیمنٹ) میں پیش کریں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر روون ولیمز نے برطانیہ میں کسی متوازی عدالتی نظام کی تجویز پیش نہیں کی، بلکہ انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ شادی بیاہ، طلاق و وراثت جیسے بعض معاملات میں بعض اسلامی قوانین کی جگہ موجود ہے اور اسلامی شریعت کے چند قوانین اختیار کرلینے سے برطانیہ میں بسنے والے مسلمان کو کمیونٹی سماجی قربت اختیار کرنے میں مدد ملے گی، آرچ بشپ نے بڑے پتہ کی بات کہی کہ مسلمانوں کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت قانون نہیں اصول قانون ہے، یعنی شریعت نے وہ بنیادی اصول فراہم کئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر ہر دور کے تقاضوں اور معاشرہ کی ضروریات پر قوم ونسل کے مزاج و نفسیات کی رعایت کے ساتھ قانون سازی ہوسکتی ہے، یہ ایک عالمی پہلوؤں کا اصولی ضابطہ ہے۔ اس بات پر برطانوی میڈیا نے اسلام کے خلاف جذبات میں آگ لگادی جس میں سیاست دانوں سمیت آٹھ طبقات بہہ گئے اور ہر طرف سے ان پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ ایسے میں ان کی اصل حمایت ان کی سنڈ (چرچ کی پارلیمنٹ) اور ان کے اپنے طبقہ سے ملی ان کے حق میں ایک مضبوط آواز چرچ آف اسکاٹ لینڈ کی سربراہ ریونڈ شیلا کیسٹک کی تھی انہوں نے کہا کہ بعض افراد نے جان بوجھ کر آرچ بشپ کے الفاظ کو غلط معنیٰ پہنائے اور انہیں ذاتی طور پر نشانہ بنایا ہے جو انتہائی افسوس ناک ہے، میں ڈاکٹر ولیم کے شانہ بشانہ کھڑی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ ہم خوش قسمت ہیں جن کے پاس ایک ایسا رہنما موجود ہے جو بعض اہم نازک مسائل میں گہری سوچ وبچار سے بحث کے آغاز کا حوصلہ رکھتا

ہے، یہ خوشی کی بات ہے کہ ایک دوسرے مذہب کے اعلیٰ ترین رہنما نے زمینی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی قوانین کے متعلق ایک مثبت بحث کا آغاز کردیا ہے، اس بحث کا مقصد ایک سیکولر نظام میں رہنے والے اقلیتی طبقوں کے لوگوں کو ان کے مذہبی عقائد کے مطابق زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچانا ہے اور ملکی قوانین و مذہب کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، اس کا اطلاق صرف اسلام یا مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہوگا، بلکہ بتدریج دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اس کا فائدہ پہنچے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ چرچ آف انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز کے ریمارکس کے خلاف میڈیا کے عام ردعمل پر مایوسی کا اظہار کیا اور آرچ بشپ کی ملکی حمایت کا اعلان کیا، سنڈ (پارلیمنٹ) کا اجلاس شروع ہونے سے قبل بشپ آف لچفیلڈ جوناتھن گلیڈین نے کہا کہ ڈاکٹر ولیمز کے ریمارکس کو غلط سمجھا گیا ہے، آرچ بشپ کوئی فیصلہ نہیں دے رہے تھے محض غور وخوض کیلئے ایک مسئلہ اٹھا رہے تھے۔ سنڈ میں جب ڈاکٹر ولیمز نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ ان کی بات کو غلط انداز میں لیا گیا ہے، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ برطانیہ میں مسلم کیمونٹی بعض اسلامی قوانین پر پہلے ہی سے عمل پیرا ہے اس سے ایک وقت آئے گا جب اس عمل کو قانون کا حصہ بنانا ہوگا، اس پر انہیں ارکانِ سنڈ کی طرف سے بھرپور حمایت ملی اور برطانوی میڈیا کی غوغا آرائی طوفانی سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مسلم رہنماؤں اور تنظیموں کا ردعمل اکثر منفی تھا۔ بیرونس سعیدہ وارثی نے کہا کہ شرعی قوانین سے اتحاد کے بجائے تقسیم میں اضافہ ہوگا، دومتوازی نظام قانون معاشرے کے بہت بڑے حصہ کو تنہائی کا شکار کردیں گے اور قانونی تضادات میں اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف کئی مسلم رہنما شریعت سے برأت کرتے نظر آئے، بعض ماڈرن خواتین نے برملا کہا کہ ہمیں شریعت نہیں چاہئے برطانوی قانون نہایت عمدہ ہے۔ دینی تنظیموں اور علماء کرام نے عام طور سے

اس بحث میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھی شاید ان کے نزدیک حالات وحقائق سے آنکھیں بند رکھنا ہی جملہ مسائل کا حل ہے۔

برطانیہ ومغرب کے زمینی حقائق:

برطانیہ میں اس وقت کم وبیش دوملین، یعنی بیس لاکھ مسلمان بستے ہیں، فرانس میں تقریباً ۵۰ لاکھ، اسی طرح بیلجیم، ہالینڈ سمیت تمام ہی یوروپی ممالک میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، سوئزرلینڈ میں سرکاری طور پر اسلام دوسرا بڑا مذہب تسلیم کرلیا گیا ہے، عملاً اسلام یورپ وامریکہ کا دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے۔ حالیہ دنوں میں جن ۵۶ ملکوں نے یوروپ میں شمولیت اختیار کی ان میں بڑی تعداد مقامی مسلمانوں کی ہے مثلاً بلغاریہ میں تقریباً تیس فیصد ترکی نسل کے مسلمان آباد ہیں، آئندہ جلد ہی جو ممالک یورپ کا حصہ بننے والے ہیں ان میں کوسو، بوسنیا، البانیہ جیسے مسلم علاقے اور ممالک بھی ہیں۔ عالم اسلام کا عظیم ملک ترکی بھی یوروپ میں داخلہ کیلئے دروازے پر کھڑا ہے، ایک جوہری فرق یہ ہے کہ پرانے یورپ (برطانیہ، فرانس، جرمنی وغیرہ) میں اکثر مسلمان تارکین وطن کے قبیل سے تھے، باہر سے آکر آباد ہوئے، بلکہ جو ممالک حالیہ ای ای سی (آل یورپ) کا حصہ بنے اور عنقریب بننے والے ہیں ان میں بسنے والے مسلمان اسی زمین کے فرزند اور اسی یوروپی نسل سے ہیں، امریکہ یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی تعداد کے خطرے کو بھانپ کر ہی صہیونی صلیبی گٹھ جوڑ کے لیے نہایت مہارت وچابکدستی سے نائن الیون کا واقعہ انجام دے کر اس کا الزام مسلمانوں کے سر لگایا ہے، تاکہ ایک طرف مغرب کو عالم اسلام پر فوجی یلغار کرکے تباہ کرنے کا بہانہ فراہم ہو دوسری طرف یہاں اسلام کے خلاف نفرت کی آندھی چلا کر بڑھتی ہوئی مسلم آبادی پر بریک لگایا جاسکے۔

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ شروع ہی سے مغرب میں اسلام کا مطالعہ کرنے والے تقریباً تمام ہی طبقات (مؤرخین، ادیب، شعراء) کا تعلق ارکان کلیسا اور

چرچ سے رہا، ان کے نزدیک یورپ پر بیرونی مسلمانوں کے عسکری وسیاسی دباؤ کا واحد تحفظ اسلام کے خلاف نفرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈہ تھا، جب صلیبی جنگوں میں پورا یورپ تین صدیوں تک اپنی پوری طاقت جھونک کر بھی اسلام کو ختم نہیں کرسکا تو ریمنڈلل اور راجر بیکن جیسے اسکالرز نے پوپ کے سامنے اسلام کی بیخ کنی کیلئے اسلام کے مطالعہ کی تجاویز رکھیں، طویل بحث ومباحثہ کے بعد اسے منظوری مل گئی چنانچہ شروع ہی سے مغرب کے مطالعہ اسلام کا بنیادی مقصد اسلام کی خامیاں تلاش کرنا اور اسلام پر نظریاتی حملوں کیلئے مواد جمع کرنا تھا۔ جب تک مغرب کو مسلمانوں سے عسکری خطرہ رہا اس وقت تک مستشرقین کی تحریریں شدید تر عناد ونفرت میں ڈوبی رہیں، جیسے جیسے خطرہ کم ہوتا گیا کھلے عناد ونفرت کی شدت میں بظاہر کمی آتی گئی، بیسویں صدی میں جب مغرب کو عالم اسلام پر ہمہ جہتی غلبہ حاصل ہوگیا اور مسلمان عسکری، سیاسی، علمی، فکری طور پر مغلوب ہوگئے تب اسلام کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوگئی، غرض مغرب میں اسلام کا مطالعہ کرنے والا گروپ (مستشرقین) کی حیثیت ہمیشہ یہاں کی حکومتوں کے آلۂ کار کے اور ان کی تحریروں کی حیثیت اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کی تھی، اس لئے سترھویں صدی کی تحریروں کی زبان انتہائی تلخ، پرعناد اور اسلوب جارحانہ نے اٹھارویں صدی (خلافت عثمانیہ کے کمزور ہوجانے کے بعد) میں کچھ متانت وسنجیدگی اختیار کرلی۔ کچھ کچھ اسلامی، معاشرتی، تاریخی، علمی اثرات دبی زبان سے تسلیم کئے جانے لگے، پہلے مغربی مؤرخین ومصنفین اسلام کا مطالعہ ترکی سے شروع کرتے تھے، اٹھارویں صدی میں سائمن اوکلے نے عہد وصال نبوی ﷺ سے شروع کیا پھر انیسویں وبیسویں صدی عالم اسلام کے ابتلا اور شکست کی صدی تھی، اب مغرب کے عالم اسلام کو سیاسی، اقتصادی، علمی وفکری طور پر شکنجہ میں جکڑ لیا تھا، اب اسلام کے مزید کچھ محاسن تسلیم کئے جانے لگے، مگر انیسویں وبیسویں صدی کے مغربی اہل قلم کی تحریریں احساس برتری سے لبریز ہیں کہ اصل تہذیب، مذہب وقانون مغرب کا ہے۔ تکبر کے احساس سے

طعن وتشنیع، دل آزاری اور انتقامی انداز نمایاں ہوا غرض مغربی اسکالرز ودانشوروں کی تحریریں ہمیشہ سے سرد جنگ کا حصہ تھیں، ان کا پروپیگنڈہ اس قدر شدید طاقت ور ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس نے اسلام کو اپنے اصل مآخذ کے بجائے مغربی تحریروں سے پڑھا ہے، اس کی سوچ وفکر مکمل طور پر مغربی اہل قلم ومستشرقین سے ہم آہنگ ہے، مغرب میں روزگار کی خاطر آنے والے مسلمانوں کی بھاری اکثریت اسلام کے حوالے سے بے یقینی کا شکار ہے، نظریاتی بے یقینی معاشرہ کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے، نیز طاقت ور حریف انہیں بآسانی اپنے ہی معاشرہ کے خلاف آلۂ کار بنالیتا ہے، جیسا کہ برطانیہ میں ہزاروں مسلمان برطانوی انٹلی جنس کے لئے کام کررہے ہیں ان میں بے شمار مولوی بھی ہیں۔ یہ علمی سرد جنگ (مستشرقین) جو تقریباً پانچ صدیوں سے جاری ہے اس کا ازالہ تو کُجا ابھی تک اس کے بیشتر گوشے پردۂ راز میں مستور ہیں، تاہم تاریخ میں پہلی بار یا اب موقع آیا ہے کہ آج گلوبل ویلیج کے عنوان سے مغرب اور اس کے واسطے سے پوری دنیا میں جو عالمی ضابطۂ اخلاق اور معاشرتی اقدار کی تدوین وترتیب ہورہی ہے اس میں ہم اسلام، قرآن اور شریعت کے انسانی معاشرہ کیلئے مفید، بہبود کے ضامن اور مثبت پہلوؤں سے مغرب کو روشناس کرایا جاسکتا ہے، اس طرح انسانی معاشرتی واجتماعی مسائل کے حل کیلئے سیرت نبوی ﷺ کے بہت سے گوشے مدد ومعاون ہوسکتے ہیں، کیا مغرب میں بسنے والے کروڑوں مسلمان اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاسکیں گے؟

آج کی دنیا ایک بستی یا گاؤں (گلوبل ویلیج) اور مختلف ممالک اس کے محلے بن چکے ہیں، ہر ملک ملٹی نیشن، ملٹی کلچر وملٹی ریلیجین ملک ہے، دنیا کے ہر بڑے شہر میں ایک پڑوسی کرشچین، دوسرا یہودی، تیسرا شوشلسٹ یا بدھسٹ ہونا عام بات ہوگئی ہے، نیز سیکولرزم، ڈیموکریسی انسانی حقوق کو عصری دنیا بطور ایک عقیدہ ومذہب کے تسلیم کرچکی ہے اور سیکولرزم کے معنیٰ کسی خاص مذہب یا تمدن کی ترجیح کے بجائے ہر مذہب وکلچر کو مساوی حقوق دینا اور

سب کیلئے مواقع فراہم کرنا ہے، تاکہ ہر مذہب وکلچر کا فرد باہمی رواداری قربت، محبت سے رہ کر ملک وقوم کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ آج دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی باہمی قربت، افہام وتفہیم، رواداری کا ماحول ہے، جب تک دنیا کی دو بڑی قوموں (مسلمان وکرشچین) کے درمیان یہ رواداری وافہام وتفہیم کی روایت قائم نہیں ہوگی دنیا میں امن کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ ان دو بڑی قوموں کے درمیان ٹکراؤ وکشیدگی سے صرف اور صرف صہیونی نسل پرستوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ اس طرح انہیں دونوں قوموں پر اپنے خونی پنجے گاڑنے کا مزید موقع ملے گا، یہ بات مغرب جتنی جلدی سمجھے اس کے اور انسانیت کے حق میں بہتر ہوگا۔

اس وقت دنیا کا سب سے مقبول نظام وسسٹم ڈیموکریسی وسیکولرزم ہے جس پر مغرب کا نہ صرف ایمان ویقین ہے، بلکہ وہ اس کی خاطر قوموں کی نسل کشی پر بھی آمادہ ہے۔ افغانستان وعراق میں اپنی خونریزی کو جواز دینے کیلئے امریکہ ویٹو کا یہی دعویٰ ہے کہ ہم ڈیموکریسی و سیکولرزم کی برکات بانٹنے آئے ہیں اور ان دونوں کی روح ہے حکومت اور قوانین معاشرہ کی مرضی ومنشاء کے مطابق ہوں نہ کہ باہر سے مسلط کئے جائیں حتیٰ کہ دنیا کی کسی (ربڑ اسٹامپ) پارلیمنٹ کو کبھی یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ عوام کی مرضی کے خلاف کسی سپر پاور کے دباؤ میں آکر قوانین معاشرہ پر مسلط کرے۔ غرض یہ عصری حاضر کی بنیادی ضرورت ہے کہ رواداری و افہام وتفہیم کا ماحول قائم کرنے کیلئے اقوام عالم کو چند مشترکہ نکات پر اتحاد واشتراک کرنا ہوگا، چودہ سو سال پہلے قرآن نے تینوں آسمانی مذاہب کیلئے مفاہمت واتحاد کا تین نکاتی فارمولا دیا تھا (۱) خالق کے سوا کسی کی حقیقی عبادت وتابعداری نہ کی جائے (۲) اس عبادت و اطاعت میں کسی بھی طاقت وقوت کو شریک نہ ٹھہرایا جائے (۳) اقوام عالم (طاقتور وکمزور) ایک پھیرے پر رب وخالق بن کر اپنی مرضی مسلط نہ کریں۔ پہلے دو نکات یہودیت، کرشچینٹی اور اسلام میں مسلم ہیں، یہ تینوں آسمانی مذاہب توحید کے قائل اور شرک سے بیزار ہیں، البتہ مغرب تیسرے نکتہ کے خلاف ڈیڑھ ہزار سال سے پاپا کریسی میں مبتلا رہا ہے۔ کرشچینٹی کے

مذہبی طبقہ سے بنیادی غلطی یہی ہوئی کہ انہوں نے خالق کا اطاعت وقانون سازی کا حق پوپ کو دے کر اسے عملاً رب وخالق کا درجہ دے دیا تھا، ہزاروں سال تک پوپ مطلق العنان بن کر مذہبی، معاشرتی، سیاسی حتیٰ کہ شہنشاہوں کے فیصلے کرتا رہا، یہ فیصلے محض اس کی ذاتی مرضی وصوابدید پر منحصر ہوتے تھے اور دنیا کی کسی عدالت میں انہیں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر پوپ نے اپنے اقتدار کی خاطر یورپ کے عوام ومعاشرہ پر اپنی تھیوری مسلط کردی، سوچ وفکر پر پہرے بٹھادیے، ہزار سال پوپ کے مطلق العنان اقتدار کے تاریک دور (Dark) کے بعد علم وسائنس کا دور شروع ہوا، خود چرچ نے استبداد کی طاقت سے اہل فکر ومحققین کو قتل وزندہ جلا کر علم وسائنس کی راہ روکنی چاہی، یورپ نے کرشچینٹی کی اس غلطی (پاپا کریسی) کا صدیوں تک خمیازہ بھگتا، اس علم و مذہب کی جنگ میں اعلیٰ اخلاقی قدریں زوال پذیر ہوکر مغرب میں اخلاقی انارکی کا دور شروع ہوا۔ گذشتہ دو صدیوں میں سازش، سرمایہ ومیڈیا کی بدولت مٹھی بھر شاطر ٹولہ (صیہونی نیوفون) نے یورپ کے معاشرہ کو بے بس کرکے یرغمال بنالیا، اب مغرب کے عوام کو اس گھناؤنی سازش کا احساس ہونے لگا ہے چنانچہ یہ شیطانی ٹولہ (جی-8 وسرمایہ دار ملٹی نیشنل کمپنیاں) جہاں جمع ہوتے ہیں نفرت کی صورت میں عوام کا ردّعمل سامنے آتا ہے، مگر اب تک انسانیت کے سارے وسائل پر قابض ہونے کی وجہ سے یہ ٹولہ کامیاب ہے، مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کا حشر بھی پاپا کریسی کی طرح ہوتا نظر آرہا ہے، بقول ایک مفکر 'تاریخ کا پہیہ اگرچہ آہستہ چلتا ہے، مگر پیستا باریک ہے' لگتا ہے مغرب کا معاشرہ ایک بار پھر بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہوکر بکھراؤ کی طرف چل پڑا ہے، اگر مغرب کے مفکرین واہل دانش نے گلوبل ویلیج معاشرہ کیلئے اقدار و ضابطہ تلاش نہ کیا تو تباہی سامنے کی بات ہے، یہ مسلم علماء واہل دانش کیلئے بھی لمحۂ فکریہ ہے کہ عالمی انسانی بہبودی کی اقدار وضابطہ کے تعین میں شریعت، فقہ اسلامی کا رول کیا ہو؟، اگر ہمارے علماء واہل دانش اس خلاء کے پُر کرنے پر اپنی سوچ وفکر اور علمی کاوشوں کا رخ کرسکیں

اسلام ہی کی نہیں پوری انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

اسلامی قانون کا امتیاز یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر غیر سرکاری قانون ہے جس کے بنانے، مرتب کرنے اور توسیع دینے میں کبھی بھی کسی حکومت، ریاست، طاقت ور طبقہ کی مداخلت نہیں رہی، یہ عوامی علماء کے ذریعہ مرتب ہوا، امام ابوحنیفہؒ کا دماغ عظیم ترین دماغوں میں ایک تھا جن کی تعبیر قانون کو مسلمانوں کا دو تہائی کے قریب حصہ تسلیم کرتا ہے، وہ کسی حکومتی قانون ساز ادارہ کے رکن نہیں ہیں، امام احمد بن حنبلؒ جن کے فقہی اقوال کو آج سعودی عرب میں قانون کی حیثیت حاصل ہے ان کو کسی بادشاہ نے قانون سازی کیلئے مقرر نہیں کیا تھا، اسلام کی پوری تاریخ گواہ ہے اگر کبھی کسی حکمراں یا فوجی ڈکٹیٹر نے طاقت کے زور پر کوئی قانون نافذ کرنا چاہا تو مسلم عوام نے اسے مسترد کر کے علماء، فقہاء و عابدین کے آراء پر عمل کیا، جبکہ دنیا کے تمام قوانین (بشمول کرسچنٹی کے مذہبی عقائد) شہنشاہوں اور طاقت ور حکمرانوں کی مرضی کے مطابق مرتب ہوئے حتی کہ بیقہ کونسلوں کے گہرے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کرسچنٹی کے بنیادی مذہبی عقائد تک تمام قوانین و فیصلے رومن شہنشا کی مرضی سے بنتے رہے نہ کہ کاؤنسلوں کے اراکین (جو صرف مذہبی پادری ہوتے تھے) کی آراء سے دنیا کے تمام قوانین و دساتیر کی تاریخ ہی ہے کہ پہلے ریاست قائم ہوئی پھر اس نے اپنی طاقت سے قانون بنا کر نافذ کیا، مگر اسلام میں قانون پہلے بنا پھر اس کے مطابق ریاست قائم ہوئی۔ اسلام میں بھی ریاست کا جواز صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ قانون شریعت کی حفاظت و نفاذ کرے ورنہ وہ ایک قانونی جواز کھو بیٹھتی ہے۔

آج جبکہ دنیا کا ایک بڑا مسئلہ جرائم کی بہتات و کثرت ہے، ہر سال کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ قتل، چوری ڈکیتی، زنا بالجبر سمیت تمام جرائم دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں، انہیں ختم کرنے، بلکہ کم کرنے کی ہر کوشش ناکام ہے، دنیا کی سب سے ترقی یافتہ، متمدن کہلانے والی قوم امریکہ میں ہر روز، بلکہ ہر گھنٹہ کے جرائم ہوش ربا اعداد و شمار اس بات کی دلیل ہے

کہ مغربی قوانین جرائم کی روک تھام میں بالکل ناکام ہو چکے ہیں، مغرب کے ہر ملک میں جتنی جیلیں تعمیر ہوتی ہیں ناکافی ہو جاتی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب میں عام انسانوں سے زیادہ حقوق مجرموں اور قاتلوں کے ہیں، امریکہ میں ایک شخص سو کے قریب معصوم بچوں کو اغوا کر کے ان سے بدفعلی و بدکاری کر کے انہیں بے دردی سے قتل کرتا ہے جب پکڑا جاتا ہے تو امریکہ کے بہت سے نامور وکیل انسانی ہمدردی میں اسے پھانسی سے بچانے کیلئے میدان میں آجاتے ہیں، جبکہ یہ معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کا قانون شریعت جرائم کو جڑ سے اکھاڑ کر ناپید کر دیتا ہے، ۱۴ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی اسلامی قانون شریعت سے کسی ملک و قوم نے فائدہ اٹھایا تو سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنے میں انتہائی مدد ملی۔ آج سعودی عرب میں اسلامی قانون و شریعت کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ (حدود و قصاص) کے نفاذ کی وجہ سے وہاں جرائم کی تعداد دنیا میں سب سے کم ہے، کیا یہ بات اقوام عالم اور مغرب سمیت ہر تمدن و معاشرہ کیلئے غور و فکر کا تقاضہ نہیں کرتی کہ گلوبل ولیج کا بنیادی تقاضہ ہے کہ رنگ و نسل، قومیت و طبقہ کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر کھلے دل سے دنیا کے تمام قوانین، شرائع، دساتیر کا جائزہ لیا جائے، مطمح نظر صرف جرائم کا خاتمہ اور انسانی بہبود ہو نہ کہ کسی خاص تمدن و آئین کا تسلط۔ آرچ بشپ ڈاکٹر ویلمز کے ریمارکس سے برطانیہ میں مسلمانوں کو شریعت کے حوالے سے شریعت کا صحیح موقف پیش کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا تھا مگر مسلمان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، اس کے برخلاف اسلام دشمن (صہیونی و نیوکون) طاقتور میڈیا کے ذریعہ اسلام کا ہوا کھڑا کر کے اقوام یورپ کو ڈرا دیا، حتیٰ کہ وضاحت کے بہانے ڈاکٹر روون ویلمز کو بھی ایک حد تک پسپائی اختیار کرنی پڑی، لیکن اس بحث سے مثبت نتائج بھی نکلیں گے چنانچہ ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء برطانیہ کے دو روزناموں ''فائنشل ٹائمز اور ٹیلی گراف'' نے خبر دی ہے کہ حکومت سنجیدگی سے سوچ رہی ہے کہ برطانیہ میں بسنے والے مسلم علماء کو اسلامی قانون اور شریعت کی باقاعدہ ٹریننگ

دی جائے، اس مسئلہ میں برطانیہ کی اسلام دشمن اور اسلام کے سخت گیر پالیسیوں کے حامی قوتوں کی پوری کوشش ہوگی کہ شریعت لاء کی تعبیر وتشریح مغربی نکتہ نظر کے مطابق یا دوسرے الفاظ میں مغربی اقدار وسسٹم کو کسوٹی بتا کر کی جائے، لیکن قدرت نے ہمارے لئے بھی بہت سے مواقع پیدا کردئے ہیں کہ ہم اسلام وشریعت کے انسانی سوسائٹی کے متعلق فلاح و بہبود اور فائدہ مند پہلوؤں کو سامنے لائیں جن میں ایک یہ ہے کہ اسلام نے اس دور میں جب ایک مذہب تمدن کے لوگوں کے درمیان دوسرے مذہب کا زندہ رہنا مشکل تھا دوسرے مذاہب وشرائع نے اپنے اپنے مذہبی قوانین کو نہ صرف تسلیم کیا، بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے کی مکمل ضمانت دی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے میثاق مدینہ میں یہودیوں اور مدینہ واطراف کے غیر مسلم بُت پرست قبائل کو پوری آزادی کے ساتھ ان کے قوانین پر چلنے کی آزادی دی، اسی طرح اور خلفاء راشدین نے یروشلم، عراق، وسط ایشیاء کے تمام مفتوحہ ملک میں تمام مذاہب و اقوام کو ان کے قوانین پر چلنے کی آزادی وتحفظ فراہم کیا۔ آج بھی مصر کے قبطی کرشچن ہوں یا عرب دنیا کے یہودی، سب آزادی سے اپنے قانون وشرائع پر عمل پیرا ہیں، اگر یہی حق اکیسویں صدی میں مغرب میں بسنے والی مختلف مذاہب کی کیمونٹیز کو مل جاتا ہے تو اس سے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا، نہ یہاں کے عدالتی سسٹم وقانون کیلئے کوئی خطرہ یا مسئلہ پیدا ہوگا، بلکہ ملک میں بسنے والی تمام کیمونٹیز میں باہمی ہم آہنگی اور قربت کا ذریعہ بنے گا۔ جب آرچ بشپ کے ذریعے برطانوی میڈیا میں یہ بحث چھڑ گئی ہے تو ہماری پوری کوشش ہونی چاہئے کہ بحث کو مثبت رنگ دیں اور شریعت کے انسانیت ومعاشرہ کیلئے نفع بخش پہلوؤں کو سامنے لائیں خاص طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ کریں کہ شریعت صرف چور کا ہاتھ کاٹنے یا زانی کو سنگسار کرنے کا نام نہیں ہے، حدود وقصاص کا نفاذ اسلام میں معاشرہ کی مکمل اصلاح اور معاشرہ کے مکمل طور پر آخری آسمانی تعلیمات پر استوار ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔

☆☆

برطانوی مسلمانوں میں
اسلامی عدالت کا بڑھتا شوق

● وسیم احمد

اسلام کے تمام احکام اور آئینی شقیں خالق کائنات کی طرف سے بنائی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام جزوی وکلی پہلو انسانی فطرت سے بھرپور میل کھاتے ہیں۔ اگر سیاسی، مالی یا وقتی مفاد کے تحت اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے تو عارضی طور پر انسان ایسا کرسکتا ہے اور اسے وقتی طور پر کچھ فائدے بھی نظر آتے ہیں، مگر کبھی نہ کبھی اس پر حقیقت آشکار ضرور ہوتی ہے اور وہ اس بات کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ کامیابی کا صحیح مفہوم دستور اسلامی کو اپنانے میں ہی پنہاں ہے، جیسا کہ پچھلے دنوں برطانیہ کے ایک عیسائی پیشوا نے اسلامی قوانین کی کچھ شقیں برطانوی دستور میں شامل کرنے کی باتیں کیں، اس سے ان کا مقصد برطانوی آئین کو استحکام دینا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی باتوں کو سیاسی رنگ دے کر ماننے سے انکار کردیا گیا اور وہاں کے دستور میں اسلامی قوانین کی شقوں کو جگہ دینے سے معذرت کرلی گئی، مگر سچ تو یہ ہے کہ حکومت نے بیشک اس کے نفاذ سے معذرت کرلی ہو، مگر عوامی سطح پر اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی برطانیہ کے ہزاروں لوگ اسلامی قوانین میں ہی اپنی کامیابی کا راہ تلاش کر رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں تقریبا 1.8 ملین مسلم آباد ہیں، اور یہ تمام لوگ اپنے پرسنل لا کو برطانوی عدالت میں لے جانے کے بجائے اسلامی عدالت کے ذریعے حل کرنے کو

پسند کرتے ہیں۔اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ مذہبی پیشواؤں کی کوششوں سے وہاں جا بجا 'اسلامی عدالتیں' قائم ہیں، جہاں ہر روز بڑی تعداد میں نکاح وطلاق اور میراث کے فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ یہ تمام فیصلے قرآن واحادیث کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صہیب (جنرل سکریٹری برائے تنظیم اسلامی امور) کے مطابق حکومت برطانیہ گرچہ اسلامی جزیات کو برطانوی آئین میں شامل کرنے سے انکار کرتی ہے، مگر یہاں کے مسلم عوام میں بڑھتی دلچسپی کی وجہ سے 10 ایسے اسلامی محکمے قائم ہیں جہاں اسلامی دستور کے مطابق فیصلے سنائے جاتے ہیں۔انھوں نے لوگوں میں اسلامی قوانین کو اپنی زندگی میں نافذ کیے جانے کے تعلق سے کہا کہ اب تک ان اسلامی عدالتوں سے مجموعی طور پر 7000 قضیے جواز دواجی زندگی کے متعلقات میں سے تھے، نپٹائے جا چکے ہیں۔55 سالہ ڈاکٹر صہیب مشہور عالم دین مرحوم عبداللہ بن باز (مفتی عام سعودی عرب) کے شاگرد خاص میں شمار کیے جاتے ہیں۔1966 میں انھیں افریقہ کے لیے مبلغ بنا کر بھیجا گیا تھا جہاں 9 سال قیام کرنے کے بعد وہ لندن واپس آ گئے اور یہاں 1982 میں ایک اسلامی محکمے کی داغ بیل ڈالی۔ان محکموں کے قیام سے ان کا مقصد تھا لوگوں میں پرسنل لا میں احکام اسلامیہ کی پیروی کا مزاج پیدا کرنا۔شاید وہاں کی مسلم آبادی کو بھی کسی ایسے ہی محکمے کا شدت سے انتظار تھا، اسی لیے جب وہاں اسلامی عدالت قائم ہوئی تو ہر شخص نے اس کی پذیرائی کی اور اپنے پرسنل لا کے تعلق سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے یہاں رجوع کرنے لگے۔

لندن کے مختلف حصوں میں 10 محکمے قائم ہیں اور ہر محکمہ اپنا فیصلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہی کرتا ہے، لہٰذا تمام مکاتب فکر کے لوگ حنفی، مالکی، مقلد، غیر مقلد، سنی اور شیعہ کسی کی تفریق نہیں، سبھی آتے ہیں اور فتاوے لے کر اسے اپنی زندگی میں نافذ کرتے اور

سکون قلب حاصل کرتے ہیں۔قضیوں کو سلجھانے میں محکمے کا اپنا مخصوص طریقہ کار ہے۔ جب کبھی طلاق کا معاملہ سامنے آتا ہے تو پہلے طرفین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ان کے ولی کو سامنے بیٹھا کر دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی کی راہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اگر صلح کے تمام راستے بند ہو جائیں اور طرفین میں سے کوئی بھی ملنے پر رضامند نہ ہوں تو پھر موقع اور سیاق وسباق کے مطابق طلاق یا خلع کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔اب تک ان محکموں کے ذریعے تقریباً 50 فیصلے صرف طلاق سے متعلق سنائے جا چکے ہیں۔ڈاکٹر صہیب کے مطابق ان محکموں میں صرف ایسے معاملے ہی درج کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ازدواجی زندگی سے ہو۔اگر معاملہ زنا یا قتل یا پھر چوری وغیرہ کا ہو تو ایسے معاملوں کو یہاں زیر غور نہیں لایا جاتا، بلکہ صاحب معاملہ کو ان قضیوں کو لے کر حکومت کے ذریعے بنائی ہوئی عدالتوں میں لے کر جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔جب یہاں کوئی معاملہ سامنے آتا ہے تو پہلے اس پر بحث کی جاتی ہے، پھر علمائے کرام کے درمیان جو طے ہوتا ہے اس کو تحریری شکل میں صاحب معاملہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جن علمائے کرام کے درمیان بحث کی جاتی ہے ان میں شیخ معزالعرب، ھیثم الحداد الفلسطینی، احمد عویس صومالی اور مولانا ابوسعد شامل ہیں۔اگر مدعی و مدعا علیہ راضی ہوں تو ایجار واستیجار (کرائے کا لین دین) کے معاملے بھی زیر غور لائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر صہیب کے مطابق اگرچہ فیصلہ سنا دیے جانے کے بعد اس کو نافذ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی قانونی حمایت حاصل نہیں ہے، مگر یہاں کے مسلمانوں میں فیصلوں کو ماننے کا جذبہ بھرپور طریقے پر پایا جاتا ہے۔بلکہ وہ دیگر معاملوں میں بھی اپنے مسائل کو یہیں حل کرنا چاہتے ہیں، مگر عدالت پرسنل لا کے علاوہ کسی دیگر موضوع کو قبول نہیں کرتی ہے۔اس وقت مسلمانوں کی 40 فیصد آبادی اسلامی عدالتوں میں اپنی ذاتیات سے متعلقہ معاملے لے کر آتی ہے۔عمر البکر اللبنانی جو اس وقت لندن کے ''کلیۃ الشریعۃ لتعلیم اصول الدین'' سے

وابستہ ہیں، کہتے ہیں کہ 1982 میں اسلامی عدالت کا قیام عمل میں آیا، اس میں عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے 1993 میں اصول دین کی تعلیم وتعلم کے مقصد سے مذکورہ کلیے کی بنیاد رکھی گئی، ساتھ ہی یہاں پرسنل لا کے مسائل بھی حل کیے جاتے ہیں، چنانچہ اب تک یہاں سے 1365 نکاح، 212 طلاق، 74 خلع، 17 دیت، اور 112 بیع وشراء کے تعلق سے فیصلے سنائے جاچکے ہیں۔ یہاں کے مسلم عوام کی دیرینہ خواہش ہے کہ ان کے مسائل اسلامی آئین کے مطابق حل کیے جائیں۔

☆☆

باب ششم

مختلف ایکٹوں کا تعارف

بنگال محمڈن، میرج ایکٹ

قانون (عدالتی) نوٹی فکیشن

۱۴/اگست ۱۹۲۰ء بنگالی محمڈن میرج اینڈ ڈائیورس (شادی وطلاق) ایکٹ کی دفعہ ۳۴ جسے ٹرانسفر پروجیکٹ (عارضی انتظام) ایکٹ کے قاعدہ ۲ (۲) کے ساتھ پڑھا جائے اور اس ایکٹ کی دفعہ ۱۸ اور ۲۴ کے تحت مرتب تمام سابقہ قواعد کو منسوخ کرتے ہوئے حکومت بنگال تمام اضلاع کے لئے مندرجہ ذیل ضوابط مرتب کرتی ہے۔

۱۔ مستقل کمیٹی: انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن کے مشورے سے حکومت بنگال تین سال کی مدت کے لے اس مستقل کمیٹی کے ممبران کا تقرر کرے گی، جو ریزولیوشن مورخہ ۱۴/ اگست ۱۹۲۰ کے ذریعہ تشکیل دی گئی ہو۔

۲۔ مستقل کمیٹی کی ذمہ داریاں: یہ کمیٹی انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن کو مسلمان رجسٹراروں کے تقرر کے سلسلہ میں امیدواروں کے انتخاب میں مشورہ دے گی، نیز دیگر ایسے عام امور میں بھی انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کو مشورہ دے گی جو اسے بھیجے جائیں گے۔

۳۔ امیدواروں کے سلیکشن (انتخاب) کا طریقہ کار (کلکتہ کے علاوہ دیگر اضلاع میں محمڈن رجسٹرار کی آسامی خالی ہونے یا نئی آسامی وضع ہونے پر) رجسٹرار فوری طور پر ایک عارضی تقرری کرے گا، تاکہ اس عہدہ کی ذمہ داریاں ادا کی جاتی رہیں، وہ جگہ خالی

ہونے کی اطلاع انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کوارسال کرے گا اوراس منصب پر مستقل تقرری کے لئے درخواستیں طلب کرے گا۔ انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بھی تقرر کے لئے درخواستیں طلب کرسکتا ہے،لیکن ان موصولہ درخواستوں کووہ متعلقہ ضلع کے رجسٹرارکوارسال کردے گا، رجسٹراران درخواستوں کواپنی سفارشات کے ساتھ انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کوارسال کرے گا ان درخواستوں میں سے چار بہترین امیدوار کے نام بہ لحاظ ترجیح برائے تقرر بھیجے جائیں گے، باقی درخواستوں پر ''ناقابل سفارش'' لکھا جائے گا، یہ درخواستیں موصول ہونے پر انسپکٹر جنرل رجسٹرار اپنے ریمارکس (رائے) کے ساتھ مستقل کمیٹی کو پیش کرے گا، کمیٹی ان درخواستوں پرغور کرکے ہرخالی جگہ پر تقرری کے لئے ترجیحی امیدواروں کے ناموں کی سفارش کے ساتھ اپنے ملاحظات اسے پیش کرے گی۔ یہ سفارشات وہ گورنمنٹ کوارسال کرے گا۔ گورنمنٹ تین ناموں سے کسی ایک کومنتخب کرے گی، کسی خاص سبب کے تحت امیدواروں کی فہرست میں سے کسی دیگرامیدوارکوبھی منتخب کیا جاسکتا ہے۔

(بی) عارضی تقرر کے لئے طریقۂ کار:

عارضی تقرر کے لئے مستقل کمیٹی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں، انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کے ذریعہ ڈسٹرکٹ رجسٹرار کی سفارشات حکومت کوپیش کردی جائیگی اگروہ اسے منظور نہ کرے تو تقرر کے لئے کسی دیگر نام کی سفارش کرسکتی ہے۔ حکومت کے منظور شدہ امیدوارکوایک عارضی لائسنس جاری کردیا جائے گا۔

(سی) کلکتہ میں عارضی یا مستقل اسامیوں کو پر کرنے کا طریقہ کار:

کلکتہ میں عارضی یا مستقل آسامیوں کو پر کرنے کی درخواستیں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن وصول کرے گا۔ عارضی تقرریوں کے لئے وہ موزوں امیدوار کے ناموں کا انتخاب کرکے حکومت کوارسال کرے گا، مستقل آسامیوں (عہدے) پر تقرری کے لئے وہ مستقل کمیٹی

سے مشورہ کرے گا کمیٹی ہرخالی جگہ کے لیے تین ناموں کی سفارش کرے گی وہ ان ناموں کی فہرست کواپنی اور کمیٹی کی رائے کے ساتھ حکومت کوپیش کرے گا۔

۴۔امیدوار کی قابلیت:

محمڈن رجسٹرار کے عہدے پر منتخب کئے جانے والے امیدوارکوعربی زبان اورمحمڈن لا (شریعت) کے شادی وطلاق کی بابت بخوبی علم ہونا چاہئے اوراسے اچھے اخلاقی کردار کا حامل ہونا چاہئے۔

وہ امیدوار جوتقرر کے لئے مستقل کمیٹی کے ممبران سے رابطہ کرے گا خود یا کسی دیگر ذریعہ سے اسے اس عہدہ پر تقرر کے لئے نااہل سمجھا جائے گا۔

(بی) مقامی امیدواروں کوترجیح دی جائے گی:

امیدواروں کے انتخاب میں رجسٹرار انسپکٹر جنرل رجسٹریشن اور مستقل کمیٹی جہاں تک ممکن ہواچھے کردار کے موزوں اور بہتر قابلیت رکھنے والے مقامی امیدواروں کوترجیح دے گی۔

درخواست فارم:

امیدوارکومندرجہ ذیل فارم کی خانہ پری کرکے درخواست دینی چاہئے۔

اسی کے ساتھ اچھے اخلاقی کردار کے حامل ہونے کا سرٹیفکٹ اورکسی مدرسہ سے تعلیمی قابلیت کا سرٹیفکٹ بھی منسلک کرنا چاہئے۔ امیدوار کو یہ سرٹیفکٹ بھی پیش کرنا ہوگا کہ وہ عربی زبان اورنکاح وطلاق سے متعلق محمڈن لا سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔اس سرٹیفکٹ پر دومسلمانوں کے دستخط ہونے چاہئیں۔

۱۔امیدوار کا نام اوردستخط۔درخواست دینے کی تاریخ اور پورا پتا

۲۔عمر.....

۳۔امیدوار کا پیشہ یا موجودہ مشغلہ۔موجودہ تنخواہ یا پنشن۔

۴۔والد کا نام اور پیشہ.....

۵۔امیدوار کے خاندان کی موجودہ رہائش

۶۔محمڈن رجسٹری آفس اور صدر اسٹیشن سے امیدوار کی رہائش گاہ کا فاصلہ۔

۷۔ کیا امیدوار کے پاس دفتر کے لئے تعمیر شدہ مکان ہے؟

۸۔اگر پہلے سرکاری ملازمت کی ہے تو سابقہ ملازمت کی تفصیل۔اگر ملازمت سے برخاست ہوا ہے تو اس کی کیفیت۔

۹۔ان اشخاص کے نام اور پتے جنہوں نے امیدوار کی سفارش کی ہے۔

۱۰۔ کیا امیدوار عربی، فارسی، اردو، بنگالی اور انگریزی سے واقف ہے؟

۱۱۔ کیا امیدوار محمڈن لاء سے واقفیت رکھتا ہے اور کیا کسی پرائیوٹ، سرکاری مدرسہ سے سند حاصل کی ہے (مدرسہ نام لکھئے)۔

۱۸۷۶ء کا بنگال ایکٹ 1:

دی محمڈن ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۰ء تک ترمیم شدہ اینڈ ٹورس رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۷۶ء۔

مسلمانوں کی شادیوں اور طلاق کے لازمی رجسٹریشن کا ایکٹ ۱۹/جنوری ۱۸۷۶ء۔

چونکہ یہ قرین مصلحت ہے کہ مسلمانوں میں شادی اور طلاق کے معاملات رضا کارانہ اندراج کرایا جائے، مندرجہ ذیل ضوابط مرتب کیے جاتے ہیں۔

مقامی دائرہ نفاذ: اس ایکٹ کا آغاز اور نفاذ، بنگال بہار اور اڑیسہ کے اضلاع میں ہوگا۔یہاں کی صوبائی حکومتیں ایک حکم کے ذریعہ جسے سرکاری گزٹ میں شائع کیا جائے گا اس کا نفاذ کریں گی اور اس حکم کے اقرار کی تاریخ اس کا نفاذ عمل میں آئے گا۔

تشریح:-اس ایکٹ میں جب تک کہ اس کے برخلاف مذکور نہ ہو۔

محمڈن رجسٹرار: سے مراد وہ شخص ہوگا جسے اس ایکٹ کے تحت شادی اور طلاق کے رجسٹریشن کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن: انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن اور رجسٹرار سے بالترتیب افسران مراد ہوں گے جنہیں اس ایکٹ کے تحت ان عہدوں پر مقرر کیا جائے یا کسی دوسرے ایکٹ کے تحت جو فی الوقت نافذ العمل ہو۔

محمڈن میرج اینڈ ڈائیورس ایکٹ ۱۸۷۶ء: (بنگال ایکٹ ۱)

سیکشن (۳-تا-۶):

۱۔ضلع: ضلع سے مراد وہ علاقہ ہوگا جسے انڈین رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۰۸ء کی دفعہ ۱۶ کے تحت تشکیل دیا گیا ہو۔

۲۔پردہ نشین: پردہ نشین سے مراد وہ عورت ہوگی جو اپنے ملک کے رسوم و رواج کے مطابق کسی عوامی دفتر میں پیش ہونے سے معقول طور پر اعتراض کرے۔

۳۔ ریاستی حکومت کے لئے از روئے قانون یہ درست ہوگا کہ وہ کسی محمڈن (مسلمان) کو کسی خاص علاقے میں ایسی شادیوں اور طلاق کے رجسٹریشن (اندراج) کے لئے لائسینس دے جس کے اندراج کے لئے اسے درخواست دی گئی ہو۔اس کے ساتھ ریاستی سرکار کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ایسے لائسنس کو معطل یا منسوخ کردے۔

۴۔ ہر محمڈن رجسٹرار ایک سیل (مہر) استعمال کرے گا جس میں فارسی میں یہ عبارت درج ہوگی محمڈن رجسٹرار برائے (علاقہ کا نام)

۵۔ ریاستی حکومت ہر محمڈن رجسٹرار کو مذکورہ بالا مہر اور دیگر کتابیں فراہم کرے گی جو اس ایکٹ کے تحت مطلوب ہوں۔

ان کتابوں کے صفحات پر ترتیب سے نمبر چھاپے جائیں گے اور یہ کتابیں جاری

کرنے والا افسر صفحوں کی تعداد کا سرٹیفکٹ کتاب کے ٹائٹل صفحہ پر دے گا۔

۶۔ محمڈن رجسٹرار مندرجہ ذیل رجسٹر رکھے گا۔

رجسٹر ۱ شادیوں کا رجسٹر بشمول اس عورت کی شادی جسے طلاق تفویض دیدی گئی ہو اس کا اندراج فارم سیڈول ا میں کیا جائے گا جو اس ایکٹ میں شامل ہے۔

رجسٹر ۲ طلاقوں کے اندراج کا رجسٹر اس میں فارم بی (ایکٹ مذکور) میں ان طلاقوں کا اندراج کیا جائے جو خلع (طلاق تفویض) کے تحت نہیں آتیں۔

دی بنگالی محمڈن میرج اینڈ ڈائیورس رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۷۲ء

دفعہ ۷ اور ۸:

رجسٹر iii وہ طلاقیں جو خلع کے طور پر جانی جاتی ہیں یہ فارم سی ایکٹ مذکور میں درج کی جائیں گی، رجسٹرار ۴ ایسی طلاقوں کے اندراج کا رجسٹر میں وہ طلاقیں درج کی جائیں گی جو طلاق تفویض کہلاتی ہیں، انہیں ایکٹ کے فارم ڈی میں درج کیا جائے گا۔

۷۔ ان جملہ رجسٹروں میں جو اندراجات کئے جائیں گے ان پر طریقِ کار کے مطابق ترتیب وار نمبر اندراج دیا جائے گا یہ اندراج سال شروع ہونے سے سال کے اختتام تک جاری رہیں گے، نئے سال میں نمبر اندراج از سرِ نو شروع کیا جائے گا۔

۸۔ شادی کے رجسٹریشن کی درخواست زبانی طور پر محمڈن رجسٹرار کو دی جائے گی جو حسب ذیل ہوگی، اگر درخواست شادی کے اندراج کے لئے ہے اس میں اس عورت کی شادی بھی شامل ہے جسے طلاق تفویض دی جا چکی ہے۔

یہ درخواست فریقین، یعنی زن و شوہر کے ذریعہ مشترکہ طور پر دی جائے گی، لیکن اگر زن و شوہر نابالغ ہوں تو یہ درخواست ان کے متعلقہ ولی (سرپرست) کے ذریعہ دی جائے گی۔ مزید یہ کہ اگر عورت پردہ نشین ہے تو یہ درخواست اس کے با اختیار وکیل کے ذریعہ

پیش کی جائے گی۔

اگر یہ درخواست طلاق کے اندراج کے لئے، یعنی خلع یا طلاق تفویض کے تحت نہیں ہے اور اس شخص نے پیش کی ہے جس نے طلاق دی ہے۔

اگر یہ خلع کے اندراج کی درخواست ہے جسے متعلقہ فریقین نے پیش کیا ہے، بشرطیکہ اگر عورت پردہ نشین ہے تو اس کا با اختیار وکیل یہ درخواست پیش کر سکتا ہے۔

سکشن ۹ اور ۱۹ اے:

۹۔ محمڈن رجسٹرار کو کسی شادی یا طلاق کے اندراج کے لئے اس کے وقوع پذیر ہونے سے ایک ماہ کے اندر درخواست دی جائے گی اور اس کے ساتھ وہ فیس بھی ادا کی جائے گی جو اس ایکٹ میں مقرر کی گئی ہے تو محمڈن رجسٹرار

(اے) اسی بات کی جانچ کر کے خود کو مطمئن کرے گا کہ آیا وہ شادی یا طلاق واقعتاً عمل میں آئی تھی جس کے اندراج کے لئے فریقین نے درخواست دی ہے۔

(بی) ان افراد کی شناخت کی بابت خود کو مطمئن کرے گا جو شادی یا طلاق کے اندراج کے لئے اس کے سامنے پیش ہوئے ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں شادی یا طلاق عمل میں آ چکی ہے۔

(سی) اگر کوئی شخص مرد/عورت کی جانب سے بطور نمائندہ پیش ہو، خواہ بطور ولی (سرپرست) یا بطور وکیل پیش ہو تو محمڈن رجسٹرار اس امر کے متعلق خود کو مطمئن کرے گا کہ آیا ان لوگوں کو اس حیثیت میں پیش ہونے کا حق حاصل ہے۔

اگر محمڈن رجسٹرار مذکورہ بالا امور کے بارے میں مطمئن ہے تو اس شادی یا طلاق کا اندراج متعلقہ رجسٹر میں کرے گا۔

اس شرط کے ساتھ کہ کوئی بھی اندراج محض اس شخص کی موجودگی میں ہی کیا جائے گا،

جواس ایکٹ کی دفعہ ۱۱ کے تحت رجسٹر میں اندراج کے طور پر دستخط کرسکتا ہے۔

(۱۹اے) محمڈن رجسٹرار مندرجہ ذیل کا اندراج نہیں کرے گا۔

اے) کسی ایسی عورت کی شادی جسے طلاق تفویض دی جا چکی ہو۔

I) ماسوائے اس کے کہ کوئی ایسی دستاویز پیش کرے جو انڈین رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۰۸ء کے تحت رجسٹر شدہ ہو یا کسی دیگر ایکٹ کے تحت جو اس وقت اس قسم کے رجسٹریشن کے لئے نافذ العمل ہو وہ دستاویز جج کے فیصلہ کی مصدقہ نقل داخل کرے۔ جس میں کیا گیا ہو کہ طلاق واقع ہو چکی ہے۔ یا ایسی دستاویز جس سے ظاہر ہو کہ طلاق کا اندراج رجسٹرار برائے اندراج طلاق تفویض (رجسٹرار ۴) میں کیا جا چکا ہے۔

II) اس ایکٹ کی دفعہ ۹ کے تحت مندرجات کے باوجود سابقہ شوہر کے طلاق دینے کی تاریخ ۶ ماہ کے اندر

III) سابقہ شوہر کو رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعہ ایک ماہ کا نوٹس دیئے بغیر جو اس فارم میں دیا جائے گا جس میں اس دفعہ ۲۴ کے تحت تفصیلات مطلوب ہیں۔

(بی) وہ طلاق جسے طلاق تفویض کے طور پر جانا جاتا ہے جب تک کوئی دستاویز پیش نہ کی جائے انڈین رجسٹرار ایکٹ ۱۹۰۸ء کے تحت اندراج شدہ ہو یا کسی دیگر ایکٹ کے تحت جو اس وقت نافذ العمل تھا اور اس کے مطابق شوہر نے طلاق کا اختیار بیوی کو دیدیا ہو۔ یا شادی رجسٹر (رجسٹر ۱) میں اندراج کی مصدقہ نقل جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قسم کا اختیار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ بنگال محمڈن میرج اینڈ دائیورس رجسٹریشن ایکٹ ترمیمی ایکٹ ۱۹۳۴ء کی دفعہ ۳ کے محمڈن رجسٹرار گریجوئٹی (عطیہ) لے سکتا ہے۔

۱۱۔ اس ایکٹ کے تحت رکھے گئے ہر رجسٹر کے ہر اندراج میں مندرجہ ذیل انداز میں دستخط کئے جائیں گے۔ اگر یہ شادی کا اندراج ہے جو اس ایکٹ کے تحت فارم ا میں کیا

گیا ہے۔

فریقین زن و شوہر دونوں کو اس پر دستخط کرنے ہوں گے۔ لیکن اگر دونوں یا ان میں سے ایک نابالغ ہو تو اس کے متعلقہ سرپرست کو اس پر دستخط کرنے ہوں گے، اگر عورت پردہ نشین ہے تو اس کا بااختیار وکیل اس کی جانب سے دستخط کرسکتا ہے۔

۲۔ دو گواہ جو شادی کے وقت وہاں موجود تھے۔

۳۔ ایسے کیس میں جہاں عورت کی نمائندگی کوئی وکیل کر رہا ہے۔ دو گواہوں کے دستخط ہوں گے جو یہ تصدیق کریں گے کہ وکیل مذکور کو باقاعدہ مختار بنایا گیا ہے کہ وہ اس عورت کی نمائندگی کرے۔

۴۔ محمڈن رجسٹریشن کے دستخط

اگر یہ کیس ایسی طلاق کا ہے جسے ضلع کہا جاتا ہے تو اس کا اندراج ایکٹ میں مذکور فارم (سی) میں ہوگا،

۱۔ دونوں فریقین دستخط کریں گے۔ لیکن اگر عورت پردہ نشین ہے تو اس کی جانب سے باضابطہ طور پر مقرر کردہ وکیل دستخط کی شناخت کرے گا۔

۲۔ وہ گواہ جو اس شخص کی شناخت کرے گا۔

۳۔ اس شخص کے جو اس عورت کی شناخت کرے گا۔

۴۔ اگر یہ درخواست عورت کی طرف سے اس کے وکیل نے داخل کی ہے تو گواہوں کے دستخط جو اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وکیل مذکور کو باقاعدہ مختار بنایا گیا ہے کہ وہ اس عورت کی نمائندگی کرے۔

۵۔ اگر مرد مسلک شیعہ سے تعلق رکھتا ہے تو دو گواہوں کے دستخط کہ طلاق دی گئی۔

۶۔ محمڈن رجسٹرار کی دستخط

اگر یہ اندراج اس طلاق کا ہے جسے طلاق تفویض کہتے ہیں تو اس رجسٹرار کے فارم

ڈی میں درج ہوگا جو ایکٹ میں مذکور ہے۔

۱۔اس عورت کے دستخط جس نے طلاق دی۔

۲۔اس شخص کے دستخط جو اس عورت کی شناخت کرے گا جس نے طلاق دی۔

۳۔اگر عورت کا تعلق مسلک شیعہ سے ہے تو دو گواہوں کے دستخط کہ طلاق دی گئی۔

۴۔ محمڈن رجسٹرار کے دستخط

۱۲۔شادی یا طلاق کے اندراج کے بعد محمڈن رجسٹرار اندراج کی ایک ایک مصدقہ نقل فریقین کو دے گا اس مصدقہ نقل کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔

۱۳۔ہر ایک دفتر میں جہاں مذکورہ بالا رجسٹر رکھے جائیں گے وہاں ان رجسٹروں کے اندراجات کی فہرست مرتب کی جائے گی، اس فہرست میں جہاں تک ممکن ہو تمام اندراجات نقل کئے جائیں گے یہ اندراجات محمڈن رجسٹرار کی جانب سے متعلقہ رجسٹر میں اندراج کے فوراً بعد کئے جائیں گے۔

۱۴۔اس فہرست میں شادی یا طلاق کے اندراج کی بابت فریقین کے نام ولدیت مقام اور رجسٹریشن کی تاریخ درج کی جائے گی۔

۱۵۔مقررہ فیس کی پیشگی ادائیگی پر ان فہرستوں کو جو رجسٹرار یا ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے وہاں دستیاب ہوں گی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کے مطابق رکھی جائیں گی ہر شخص کو ان کے مطالعہ کا حق حاصل ہوگا جو ان کے مطالعہ کے لئے درخواست دے اور ہر رجسٹر کے اندراجات کی مصدقہ نقول ان تمام درخواست کنندگان کو دی جائیگی جو ایسی نقول کے لئے درخواست دیں۔

۱۶۔ ہر ایک ڈسٹرکٹ رجسٹرار اور محمڈن رجسٹرار کو یہ اختیار ہوگا کہ اس ایکٹ کے مقاصد کی بجا آوری کے لئے مندرجہ ذیل فیس مقرر کر سکتے ہیں۔

کسی رجسٹر یا فہرست کے معائنہ اور درخواست کے لئے چار آنے فیس ادا کرنی ہوگی۔

ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے تحت مذکور پہلی کاپی کے علاوہ کسی دوسرے انداج کی مصدقہ نقل کے لئے فیس ایک روپیہ ہوگی۔

۱۷۔ ہر محمڈن رجسٹرار اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی اس ضلع کے رجسٹرار کی نگرانی اور کنٹرول کے تحت کرے گا جس ضلع میں وہ تعینات ہے اور اس کا دفتر ہے۔

کلکتہ میں تعینات ہر محمڈن رجسٹرار اپنے فرائض منصبی انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کی نگرانی اور ماتحتی میں انجام دے گا۔

ہر رجسٹرار اور کلکتہ میں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ (شکایت موصول ہونے پر یا اس کے علاوہ بھی) محمڈن رجسٹرار کی غلطی پر ایسے مناسب احکام جاری کر سکتا ہے جو اس ایکٹ کی مندرجات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

۱۸۔انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کو تمام محمڈن رجسٹرار پر عام نگرانی کا اختیار ہوگا اور اسے یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ محمڈن رجسٹرار کی ہدایت اور دفتری امور سے متعلق ایسے قواعد مرتب کرے جو اس ایکٹ کے مقاصد سے مطابقت رکھتے ہوں۔

۱۹۔ آخری سے پہلی دفعہ کے مطابق جو قواعد مرتب کئے جائیں گے انہیں برائے منظوری ریاستی حکومت کو پیش کیا جائے گا، حکومت کی منظوری حاصل ہونے کے بعد ان ضوابط کو وہی حیثیت حاصل ہوگی جو ایکٹ کی دیگر مندرجات کو حاصل ہے۔

۲۰۔ ہر محمڈن رجسٹرار جو کسی شادی یا طلاق کے اندراج سے انکار کرے وہ اس انکار کی وجوہات کو اس رجسٹر میں درج کرے گا جو اس مقصد کے لئے مخصوص ہوگا، نیز وہ اس بارے میں آڈر بھی جاری کرے گا۔

۲۱۔محمڈن رجسٹرار کی جانب سے شادی یا طلاق کا اندراج نہ کرنے کے حکم کے خلاف اپیل رجسٹرار کے حضور کی جائے گی جس کے ماتحت وہ محمڈن رجسٹرار کام کر رہا ہے۔ یہ اپیل انکار کا حکم جاری ہونے کی تاریخ سے ۲۰ دن کے اندر داخل کی جا سکتی ہے اگر رجسٹرار محمڈن

رجسٹرار کے حکم کو کالعدم قرار دے یا اسے تبدیل کر دے تو اس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۲۲۔ ہر ماہ کے اختتام پر محمڈن رجسٹرار اس رجسٹر میں جو ایکٹ کی دفعہ ۶ کے تحت مخصوص کیا گیا ہے۔ کے اندراجات کی تصدیق کرے گا، نیز ان فہرستوں (انڈکس) کے اندراجات کی بھی تصدیق کرے گا جو ایکٹ دفعہ ۱۳ اور ۱۴ کے تحت مرتب کی گئی ہیں، اس کے بعد یہ مصدقہ ریکارڈ اس رجسٹرار کو ارسال کر دیا جائے گا جس کے زیر اختیار علاقے میں وہ محمڈن رجسٹرار تعینات ہے۔ یہ رپورٹیں موصول ہونے پر رجسٹرار انہیں اپنے ریکارڈ میں رکھے گا۔

۲۳۔ ہر محمڈن رجسٹرار یا لائسنس یافتہ رجسٹرار ایسے تمام رجسٹرار بحفاظت اپنی تحویل میں رکھے گا جب تک وہ بھر نہ جائیں اس کے بعد وہ انہیں متعلقہ ڈسٹرکٹ رجسٹرار کے دفتر میں بحفاظت ریکارڈ میں رکھنے کے لئے بھیج دے گا۔ یا اس شخص کو بھیجے گا جس کے لئے ڈسٹرکٹ رجسٹرار ہدایت جاری کرے۔

۲۴۔ ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً ایسے قواعد مرتب کر سکتی ہے جنہیں وہ مناسب سمجھے بشرطیکہ یہ قواعد ایکٹ مندرجات سے متصادم نہ ہوں۔

(اے) ایسے افراد کی قابلیت کی تعیین کرنے کے لئے جنہیں ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت اس کام کے لئے لائسنس جاری کیا جائے گا۔

(اے اے) ایکٹ کی دفعہ (۹) کے تحت محمڈن رجسٹرار کو ادا کی جانے والے فیس مقرر کرنا۔

(اے اے اے) ایکٹ کی دفعہ (۹) اے کے تحت مطلوب نوٹس اور فارم کے لئے تفصیلات مرتب کرنا۔

(بی) محمڈن رجسٹرار کو شادی کی تقریبات میں جانے اور اس حاضری کے لئے معاوضہ کی رقم کی تعیین کرنا۔

(سی) محمڈن رجسٹرار اور رجسٹرار کی جانب سے نقول فراہم کرنے کا ضابطہ مرتب کرنا۔

(ڈی) محمڈن رجسٹرار کو سیل (مہر) فارم اسٹیشنری رجسٹر اور دیگر متعلقہ اشیاء جو حکومت کی طرف سے انہیں مہیا کی جاتی ہوں ان کے لئے رقم کی ادائیگی کا ضابطہ بنانا۔

(ای) رجسٹرار اور محمڈن رجسٹرار کی جانب سے ایکٹ کے تحت عائد کردہ۔ فیس کے اطلاق کا ضابطہ بنانا۔

(ایف) دیگر ایسے ضوابط اور قواعد بنانا جو اس ایکٹ کے مقاصد کی بجا آوری کے لئے ریاستی حکومت کے خیال میں ضروری ہیں۔

۲۵۔ ہر محمڈن رجسٹرار سرکاری ملازم ہوگا اور اس ایکٹ کے تحت اس کے فرائض منصبی کو سرکاری ڈیوٹی سمجھا جائے گا۔

۲۶۔ اس ایکٹ میں مذکور کسی بھی ضابطے کی اس طرح تعبیر نہیں کی جائے گی کہ:

(اے) مسلمانوں کی کسی بھی شادی یا طلاق کے معاملے کو جو بصورت دیگر جائز ہو محض اس وجہ سے ناجائز نہیں قرار دیا جائے گا کہ اس کا اندراج نہیں کرایا گیا۔

(بی) کسی ایسی شادی کو جو بصورت دیگر جائز نہ ہو محض اس بنیاد پر ناجائز قرار نہیں دیا جائے گا کہ اس کا اندراج نہیں کرایا گیا۔

(سی) محمڈن رجسٹرار کی کسی شادی کی تقریب میں شرکت کو اس وقت تک باضابطہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ اسے دونوں متعلقہ فریقین (لڑکی اور لڑکے والوں) کی جانب سے مدعو نہ کیا جائے۔

(ڈی) کسی بھی شخص کو جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اسے اس ایکٹ کی مندرجات کے تحت دستخط کرنے کی بجائے روشنائی سے نشان (انگوٹھا) لگانے سے منع نہیں کیا جائے گا۔

شیڈول (ضمیمہ):

(دیکھئے ایکٹ مذکور کی دفعہ ۶ اور ۱۱)

فارم اے رجسٹر ۱:

ایکٹ کی دفعہ ۶ کے تحت مطلوب مسلمانوں کی شادی اور طلاق کے رضا کارانہ اندراج کے لئے رجسٹرار شادی (اس میں اس عورت کی شادی بھی شامل ہے جسے ایسی طلاق دی گئی ہے جسے طلاق تفویض کیا جاتا ہے)۔

۱۔ نمبر شمار (بہ لحاظ ترتیب)

۲۔ دولہا اور اس کے والد کا نام۔

۳۔ دلہن کا نام اور اس کے والد کا نام مع پتا رہائش گاہ۔

۴۔ کیا دلہن معمر کنواری ہے۔ بیوہ ہے مطلقہ ہے جسے اس کے سابقہ شوہر نے طلاق دیدی ہو یا ایسی طلاق دی گئی ہے جسے طلاق تفویض کہا جاتا ہے اور کیا وہ بالغ یا نابالغ؟

۵۔ اگر دلہن کو طلاق تفویض دی گی ہے تو اس کے ثبوت دستاویز پیش کی جائے۔

۶۔ اگر دلہن کو طلاق تفویض دی گئی تھی تو اس کی تاریخ اور مقام جہاں اسے رجسٹر کرایا گیا تھا اور سابق شوہر کا نام اور پتا۔

۸۔ اگر دلہن نابالغ ہے تو اس کے سرپرست (ولی) کا نام اس کے والد کا نام اور اس کا پتا اور دولھا سے اس کا کیا رشتہ ہے جس کے تحت وہ اس کا سرپرست بنا ہے۔

۹۔ دلہن کے وکیل کا نام مع ولدیت اور اس کا پتا اور بالخصوص یہ کہ اس کا دلہن سے کیا رشتہ ہے جس کے تحت وہ اس کا وکیل بنا ہے۔

۱۰۔ ان گواہوں کے نام مع ولدیت اور پتا جو اس بات کی شہادت دیں کہ دلہن کے وکیل باضابطہ مقرر کیا گیا ہے نیز یہ کہ دلہن سے ان کا کیا رشتہ ہے جس کے تحت وہ گواہ بنے ہیں۔

۱۱۔ شادی ہونے کی تاریخ انگریزی کیلنڈر اور ضلع میں مروجہ کیلنڈر کے مطابق۔

۱۲۔ مہر کی رقم۔

۱۳۔ مہر کی کتنی رقم معجّل (فوری ادائیگی) اور کتنی موجل (موخر کردہ) ہے۔

۱۴۔ کیا مہر کی کچھ رقم موقع پر ادا کی گئی اگر ہاں تو کتنی رقم؟

۱۵۔ کیا مہر کی پوری رقم یا اس کے کچھ حصہ کے عوض کوئی جائیداد (اثاثہ) دیا گیا اگر ہاں تو اس کی تفصیل۔

۱۶۔ خاص شرائط اگر کوئی ہوں۔

۱۷۔ اس گاؤں قصبہ پولیس اسٹیشن اور ضلع کا نام جہاں شادی عمل میں آئی۔

۱۸۔ اس شخص کا نام مع ولدیت جس کے گھر شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔

۱۹۔ کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا اختیار دیا ہے؟

۲۰۔ رجسٹریشن کی تاریخ (انگریزی کیلنڈر کے مطابق)

فارم بی (رجسٹر ۲):

رجسٹر برائے اندراج طلاق، سوائے اس طلاق کے جسے خلع یا طلاق تفویض کہا جاتا ہے۔ ایکٹ کی دفعہ ۶ برائے رضا کارانہ اندراج شادی وطلاق مسلمانان۔

۱۔ نمبر شمار۔

۲۔ شوہر کا نام مع ولدیت اور پتا۔

۳۔ بیوی کا نام۔

۴۔ طلاق کی تاریخ انگریزی اور ضلع میں مروج کیلنڈر کے مطابق۔

۵۔ طلاق کی تفصیل۔

۶۔ طلاق کس طریقے سے دی گئی۔

۷۔ اس موضع، قصبہ، ضلع اور پولیس اسٹیشن کا نام جہاں طلاق دی گئی۔

۸۔ اس شخص کا نام اور ولدیت جس کے گھر میں طلاق دی گئی۔

۹۔ طلاق کا گواہ اگر کوئی ہو مع ولدیت اور ہر ایک کا رہائشی پتا۔

۱۰۔ اس شخص کا نام اور پتا مع ولدیت جس نے محمڈن رجسٹرار کے روبرو شوہر کی شناخت کی۔

۱۱۔ اندراج کی تاریخ۔انگریزی کیلنڈر کے مطابق۔

فارم (سی) رجسٹر ۳:

رجسٹر برائے اندراج طلاق جسے خلع کہا جاتا ہے، مسلمانوں کے رضا کارانہ اندراج شادی وطلاق ایکٹ کی دفعہ ۶ کے تحت۔

۱۔نمبر شمار بہ لحاظ ترتیب۔

۲۔شوہر کا نام اور پتا مع ولدیت۔

۳۔بیوی کا نام اور پتا مع ولدیت۔

۴۔خلع کی تاریخ انگریزی اور مقامی کیلنڈر کے مطابق۔

۵۔مہر کی رقم۔

۶۔کیا بیوی نے محمڈن رجسٹرار کے روبرو خلع کا اعتراف کیا۔

۷۔ اس شخص کا نام اور پتا مع ولدیت جس نے محمڈن رجسٹرار کے روبرو اس عورت کی شناخت کی اور اس عورت سے اس کی کیا رشتہ داری ہے؟

۸۔ اگر خلع کا اعتراف محمڈن رجسٹرار کے روبرو عورت کے وکیل نے کیا ہے تو اس وکیل کا نام مع ولدیت اور پتا بالخصوص یہ کہ اس وکیل کی اس عورت سے کیا رشتہ دای ہے۔

۹۔ ان دو گواہوں کے نام مع ولدیت اور پتے جنہیں زوجہ کے وکیل نے بااختیار کیا ہو۔

۱۰۔اس موضع، قصبہ، ضلع اور پولس اسٹیشن کا نام جہاں خلع کی کارروائی عمل میں آئی۔

۱۱۔اس شخص کا نام مع پتا اور ولدیت جس کے گھر میں ضلع کی کارروائی کی گئی۔

۱۲۔گواہوں کے نام مع ولدیت اور پتے جن کی موجودگی میں طلاق دی گئی۔

۱۳۔اس شخص کا نام جس نے شوہر کی شناخت کی اس شخص کی ولدیت اور پتا۔

۱۴۔رجسٹریشن اندراج کی تاریخ انگریزی کیلنڈر کے مطابق۔

فام ڈی رجسٹر ۴:

رجسٹر برائے اندراج طلاق (جسے طلاق تفویض کیا جاتا ہے) مسلمانوں کی شادی اور طلاق کے رضا کارانہ اندراج کی بابت ایکٹ کی دفعہ ۶ کے مطابق۔

۱۔نمبر شمار (ترتیب وار)۔

۲۔شوہر کا نام مع ولدیت اور دونوں کے پتے۔

۳۔زوجہ کا نام مع ولدیت اور دونوں کے پتے۔

۴۔ اس شخص کا نام جس نے محمڈن رجسٹرار کے روبرو اس عورت کی شناخت کی اس شخص کی ولدیت اور پتا اس تفصیل کے ساتھ کہ اس کی اس عورت سے کیا رشتہ داری ہے؟

۵۔ اِن دستاویزات کی تفصیل جن سے یہ ثابت ہو کہ شوہر نے اپنی زوجہ کو طلاق کا حق منتقل کیا۔

۶۔ طلاق تفویض دئے جانے کی تاریخ انگریزی اور مقامی کیلنڈر کے مطابق۔

۷۔ مہر کی رقم۔

۸۔اس موضع، قصبہ، پولس اسٹیشن اور ضلع کا نام جہاں طلاق دی گئی۔

۹۔اس شخص کا نام مع ولدیت اور پتا جس کے گھر میں طلاق دی گئی۔

۱۰۔گواہوں کے نام اگر کوئی ہوں مع ولدیت اور پتے جن کی موجودگی میں طلاق دی گئی۔

۱۱۔رجسٹریشن (اندراج) کی تاریخ انگریزی کیلنڈر کے حساب سے۔

☆☆

شریعت ایکٹ 1937

علمائے کرام اور عام مسلمانوں کے مطالبہ اور کوشش کی بناء پر 1937 میں مسلم پرسنل لا (شریعت اپلی کشن ایکٹ 1937 نافذ کیا گیا تھا۔ اور آج تک نافذ ہے۔ اسی ایکٹ کو مختصر طور پر شریعت ایکٹ 1937 کہتے ہیں، یہ چند دفعات پر مشتمل ایک مختصر ایکٹ ہے جس کے متن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(1) وراثت، نکاح، تنسیخ نکاح بشمول طلاق، ہبہ اور اوقاف کے معاملات میں عام مسلمان لازمی طور پر مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے اور ان معاملات سے متعلق ایسے تمام مقامی رسم ورواج جو شریعت سے متصادم ہوں قطعاً باطل ہوں گے۔

(2) وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق اختیاری ہوگا۔ اگر کوئی عاقل وبالغ شخص شریعت ایکٹ میں مذکورہ طریقہ پر ان معاملات میں بھی مسلم پرسنل لا کو قبول کر لیتا ہے تو وہ خود، اس کی نابالغ اولاد اور ان کے بعد کی پشتیں ان دونوں معاملات میں شرعی قوانین کے تابع ہوں گی۔

(3) زرعی آراضی کی وراثت سے متعلق مقدمات پر مسلم پرسنل لا کا اطلاق نہ ہوگا۔

موپلا وراثت ایکٹ 1981ء اور موپلا وصیت ایکٹ 1928۔ جنوبی ہند کے موپلا مسلمان، جن کی بھاری اکثریت ریاست کیرالا کے علاقہ مالابار میں رہتی ہے۔ اس ملک میں اسلام کے قدیم ترین نام لیواؤں میں سے ہیں اور عصر حاضر میں ایک بااثر اور محترم حیثیت کے مالک ہیں۔ اس طبقے سے متعلق دو خصوصی قوانین ہیں جو 1918 اور

1928 میں پاس ہوئے تھے ان کی رو سے وراثت اور وصیت کے تمام معاملات میں موپلا مسلمان لازمی طور پر اسلامی قوانین کے تابع ہیں۔ موپلا وراثت ایکٹ 1918 میں اور موپلا وصیت ایکٹ 1928 میں پاس ہوا تھا۔

میمن ایکٹ 1938:

مسلمانوں کے میمن طبقے کے لئے 1938 میں ایک خصوصی قانون پاس ہوا تھا جو وصیت کو اسلامی قوانین کے لئے لازمی اطلاق سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔

وصیت اور تبنیت کے معاملات:

موجودہ قانونی کیفیت یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر موپلا یا میمن ہے تب تو وہ لازمی طور پر وصیت کے شرعی مسائل کا پابند ہوگا، ورنہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ ان پر عمل کرے یا مقامی رواج کا پابند رہے۔ وصیت کے متعلق اسلام میں ایک مکمل قانون موجود ہے جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی جائداد کے ایک تہائی سے زیادہ حصے کی وصیت کرنے کا مجاز نہیں، تاکہ وراثت کے شرعی احکام نافذ ہوسکیں۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں وصیت کے مقامی رواج ہیں جو شریعت سے متصادم ہیں، کیونکہ وہ ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے اور ان مقامات کے مسلمان بشرطیکہ وہ موپلا اور میمن نہ ہوں ان رواجوں کے اطلاق پر اصرار کر سکتے ہیں جس کا جواز شریعت ایکٹ 1938 کی دفعہ 3 میں موجود ہے۔

تبنیت، یہ کسی کو بیٹا بنانے سے متعلق مقامی رسوم کو بھی مسلمان اپنا سکتے ہیں اگر وہ اس مسئلے میں شریعت کی پیروی نہ کرنا چاہیں۔ اسلام میں منھ بولے بیٹے کی کوئی قانونی یا شرعی حیثیت نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی کسی کو بیٹا بنالے تو اسلامی قانون کی نظر میں ان دونوں میں کوئی ایسا رشتہ قائم نہ ہوگا جو حرمت نکاح اور حقوق وراثت کو لازمی قرار دے، البتہ اگر مقامی رواج کے مطابق تبنیت کی قانونی حیثیت مسلم ہو اور وہ شخص شریعت کے بجائے اس رواج

کے اطلاق کا خواہش مند ہو تو عدالتیں اسی کو نافذ کرے گی۔

مہر سے متعلق ایکٹ:

اودھ لاز ایکٹ 1876 دفعہ 5 اور جموں وکشمیر مسلم مہر ایکٹ 1920 دفعہ 2

ریاست جموں وکشمیر اور اودھ میں مہر سے متعلق مقامی قوانین ہیں جن کے مطابق اگر کسی نکاح نامے میں مذکور مہر مسمی کی رقم شوہر کی مالی حالت کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو عدالت کو اس میں ضروری تخفیف کرنے کا اختیار ہوگا۔

تنسیخ نکاح ایکٹ 1939:

علماء کی تائید سے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن محمد احمد کاظمی مرحوم نے ایک بل پیش کیا جس کی بنیاد پر تنسیخ نکاح ایکٹ 1939 پاس ہوا۔ اس کے متن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(1) ہر مسلمان عورت کو حق ہوگا کہ وہ شوہر کی گم شدگی، نفقہ یا دیگر حقوق زوجیت کی عدم ادائیگی، سزائے قید، مستقل نامردی، جنون، جذام یا کسی جنسی بیماری میں ابتلاء یا اس کی طرف سے بے رحمی کے سلوک کی صورت میں اس کے ساتھ اپنے نکاح کے فسخ کے لئے عدالت سے ڈگری حاصل کرے۔

(20) مندرجہ بالا حالات کے علاوہ 'خیار البلوغ' یا شریعت کے کسی اور مسئلے کی بنیاد پر بھی مسلمان منکوحہ کے نکاح کو فسخ کرنے کا عدالت کو اختیار ہوگا۔

(3) اگر کوئی مسلمان عورت تارک اسلام ہو جائے تو اس سے اس کا نکاح خود بخود فسخ نہیں ہوگا۔

(3) البتہ ایسا کرنے کے بعد وہ مذکورہ بالا بنیادوں میں کسی پر اپنا نکاح عدالت کے ذریعہ فسخ کرا سکتی ہے۔

وقف علی الاولاد ایکٹ 1913:

1913 کا جواز مسلم اوقاف ایکٹ وقف علی الاولاد کو قانوناً وقف صحیح قرار دیتا ہے۔ یہ ایک وضاحتی قانون ہے جس کی مختصر تاریخ یہ ہے 1886 میں اس وقت کی اعلیٰ ترین عدالت نے ایک مقدمے کے فیصلے کے دوران وقف علی الاولاد کو شرعاً ناجائز قرار دیا تھا جب کہ قدیم فقہاء کی رائے اس کے جواز کے حق میں تھی۔ اس فیصلے کے خلاف علامہ شبلی نعمانیؒ اور دیگر اکابر نے احتجاج کیا اور آخر کار حکومت نے 1913 کا وقف ایکٹ پاس کر کے اوقاف علی الاولاد کو صریحاً جائز قرار دیا تھا۔

اسپیشل میرج ایکٹ 1954:

یہ ایکٹ ہر شخص کو خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیرو ہو، یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی پرسنل لا کے بجائے اس ایکٹ کے تحت شادی کرلے یا اپنے موجودہ نکاح کو اس ایکٹ کے تحت رجسٹر کرالے، دونوں صورتوں میں وہ اپنے مذہبی پرسنل لا کے ازدواج اور وراثت سے متعلق احکام کا پابند نہ ہوگا، بلکہ اس پر ایکٹ مذکور اور 1925 کے 'ہندوستان وراثت ایکٹ' کا اطلاق ہوگا۔ (اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت مثال کے طور پر بیوی اپنے شوہر کے نصف جائداد کی حق دار ہو جاتی ہے۔)

نوٹ: (یہ تمام معلومات ان کی عبارتوں کے ساتھ پروفیسر طاہر محمود انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی کتاب 'مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ' سے ماخوذ ہیں)۔

تنسیخ زمینداری ایکٹ 1950:

یوپی میں زمینداری کی تنسیخ کے بعد 1950 میں یہ ایکٹ پاس ہوا ہے۔ اس سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، بلکہ ان پر بھی یہ ایکٹ نافذ ہے۔ اس ایکٹ کی دفعہ 171 وراثت سے متعلق ہے۔ اس میں زمین، کاشت اور باغات کی وراثت کے سلسلے میں

بنائے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(1) اگر میت کی اولاد ذکور موجود ہو خواہ بیٹا ہو یا پوتا یا پوتے کا بیٹا تو تنہا وہی میت کی متروکہ تمام زمینوں، کاشتوں اور باغوں کا مالک ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان میت کے تمام شرعی ورثہ کو بیٹا پوتا محروم کردے گا۔

(2) اگر میت کی اولاد ذکور موجود نہ ہو تو میت کی بیوی (بیوہ) تمام زرعی جائداد کی تنہا مالکہ ہوگی۔ بشرطیکہ وہ عقد ثانی نہ کرے۔

(3) اگر اولاد ذکور بھی نہ ہو، میت کی بیوی بھی نہ ہو تو میت کا باپ مالک ہوگا۔

(4) اگر باپ بھی زندہ نہ ہو تو میت کی غیر شادی شدہ لڑکی مالک ہوگی۔

(5) اگر یہ بھی نہ ہو تو غیر شادی شدہ بہن مالک ہوگی۔

(6) بھائی بھی نہ ہو تو غیر شادی شدہ بہن مالک ہوگی۔

(7) اگر یہ بھی نہ ہو تو میت کی شادی شدہ لڑکی مالک ہوگی۔

(8) یہ بھی نہ ہو تو نواسہ۔

(9) نواسہ بھی نہ ہو تو بھتیجا مالک ہوگا۔

اسی طرح اس میں 15 ضابطے ہیں۔ اس ایکٹ کا نہ فیضی نے اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے اور نہ طاہر محمود صاحب نے اپنی کتاب 'مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کا مسئلہ' میں ذکر کیا ہے۔ اس ایکٹ کی بنیاد شریعت ایکٹ 1937 کی دفعہ میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 'زرعی آراضی کی وراثت سے متعلق مقدمات پر مسلم پرسنل لا کا اطلاق نہ ہوگا۔

☆☆

ترمیمات برائے قانون وقف 1995ء

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں ''لوک سبھا، راجیہ سبھا'' کی ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کے ذمہ وقف بورڈ کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور موجودہ قانون وقف میں ضروری ترمیمات کی سفارشات پیش کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسی کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے صدر نشین جناب کے۔ رحمٰن خان صاحب (موجودہ نائب صدر نشین راجیہ سبھا) تھے۔ موجودہ کمیٹی کے صدر جناب لال جان پاشا صاب رکن راجیہ سبھا نامزد کئے گئے ہیں۔ جناب رحمٰن خان صاحب کی کمیٹی نے ایک سوال نامہ جاری کرکے جوابات طلب کئے تھے، مگر موجودہ کمیٹی نے امور وقف کی بہتری کے لئے اور قانون وقف میں ترمیمات کے لئے تجاویز طلب کی ہیں۔ اس کے لئے یکم اپریل ۲۰۰۷ء آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی، لیکن چونکہ اس کی اطلاع واشتہار صرف دلی کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ جناب لال جان پاشا صاحب سے بات کرکے ۳۰/جون کی تاریخ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تجاویز کے لئے مقرر کروائی گئی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے ۱۹۹۵ء کے قانون وقف کی ترمیم کے موقع پر جو تجاویز پیش کی گئی تھیں اور بعد ازاں کے۔ رحمٰن خان صاحب کمیٹی کے سوال نامے کا جو جواب دیا گیا تھا ان کو پیش نظر رکھ کر تجاویز مرتب کی گئیں۔

قانون وقف ۱۹۹۵ء میں ترمیمات کی تجاویز کے اہم نکات:

۱۔ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۸۴ء کے قانون وقف میں ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش

نظر کسی غیر مسلم کی جانب سے قائم کردہ وقف کو وقف تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۹۵ء کے قانون میں وقف کی تعریف میں صرف مسلمانوں کے قائم کردہ وقف کو ہی وقف تسلیم کیا گیا، البتہ ایک دوسری دفعہ کے تحت کسی وقف یعنی مسجد، عیدگاہ، امام باڑہ، درگاہ، مقبرہ، قبرستان یا مسافر خانے کی مدد کے لئے غیر مسلم کی جانب سے قائم کئے گئے وقف کو تسلیم کرنے کی گنجائش نکالی گئی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے یہ تجویز پیش کی جارہی ہے ۱۹۵۴ء کی تعریفات کو بحال کیا جائے، تاکہ غیر مسلموں کی جانب سے قائم کردہ وقف بھی وقف شمار کئے جائیں۔

۲۔ وقف کے قانون ۱۹۸۴ء میں وقف انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر وقف کی تعریف میں ''معافیاں، خیراتی، قاضی خدمات اور امداد معاش'' کو بھی وقف شمار کیا گیا تھا۔ یہ حکمرانوں اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی جانب سے مختلف علاقوں میں دئے جانے والے مذہبی خدمات سے مشروط انعامات کی اصطلاحیں ہیں۔ ۱۹۸۴ء کے اس اضافے کو شامل کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔

۳۔ تعریفات میں منشائے وقف کو متعین کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ مذہبی اور خیراتی مقاصد ہیں جن کا ذکر وقف کی دستاویز میں کیا گیا ہے یا جن کا اظہار وقف کی نوعیت اور اس کے استعمال سے ہوتا ہے۔ وقف کی دستاویز سے یا اس کی نوعیت منشائے وقف واضح نہ ہونے یا منشائے وقف نہ قابل حصول ہوجانے کی صورت میں مسلمانوں کی عام بہبودی کو اس وقف کا منشاء تصور کیا جائے گا۔

۴۔ اس سے پہلے جناب کے۔ رحمٰن خان صاحب کی سرکردگی میں تشکیل کردہ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں وقف علی الاولاد کے بارے میں ایک تجویز رکھی گئی تھی ۱۹۹۵ء کے قانون میں کسی وقف علی الاولاد جائیداد کے اُتنے ہی حصے کو وقف قرار دیا گیا ہے۔ جس کو مقدس مذہبی اور خیراتی مقاصد کے لئے مختص کیا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ وقف جائیداد کے

صرف ایک حصے کو وقف قرار دینے کا جملہ حذف کیا جائے، تاکہ ساری جائیداد وقف قرار پاسکے۔ یہی وقف ۱۹۵۴ء کے قانون میں تھا۔ مگر اب یہ طے کیا گیا ہے کہ حذف کرنے کی تجویز پیش نہ کی جائے، کیونکہ کلکتہ ہائیکورٹ ۲۰۰۴ء میں یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ وقف کے ایک تناسب کو مقدس مذہبی وخیراتی مقاصد کے لئے مختص کرنے کے باوجود ساری جائیداد وقف شمار ہوگی۔

۵۔ قانون یہ رہا ہے کہ کسی ریاست میں وقف کی جائیدادوں کا سروے ہونے اور اسکی رپورٹ ریاست کے سرکاری گزٹ میں شائع ہونے کے ایک سال کے گذرنے کے بعد وقف کی فہرست قطعی قرار پاتی ہے اور کوئی شخص اس فہرست میں شامل وقف کی کسی جائیداد کی نوعیت وقف کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اس کا اطلاق اس جائیداد پر مخالفانہ قبضہ اور مخالفانہ ادّعا رکھنے والے پر نہیں ہوگا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے پیدا شدہ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے ۱۹۹۵ء کے قانون میں ایک وضاحت کا اضافہ کیا گیا، مگر اس کے باوجود گجرات ہائی کورٹ نے کچھ وقف بورڈ بھوج کے ایک مقدمے میں ۱۹۹۵ء کے قانون کو نظر انداز کردیا اور سپریم کورٹ کی نظیر کے مطابق فیصلہ دیا۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے واضح انداز میں ترمیمات کی تجویز رکھی گئی ہے۔

۶۔ وقف کے سروے سے متعلق دفعات میں ''قانون کے نفاذ کے آغاز کے وقت موجود اوقاف'' کے سروے کی بات کہی گئی ہے یہ تجویز پیش کئی گئی ہے کہ وقف سروے کمشنر کو ریاست میں پائی جانے والی تمام اوقافی جائیدادوں کے سروے کا اختیار دیا جائے اور اختیار کو قانون کے نفاذ کی تعریف پر موجود جائیدادوں تک محدود نہ کیا جائے۔

۱۹۹۵ء کے قانون کے تحت ایک مرتبہ سروے ہونے کے کم ازکم (۲۰) سال بعد دوسرا سروے کیا جاسکتا ہے، عموماً سروے میں کئی نقائص پائے گئے ہیں اور ۲۰ رسال کی شرط

کی وجہ سے دوسرا یا تازہ سروے نہیں کیا جاسکتا ہے، ناقص سروے (۲۰) سال تک نافذ رہے گا ٹ اس لئے یہ ترمیم تجویز کی گئی کہ جب ریاستی حکومت ضرورت محسوس کرے وہ ایک نئے سروے کا حکم دے سکتی ہے۔

۷۔ ریاستی وقف بورڈ کی تشکیل کے سلسلہ میں تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ وقف بورڈ کے کم سے کم تین چوتھائی ارکان منتخبہ ہوں اور اس کے لئے مسلمانوں کے دیگر زمروں سے ارکان منتخب کئے جاسکتے ہیں جیسے مسلم میڈیکل ڈاکٹرس، چارٹرڈ اکاؤنٹینٹس، فینانشیل مینیجرس وغیرہ۔ دوسری تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ ریاستی بارکونسل کے ارکان کا جو زمرہ قائم کیا گیا ہے اس کی تاویل آندھرا پریش، گجرات اور مہاراشٹر میں یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد ریاستی بارکونسل کے لئے منتخبہ مسلم ارکان ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ ملک کی کئی ریاستوں میں بارکونسلس کے لئے ایک بھی مسلم ایڈووکیٹ منتخب نہیں ہوا۔ چند ایک ریاستوں میں ایک یا دو مسلم ایڈووکیٹس بارکونسل کے لئے منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ ترمیم پیش کی گئی ہے کہ ریاست کی بارکونسل میں رجسٹرڈ تمام ارکان کو زمرہ قرار دیا جائے اور ان میں سے وقف بورڈ کے لئے ارکان منتخب کئے جائیں۔

موجودہ قانون میں ممتاز مسلم تنظیموں کے نمائندوں کو منتخب کرنے کا اختیار ریاستی حکومتوں کو دیا گیا ہے۔ تجربہ یہ رہا ہے کہ ریاستی حکومتیں برسرِ اقتدار پارٹی کے کسی مسلم رکن کو نامزد کرتی ہے اور جس مسلم رکن کو نامزد کیا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے کسی ادارے یا انجمن سے ایک خط حاصل کرلیتا ہے کہ یہ ہمارے رکن ہیں۔ یہ رکن بورڈ میں برسرِ اقتدار پارٹی کے مفاد کے لئے کوشاں رہتا ہے اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ حکومت اسی رکن کو وقف بورڈ کا صدر منتخب کرواتی ہے۔ اس لئے تجویز یہ پیش کی گئی ہیں کہ کسی ممتاز مسلم تنظیم کے نمائندے کی بجائے ممتاز مسلم تنظیموں کے عہدیداروں کو حکومت کی طرف سے نامزد کیا جائے۔ یہ بھی تجویز رکھی گئی ہے کہ ایسے اشخاص کو نامزد نہ کیا جائے جو کسی وقف جائیداد پر ناجائز قابض

ہوں یا جن کے خلاف وقف بورڈ نے کیس دائر کیا ہو یا جنہیں وقف کے مفادات کے خلاف کام کرنے کا خاطی پایا گیا ہو یا جنکے خلاف کسی کمیشن یا کسی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ اس نے وقف کے انتظامات میں بے ضابطگیاں کی ہیں یا جس کے خلاف انتظام وقف میں بے ضابطگیوں کی چھان بین اور تفتیش جاری ہو ایسے تمام اشخاص کو وقف بورڈ کی رکنیت کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔

قانون وقف بابت ۱۹۹۵ء میں ریاستی حکومت کو ڈپٹی سکریٹری کے رتبے کے عہدیدار کو بورڈ کا رکن نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تجویز یہ رکھی گئی ہے کہ حکومت کے اس اختیار کو ختم کردیا جائے اور اس کے بجائے مسلم تنظیموں کے عہدیداروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ۱۹۵۴ء کے قانون میں ڈپٹی سکریٹری کے رتبے کے سرکاری عہدیدار کو رکن نامزد کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ حکومت کو کبھی شکایت نہیں رہی کہ ایسے کسی عہدیدار کی عدم موجودگی کی وجہ سے حکومت کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں دشواری پیدا ہوئی ہو۔ مزید برآں یہ کہ خود چیف ایکزیکیٹو آفیسر جو وقف بورڈ کا سکریٹری بھی ہوتا ہے وہ ایک سرکاری عہدیدار ہوتا ہے۔ اس لئے مزید کسی سرکاری عہدیدار کی بورڈ کی موجودگی مناسب نہیں ہے۔

۸۔ چیف ایکزیکیٹو آفیسر کے بارے میں یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ وہ بحیثیت ڈسٹرکٹ کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کام کرچکا ہو یا ریاست کی کسی اور سروس میں ایسے عہدہ پر فائز رہا ہو جو ضلع مجسٹریٹ و کلکٹریٹ کے رتبے سے کم نہ ہو۔ عموماً تحصیلدار، معاملت دار، منڈل ریونیو آفیسرس اور بلاک آفیسر کے رتبے کے عہدیدار یا زیادہ سے زیادہ ڈپٹی کلکٹر یا ریونیو ڈیویژنل رتبے کے عہدیدار نامزد کئے جاتے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ عہدیدار ضلع کلکٹر کے ذریعہ جو کام کروانا ہے وہ کام نہیں کرواسکتے۔ اگر ایک آئی اے ایس آفیسر وقف بورڈ کا چیف ایکزیکیٹو آفیسر ہو تو اس کے مراسلہ کو نظر انداز کرنا سرکاری دفاتر کے

عہدیداروں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔موجودہ قانون چیف ایگزیکیٹو آفیسر کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ چند وجوہات کو بتاتے ہوئے وقف بورڈ کے کسی فیصلے کو نظر انداز کردے یا روبہ عمل نہ لائے اور حکومت سے ہدایت حاصل کرے۔ یہ بات وقف بورڈ کی داخلی خودمختاری کے خلاف ہے۔ ایگزیکیٹو آفیسر کو ایسے اختیارات نہیں دینا چاہئے کہ جس سے وقف بورڈ جس کی نوعیت مسلمانوں کے منتخبہ نمائندوں کے اداروں کی ہے اس کی اہمیت گھٹ جائے۔

۹۔ قانون وقف میں بورڈ کو اوقاف کے انتظام کے لئے انتظامی آفیسر (ایگزیکیٹو آفیسر) اور اس کے عملے کو مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ بورڈ کی جانب سے اس میں یہ ترمیم تجویز کی جارہی ہے کہ ایگزیکیٹو آفیسر کے تقرر کا اختیار بورڈ کو اس وقت حاصل ہونا چاہئے جبکہ کسی متولی کے خلاف اس کو علیٰحدہ کرنے کی انکوائری چل رہی ہو اور متولی کی جانب سے پیش کی گئی صفائی کا جائزہ لینے کے بعد بورڈ اس وقف کے بہتر انتظام کے لئے ایگزیکیٹو آفیسر کے تقرر کو ضروری سمجھے۔ ایگزیکٹو آفیسر کا تقرر ان اصولوں پر ہونا چاہئے جن کی بنیاد پر ضابطے دیوانی آرڈر (۴۰) رول (۱) کے تحت ایک دیوانی عدالت رسیور کا تقرر کرتی ہے۔

۱۰۔ موجودہ قانون کے تحت متولی کو قرض دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شریعت اسلامی میں کسی ضرورتمند کو قرض دینا خیر کا کام ہے اور ایسے کئی اوقاف ہیں جن کے مقاصد میں ضرورتمندوں اور غریبوں کو قرض حسنہ فراہم کرنا شامل ہے۔ شریعت کے تحت ایک قاضی بھی وقف کے مقاصد کو تبدیل نہیں کرسکتا ہے جب تک کہ وہ قابل عمل اور قابلِ حصول ہیں۔ اس لئے یہ پابندی شریعت اسلامی کے خلاف معلوم ہوتی ہے، اس لئے متعلقہ دفعہ کو حذف کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے اور اس کے بجائے یہ گنجائش فراہم کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے کہ متولی کو سنی لاء یا شیعہ لاء کے تحت جس کے تابع کے متعلقہ وقف ہو وقف بورڈ سے منظوری حاصل کئے بغیر قرضِ حسنہ دینے کا اختیار ہوگا۔

۱۱۔ موجودہ قانون ایک میں دفعہ موجود ہے جس کے تحت ایسے وقف کو جو کہ وقف بورڈ میں رجسٹرڈ نہ ہو عدالتی چارہ کار یا اپنے حقوق کے استقرار کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ یہ قانون وقف ۱۹۹۵ء کا سب سے زیادہ نقصان رساں دفعہ ہے، اگر متولی یا اس کے وقف کے ذمہ داروں کی کسی غلطی کی وجہ سے وقف کو اس کے حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ ملک میں ایسے بے شمار اوقاف ہیں جو کسی متولی کے تحت نہیں ہیں اور جو وقف علی الاستعمال (Wakf by User) کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کا رجسٹریشن نہیں ہوسکا تو دراصل یہ سروے کا نقص ہے جس کے لئے سروے کے عہدیداران ذمہ دار ہیں۔

۱۲۔ ان اہم امور میں تجاویز کے علاوہ انتظام، متولیوں کے خلاف کارروائی، حسابات اور وقف بورڈ کے مالیات اور عدالتی کارروائیوں کے سلسلہ میں بھی تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے نادار و مفلس مطلقہ خواتین کی مدد کے لئے ایک فنڈ قائم کرنے سے متعلق دفعہ کے اضافہ کی تجویز رکھی گئی ہے۔ مسلم مطلقہ کے حقوق کے قانون کے تحت بعض صورتوں میں ایک مسلم مطلقہ کو گذارہ دینا وقف بورڈ کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے اس قانونی ذمہ داری پر عمل آوری کے لئے ایسے فنڈ کے قیام سے متعلق دفعہ کا اضافہ ضروری ہے۔

☆☆

باب هفتم

مسلم پرسنل لاء بورڈ
ایمان و یقین کے متوالوں کا کارواں

● مولانا محمد ولی رحمانی
جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

یہ کاروانِ دین وشریعت بڑا محترم ہے، اور اس کی خدمات دین و دنیا میں کامیابی و کامرانی اور اجر وثواب کا ذریعہ ہیں اور یہ بورڈ مسلمانان ہند کا متحدہ پلیٹ فارم ہے، جس پر نہ صرف ملت اسلامیہ کو اعتماد ہے، بلکہ پورا ملک اس کے فیصلوں کو سننے کا منتظر رہا ہے، بزرگوں کی یہ امانت قابل قدر بھی ہے لائق شکر بھی اور ہر لحاظ سے اس کی مستحق ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے، اسے ترقی دی جائے، اور ہم سبھوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنی انفرادیت، مسلک ومشرب کے فاصلوں اور جماعتی حلقہ بندیوں سے بلند ہوکر صرف دین کی سربلندی اور ملت اسلامیہ کی بہی خواہی کی خاطر اس سمندر میں ضم ہوجائیں اور ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت موتی کی طرح سمندر کی تہ میں رہے جس سے سمندر کا وقار و وزن تو بڑھے، مگر اس کی روانی میں کوئی فرق نہ آئے۔

۳۷ رسال قبل جب اس کارواں کے دھندلے نقوش ابھر رہے تھے، بورڈ بنا بھی نہیں تھا، بمبئی کنونشن کا مرحلہ تھا اور نشیمن کی تعمیر کیلئے ہمارے بزرگوں کے اخلاص، فراست اور جہد مسلسل نے نہ صرف رکاوٹوں کو دور کیا، بلکہ فضل الٰہی کے سایہ میں بکھرے تنکے جمع ہوتے چلے گئے، قدم سے قدم ملا، دل سے دل ملے، آشیانہ بھی تعمیر ہوا، اور بمبئی کے سیل بے کراں

نے حیدرآباد میں صاف ستھرے مستحکم آشیانہ کی شکل اپنالی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل ہوگئی، بورڈ کی تعمیر وتشکیل کے مرحلے دشوار تھے۔ کرب تخلیق کی اذیتیں جھیلی گئیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مصیبتوں اور کلفتوں کو گلے لگائے بغیر کامیابیوں اور راحتوں کے مرحلے نہیں آتے، آج ہم بورڈ جیسے شجر سایہ دار تلے بیٹھے ہیں، وہ بزرگوں کی محنت کا نتیجہ اور اس کا بہترین ورثہ ہے!

آج جب ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو دارالعلوم دیوبند کی مختصر مگر بنیادی نشست، بمبئی کے تاریخ ساز کنونشن اور حیدرآباد کے غیر معمولی اجلاس کی تصویر نگاہوں میں آجاتی ہے، بڑی بڑی باوقار اور باوزن شخصیتیں، ایسا لگتا ہے کہ سامنے کھڑی ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب، محترم ڈاکٹر سید یوسف نجم الدین صاحب، حضرت مولانا برہان الحق قادری رضوی صاحب، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب، محترم مولانا ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی صاحب، بابائے میمن جناب محمد یوسف پٹیل صاحب، محترم قاضی الطاف خورشید صاحب، حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب اور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب رحمہم اللہ، اور مختلف سطح پر خدمت انجام دینے والی بہت ساری شخصیتوں کے چہرے نظر میں ہیں، دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ اٹھ گئے، امت اسلامیہ کے ردائے کلیمی میں ہی نہیں، وطن عزیز کے مطلع علم وسیاست پر کیسی کیسی شخصیتیں تھیں، جو اٹھ گئیں، دیکھتے دیکھتے منظر بدل چکا ہے! خدا کا شکر ہے، اس وقت کے چند نمایاں چہرے آج بھی ہیں، جناب غلام محمود بنات والا، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، جناب عبدالستار یوسف شیخ مدظلہم ماضی کی جدوجہد کی زندہ تاریخ ہیں، اور تاریخ ساز بھی اور کنونشن کے دفتر کا یہ جاروب کش، بمبئی کے منبر ومحراب کا یہ گمنام واعظ

کل بھی گرد کارواں کی طرح شریک کارواں تھا، اور آج بھی خادمانہ شریک ہے!

بورڈ کی زندگی میں بڑے موڑ بہت سے مرحلے آئے، ایمرجنسی کے تاریک دنوں ۷۵ء، ۷۶ء، میں جبری نس بندی کی مخالفت کی گئی، متبنیٰ بل ۱۹۷۲، جو یکساں سول کوڈ کی طرف مضبوط قدم تھا، کے خلاف صف آرائی جس میں آخر میں کامیابی ملی، مساجد ومقابر کے تحفظ کیلئے ملک گیر تحریک ۷۸ء-۷۹ء جس نے خطرات کے درمیان عوام کے ذہن وعمل کی تربیت کی اور جمہوریت میں آواز بلند کرنے کا شعور بخشا، شاہ بانو کیس کے نتیجہ میں پیدا شدہ حالات (۸۲ء-۸۶ء) کے نتیجہ میں رائے عامہ کو بنانے اور دین وشریعت کے کیس کو دانشوروں اور ارباب سیاست کو سمجھانے کا مرحلہ گذرا، اوقاف کی جائدادوں کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے (۱۹۸۰ء) کی کامیاب جدوجہد کے لمحے بھی بیتے، قانون وقف (۱۹۸۴ء) میں ترمیم کی جدوجہد بھی سامنے آئی، لازمی نکاح رجسٹریشن (۱۹۸۱ء اور ۱۹۹۰) کے معاملہ پر قابو پایا گیا، معاشرہ کی اصلاح کی تحریک چلائی گئی، لیگل کمیٹیوں کے ذریعہ قانون ساز اداروں کی کاروائی کا جائزہ اور ضروری اقدام کئے جاتے رہے، دارالقضاء کے قیام کی ضرورت کا احساس پورے ملک میں پیدا کیا گیا اور منصب قضا کیلئے لائق اور ذی استعداد افراد کی تربیت کا انتظام مختلف مقامات پر ہوا، اور بعض مقامات پر قاضی متعین کئے گئے، انتہائی سخت اور مخالف مرحلہ میں ۹۰ء میں حق کی وہ آواز بلند کی گئی کہ مسجد مسجد ہے، وہ خدا کا گھر ہے، اس کی سودا بازی نہیں ہوسکتی، اور نہ کسی مسلمان کو حق ہے کہ وہ خدا کی ملکیت کو دوسرے کے حوالہ کردے، ساتھ ہی بورڈ نے دستور ہند کے احترام اور عدلیہ کے وقار واعتبار کو ماننے کا درس اس فیصلہ کے ذریعہ دیا، کہ مسلمان بابری مسجد کے سلسلہ میں کورٹ کے فیصلہ کو قبول کریں گے، پھر ذہنی اور فکری تعمیر کیلئے بورڈ نے کئی زبانوں میں لٹریچر شائع کیا، علمی، فکری اور قانونی سطح پر بورڈ کا یادگار کارنامہ مسلم پرسنل لا سے متعلق ''اسلامی قانون'' کی ترتیب وتہذیب اور بڑے پیمانہ پر اس کی اشاعت ہے، یہ سارے اور ان جیسے اقدامات اور

خدمات کے ذریعہ بورڈ کی تاریخ بنی ہے، آپ انہیں فراست ایمانی، اخلاص، قربانی، اور سبھوں کو ساتھ لیکر تلخ وترش سہکر مسلسل کام کرتے رہنے کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں!

آج کے حالات سخت ہیں، امت مسلمہ پر جو حملے ہورہے ہیں، جو سازشیں رچی جارہی ہیں، جو عزائم ہیں، وہ طشت از بام ہیں۔ شعائر اللہ زد پر ہیں، جان ومال، عزت و آبرو کے لالے پڑے ہیں، دھمکیوں سے سہمانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے، اور وطن عزیز کا یہ منظر کتنا دلخراش ہے کہ اس دھرتی پر قانون بیچارہ ہوتا جارہا ہے، انصاف شرمسار ہے، سچائی کو مٹایا جارہا ہے، حقیقتوں کو پروپیگنڈہ میں دبایا جارہا ہے، اور بے بصیرتی کی انتہا یہ ہے کہ وہ ملت جس کا ہر فرد ہمارے وطن کا چھٹا انسان ہے اسے ڈرا دھمکا کر اس کے حقوق غصب کرنے کی فضا بنائی جارہی ہے۔ بیشک مرحلہ سخت و دشوار سامنے ہے اور بڑا امتحان ہے ؎

بچھ گئے کوئے یار میں کانٹے
کس کو عذر برہنہ پائی ہے

لیکن وطن عزیز کے کانٹوں کو چننے کی ذمہ داری اور اسے گلزار بنانے کی جوابدہی ہمیں قبول کرنا ہوگی۔ یاد رہے! نفرت کی آبیاری اور ظلم وعداوت کی کاشتکاری اقتدار کی مجبوری تو ہوسکتی ہے مذہبی تعلیم کبھی نہیں ہوسکتی۔ اقتدار کی طلب، اس کی ہوس، اسکے تقاضے کسی کے دل میں انگڑائی لے سکتے ہیں، اس شخص کا کسی مذہب سے تعلق ہوسکتا ہے، اس کا نام ہلاکو اور چنگیز ہوسکتا ہے، اسے ہٹلر اور مسولینی کے نام سے پکارا جاسکتا ہے وہ نادرشاہ جنرل ڈائر کی شکل میں سامنے آسکتا ہے وہ بش اور بلیئر کہلاسکتا ہے، واجپائی اور ایڈوانی اس کا نام ہوسکتا ہے، اقتدار کا فتنہ خیز ذہن اور ہوس ملک گیری کیلئے طاقت کا بے جا استعمال اور سازشوں کا جال ایک مریض جذبہ ہے، اور یہ جذبہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے میں پایا جاسکتا ہے، مگر ہے بہرحال یہ مرض!

اس مرض پر صاف ستھرے سچے مذہب اور روحانی قدروں ہی سے قابو پایا جاسکتا ہے، اسی نسخہ کو اپنا کر ملکوں ملکوں میں مشاکل ومسائل حل ہوئے ہیں، اور یہی نسخہ شفا امتوں کا محاسب بھی ہے، راہ روبھی اور منزل بھی! ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ صرف حالات بدل گئے ہیں یا ہم بھی کچھ بدل گئے ہیں، اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہماری دستگیری کرتا ہے:

" ما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم و يعفو عن كثير" (سورة الشوریٰ)

(تم جس مصیبت میں پھنسے وہ تمہاری کمائی ہوئی ہے، اور اللہ بہت سی غلطیوں کو معاف بھی کردیتا ہے۔)

یقیناً حالات سخت ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے خرمن کو جلانے کیلئے چاروں طرف سے گرج رہی ہے، اس نازک وقت میں سرکار ذی وقار صلی اللہ علیہ وسلم ہماری رہنمائی فرماتے ہیں:

عن ثوبان قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: يوشك الأمم أن تداعى عليكم كما تداعى الآكلة إلى قصتعها، قال قائل: ومن قلة نحن يومئذ؟، قال: بل أنتم يومئذ كثير ولكنكم غُثاء كغثاء السيل ولينز عن الله من صدور عدوكم المهابة منكم وليقذف فى قلوبكم الوهن، قال قائل: يا رسول الله! ما الوهن؟ قال صلى الله عليه وسلم: حب الدنيا و كراهية الموت. (مشكوٰة المصابيح)

(بروایت حضرت ثوبانؓ، سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: جس طرح دسترخوان پر لوگ دوسروں کو بلایا کرتے ہیں تمہارے خلاف بھی قومیں ایک دوسرے کو بلائیں گی، کسی نے پوچھا: کیا اس دن تعداد تھوڑی ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں تمہاری تعداد بہت ہوگی

لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے جھاگ کی سی ہوگی، خدا تعالیٰ تمہارے وقار اور وزن کو مخالفتوں کے دل سے نکال دیں گے، اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دیں گے کسی نے پوچھا: اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ دور نزدیک نظر آرہا ہے، آپ نے مرض کی جو تشخیص فرمائی، وہ بھی واضح ہے، آپ کا پیغام امت کے ہر فرد کیلئے دعوت فکر ہے، اور فیصلہ امت کو کرنا ہے، کہ اسے قلب وروح عزیز ہے یا اس کا معدہ اور مادہ ابھی آسودہ نہیں ہوا ہے! وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ''راز زندگی'' اور ''نسخہ جاودانی'' کو دل میں اتارنے کیلئے تیار ہے یا نہیں؟ امت کا ایمان کے تقاضوں پر زوال یقین اور اسے زندگی میں برتنا ہی کامیابی کی شاہ کلید ہے۔

اقتدار کے تقاضے نفرت کی آبیاری اور عداوت کی کاشتکاری ہوسکتی ہے، مگر ایمان کے تقاضے، دنیا کی محبت اور موت کا خوف نہیں ہوسکتے، ''ایمان کا تقاضہ تو'' **ماآتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھو**''. (**سورۃالحشر**:) ہے (رسول کریم نے جو کچھ دیا اسے پکڑ لو اور جس چیز سے تمہیں روکا ہے اس سے باز آجاؤ۔ اس لئے:

سارا جہاں خلاف ہو پروا نہ کیجئے
پیش نظر تو مرضئ جاناں چاہئے

یقین کیجئے دینی فکر اور مذہب سے سچا عشق اور اس پر عمل شاہراہ حیات ہے، روحانی قدروں کو اپنے اندر سمو لینا زندگی کی معراج ہے، اور ایسی ہی زندگی کیلئے '' **لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون**'' کی بشارت ہے، ہم سب جو اس بشارت کے طلبگار اور امیدوار ہیں رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی ہدایتوں کو ہر گھر میں پہنچادیں اور ہر دل میں اتار دیں، تو ساری بگڑی بن سکتی ہے، ہم محاسبہ نفس بھی کریں، محاسبہ معاشرہ بھی، اصلاح نفس بھی کریں اور اصلاح معاشرہ بھی، اور یہ بھی بتاتے چلیں کہ '' **حب الدنیا رأس کل**

خطیئۃ'' (دنیا کی محبت ہر غلطی کی جڑ ہے) اور دلوں میں اتارتے چلیں کہ جب بھی دنیا کی محبت اور موت کا خوف ہوگا، وہ عہد ہوگا ہم پر امتوں کے ٹوٹ پڑنے کا!

یہی سبق ہے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا!

مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاریخ ایمان و یقین کے متوالوں کی تاریخ ہے، بصارت و بصیرت، جرأت وعزیمت کی تاریخ ہے، صبر و برداشت، احتیاط و پرہیز کے ساتھ سوز دروں اور جذب وجنوں کی تاریخ ہے۔ بروقت فیصلے اور فیصلوں پر مسلسل عمل کی تاریخ ہے وہ احتیاط جو بزدلی کا تحفہ دے، وہ پرہیز جو حالات سے گریز سکھائے، وہ صبر جو ظلم مسلسل کی حسین تعبیر تلاش کرے اور وہ برداشت جو بے عملی تک پہنچادے، زندہ افراد اور زندہ اداروں کیلئے نہ قابل قبول ہے اور نہ گوارہ!۔

☆☆

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن کا
خطبہ صدارت

● حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند، بانی وصدر اول آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفىٰ. وبعد

حضرات گرامی قدر! اس عظیم نمائندہ اجتماع کے لئے جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور مؤقر تنظیموں کے علماء وفضلاء اور ملک کے تمام دانشور جمع ہیں صدارت کسی ایسی بڑی اور نمایاں شخصیت کے سپرد ہونی چاہئے تھی جو اس عظیم اجتماع کے شایان شان اور اس کے لئے مزید عظمتوں کا باعث ہوتی۔ اس کے برخلاف ایک ایسے شخص کے سپرد کردی گئی ہے جو جسم وروح ظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے کمزور اور قلیل البضاعت ہے اور جتنی بضاعت ہے وہ مزجات ہے۔

درآں حالیکہ اس مؤقر مجمع میں ایسے اکابر علم وفضل موجود ہیں جو "**بسطةً فى العلم والجسم**" دونوں لحاظ سے اس ذمہ دارانہ منصب کے مستحق اور ملک وقوم پر اثر انداز ہونے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

اس صورت میں مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس بڑی ذمہ داری سے بہ ادب معذرت کردینے کا موقع تھا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقویا کے مقابلے میں اس درجہ کا کمزور ہونا بھی بہرحال ایک امتیاز ہے اور بڑے کمال کے مقابلہ میں بڑا نقصان بھی کمال ہی سے

نسبت رکھتا ہے، جو درحقیقت اس کمال کے نمایاں اور واضح کردینے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

"**وبضدها تتبين الاشياء.**"

ضد ہی سے اشیاء کی تبیین ہوتی ہے۔ اضداد نہ ہوں تو کمالات کی بہت سی قوتیں چھپی کی چھپی رہ جاتی ہیں۔ اگر ظلمت نہ ہو تو نور کے پہلو نہیں کھل سکتے۔ اگر رات نہ ہو تو دن کی قدر وقیمت نہیں معلوم ہوسکتی، اگر جہل نہ ہو تو علم کی عظمت نمایاں نہیں ہوسکتی، اگر ضعف نہ ہو تو قوت کی قدریں نامعلوم رہ جائیں۔ اگر ناقصین نہ ہوں تو کاملین کے کمالات کے پہلو سامنے نہیں آسکتے۔

اس حقیقت کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس ضعیف وناکارہ کا انتخاب بہت ہی موزوں ومناسب ہوا اور جیسے انتخاب شدہ کو یہ بلاچوں وچرا قبول کرلینا چاہئے تھا اسی طرح انتخاب فرمانے والے بزرگ بھی میرے ہی نہیں، بلکہ پورے اجتماع کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حقیقت شناسی کا پورا ثبوت دیا ہے۔

لیکن اس شکریہ سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ہم سب کو اس خداوند بزرگ وبرتر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جس کی عطا کردہ توفیق سے ہم سب یہاں ایک جگہ جمع ہیں اور کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے ہیں۔ نہ صرف ہمارے اجسام ہی ایک دوسرے سے قریب ہوگئے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دل بھی ایک دوسرے سے قریب اور اخوت اسلامیہ کے جذبہ کے تحت قریب سے قریب تر ہوجانے کے آرزومند ہیں۔

بزرگان محترم! ہمیں ملانے والی چیز صرف اللہ کا نام اور اس کا مستند کلام ہے اور ہمارے دین کی واحد اساس کلمہ طیبہ "**لا اله الا الله محمد رسول الله**" ہی ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمارے اس ملی اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہم اللہ کے نام سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور اسی کے کلام کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتے ہیں، اور اللہ کے سچے رسول خاتم النبین

حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات کو کمالات خداوندی کا نمونہ اور اپنی دنیا وآخرت کا کامل ومکمل رہنما اور مربی یقین کرتے ہوئے انہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد سمجھتے ہیں۔

اسی پاک اسوہ سے ہماری زندگی بنی ہے اور اسی سے آئندہ بنے گی اور اسی پر خاتمہ سے ہماری آخرت کی فلاح وبہبود وابستہ ہے۔

امام مالک کا ارشاد ہے:

”لایصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها“(الشفاد لقاضی عیاض) یعنی اس امت کا آخری حصہ بھی اسی سے صلاح وفلاح پا سکتا ہے جس سے امت کے اول حصہ نے صلاح وفلاح پائی۔

یہی وہ روشنی اور رہنمائی ہے جس نے صدیوں کے خلاء کو پر کرکے ہمیں ایمانی عزیمت عطاء کی ہے اور ہم لوگوں کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے، آج کے دن ایک جسم واحد کی طرح ایک جگہ جمع کر دیا اور ایک بار پھر اپنی شریعت اور اس کے مسائل کی حفاظت کے لئے اس مقام پر کھڑے ہونے کی ہمت بخشی۔

بلاشبہ جس طرح آج کا یہ اجتماع عظیم ہے اسی طرح یہ دن بھی ایک عظیم، بلکہ عظیم تر دن ہے جس میں بظاہر ایک ناممکن سی بات نہ صرف ممکن، بلکہ واقعہ بن کر سامنے آگئی ہے۔ اور **”واعتصموا بحبل لله جميعاً ولا تفرقوا“.** کا پاکیزہ منظر آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔

حضرات گرامی! ہر دور میں تاریخ کا ظہور کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے، لیکن اس دور کا تاریخی ظہور یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء دانشور اور رہنما وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک نقطہ وحدت پر جمع ہیں۔ اس کی روشنی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق توحید ورسالت اور جذبہ وحدت کی جو امانت امت کو سپرد کی گئی تھی ہم اس کی حفاظت کے فریضہ کو فرض کی طرح ادا کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ بلاشبہ یہ امانت ہمیں جان ومال اور

آبرو سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنے جانوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں مگر اس ازلی اور ابدی امانت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

بزرگان محترم! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی، وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے بلکہ روایت ودرایت کے لحاظ سے اس کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔ مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اور مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں، اگر ہیں تو وقت کے دھارے سے ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں، جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں۔ زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان سرحدوں سے باہر نکل جائیں، مگر یہ ان کی تعدی ہوگی، حدود اپنی ہی جگہ اٹل رہیں گی۔

”تلک حدود الله فلا تعتدوها، ومن يتعد حدود الله فأولئک هم الظالمون“.

اسلام کا قالب جن قانونی دستاویزوں اور فطری اصولوں سے مشیت خداوندی نے تیار کیا ہے ان میں تمام ہنگامی اور دوامی اصلاحات اور ان کے اصول وقوانین جمع کر کے ان میں سے ان تمام سماجی برائیوں کو نکال دیا ہے جن کا نام جاہلیت تھا۔ اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کے معنی اسی جاہلیت کو دوبارہ لے آنے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے، جس سے مالک مطلق نے انسانیت کو پاک کر کے درجہ کمال پر پہنچایا تھا۔

آج پرسنل لا کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح وترمیم پیش کیا جا رہا ہے۔

کیا حقیقتاً یہ اصلاح اور کوئی اصلاحی تحریک ہے؟ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے، جسے قرن اول کے منافقین **” انما نحن مصلحون“** کے نعرے کے ساتھ لے کر کھڑے ہوئے تھے، لیکن عالم الغیب والشہادہ نے کھلا اعلان فرما دیا تھا: **”ألا انهم هم المفسدون**

ولکن لا یشعرون''.

ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے۔ بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے، جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور، مذہب اور سیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملے میں اپنی سیاست ملا کر حکومت اور عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟ آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں، حکومت کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟۔

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کا کتنا دیوث ہے، جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل ودیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم قسمت کی ماری بازار گنہگار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں، نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی داروگیر کا روادار ہے، سماج نے گناہوں کے بازار لگا رکھے ہیں۔ آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو اسی اسی بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔ بقول بابو بھے چندرا اور بابو گریندر ناتھ دت

'اس ملک میں ایسے کامن برہمن بھی ہیں جن کی پچاس پچاس اور سوسو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک نوٹ رہتی ہے جس میں وہ اپنی بیویوں کے نام مع ولدیت اور گاؤں کا نام لکھ لیتے ہیں اور (پھر بھی) انہیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جسے

وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔' (پروفیسر کے ایم کپڑیا کی تصنیف 'میرج اینڈ فیملی ان انڈیا' ص 15 بحوالہ اخبار عزائم لکھنؤ 14/نومبر 1972)

لیکن اسلام نے سماج کے اس وحشی دستور کے خلاف سوسو بیویاں رکھنے کے قانون کو محدود کر کے اگر چار کی گنجائش دی اور وہ بھی کڑی شرائط کے ساتھ اور اسی بے قید غلاظت سے سماج کو پاک رکھنے کے لئے تو مصلحین کی ٹولیاں قانون کے پشتارے لے کر دوڑ پڑیں، جس ملک میں راتوں کے کلب ہوں، مادر وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عصمت وعفت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جارہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو، ایسے ملک کے چند ایسے سرپھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لا کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود تو شرمانا چاہئے تھا جنہیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی بھی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کی فطری اور اعلیٰ وارفع قانون عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی؟ بے شمار بچوں کی تعداد پر تو پابندیاں عائد کی جائیں، مگر بے شمار غلیظ گناہوں پر پابندیاں عائد کرنے کا کوئی جذبہ نہ ابھرے، خواہ وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں، کہیں بھی ہوں اور کتنے ہی شرمناک انداز میں ہوں۔

برائیوں کے بازار کھلے ہوئے ہیں، جن میں ہر برائی اور ہر اخلاقی گندگی بکری کے مال کی طرح بکتی ہے۔ تباہ حال اچھوتوں کا کیا حال ہے، غریب ہندو عورتوں کا کیا حال اور مآل ہے، جوان نسل کے لڑکے اور لڑکیاں کن کن سماجی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، جھوپڑیوں میں عورتوں کی عزت عصمت کیسے دردناک حالات سے دوچار ہیں، وہاں کوئی مصلح، کوئی لیڈر اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھنے کی تکلیف گوارہ فرما کر نہیں پہنچتا اگر وہ اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھیں تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سب اسی وقت ان مصلحین کے پروگراموں کا آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔

شاید ان ہی غلاظتوں کی پردہ پوشی کے لئے پرسنل لا کے چند مسائل کو ہدف بنا کر ان

میں ترمیمات اور اصلاحات کے نعرے لگائے جارہے ہیں، یا ممکن ہے کہ اقلیتوں کو جذباتی ہیجان میں مبتلا رکھنے کی یہ کوئی تدبیر ہو۔ بہرحال نعرہ زنوں کا اندازہ قد ہر لباس میں عریاں ہے خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں، یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا، لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد، دین خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کو کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے، تو میں اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشوران محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدہ پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ برتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے، جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ " **لاتبدیل لخلق اللہ**" اسی طرح اس نے اپنے نظام امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی اسی فطرت کے اساس پر قائم کیا ہے، اس لئے اس میں بھی تبدیلی ممکن نہیں، "**لاتبدیل لکلمات اللہ**".

یہ قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب ونجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات وجزئیات، احکام وآداب، اخلاق وعقائد، معاملات ومعاشرات اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا، وہ صرف فائدہ اٹھانے کیلئے اتارے گئے ہیں، بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے، بدلنے کی جب بھی سعیٔ لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی ہی جگہ قائم رہیں گی، لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہوجائے گا۔ جس کی وجہ یہ کہ جس طرح خدا کی اس کائنات کا نظام خلق نہایت ہی مرتب اور فطرت کے اصول میں بندھا ہوا ہے، جس کا کوئی ایک جز، بھی عرش سے فرش تک اور ثریا سے ثریٰ تک بے جوڑ نہیں، اسی طرح اسی خدائے برتر وتوانا کا نظام امر، یعنی شریعت بھی غیر مرتب یا بے جوڑ نہیں، بلکہ اس کا بھی ایک جزء اپنی ہی فطری اصولوں سے بندھا ہوا، اپنی فطری تنظیم سے وابستہ ہے، اور ایک ہی فطرت الٰہی ہے جو ان دونوں نظاموں کو تھامے ہوئے ہے، جو فطرت اس کے کام میں کارفرما ہے، وہی

اس کے کلام میں بھی کارفرما ہے۔

"**ألا له الخلق والأمر فتبارک الله رب العلمين**".

جس طرح اس نظام خلق یہ اربوں، کھربوں انفرادی جزئیات، حیوانات کی ہوں یا نباتات کی، جمادات کی ہوں یا مجردات کی، اپنی اپنی انواع سے جڑی ہوئی ہیں، جیسے حیوانات میں، مثلاً شیر، بکری، اونٹ، گھوڑا اور گدھا وغیرہ حیوان کی جنس سے وابستہ ہیں، نباتات کے بے شمار افراد، درخت گھاس، جھاڑ، بیل وغیرہ اپنی اپنی انواع سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور جمادات کے ان گنت افراد اینٹ، پتھر، ریت چونا سمینٹ، لوہا، سونا، چاندی، پہاڑ اور دریا وغیرہ اپنی اپنی جمادی انواع سے وابستہ ہیں، اسی طرح یہ ساری انواع، حیوانات ونباتات وجمادات مل کر ایک اوپر کی کلی جنس کے نیچے جمع ہوجاتی ہیں، جس کا نام جسم ہے، کہ یہ ساری کی ساری نوعیں مجسمانی ہیں۔ پھر جسم کے دوش بدوش کچھ غیر جسمانی یا بے حد لطیف الاجسام مفردات کی لطیف انواع ہیں، جو اپنی لطافت کے سبب ان نگاہوں سے دیکھی نہیں جاسکتیں، جیسے ارواح، ملائکہ جنات وغیرہ یہ سب مل کر ایک نہایت ہی وسیع اور عام تر جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نما جوہر ہے، جو بلا کسی غیر کے سہارے خود سے قائم ہیں۔ پھر جوہر کے دوش بدوش کچھ غیر جوہری اشیاء بھی ہیں جو خود سے قائم نہیں ہیں، بلکہ دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ جیسے ان جنسوں کے افعال وخواص رنگ وبو، کیف وکم اور مقدار وغیرہ۔ پھر یہ سب جوہری نوع عرضی موجودات مل کر ایک نہایت ہی وسیع حاوی اور محیط کائنات جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام وجود ہے کہ ان کائناتوں میں اس سے بڑا احاطہ کسی کلی کا نہیں جو ساری موجودات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ وجود عین ذات حق سے (جل ذکرہ) اس کی ذات وجود الگ الگ نہیں ہیں کہ وجود کا اس سے جدا ہوجانا ممکن ہو، اس لئے یہ ساری کائناتیں وجود کے واسطہ سے اس وجود مطلق اور موجود اصلی سے وابستہ ہوجاتی ہیں، جس سے ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ثابت

ہوتا ہے اور اسی پر ان کائناتوں کے وجود کی انتہا ہوجاتی ہے، جسے قرآن حکیم نے دولفظوں میں کھول دیا ہے" **وان الیٰ ربک المنتھیٰ**"یعنی بلاشبہ تیرا رب ہی منتہی ہے۔جس پر ہر موجود کی انتہاء ہوئی ہے کہیں فرمایا: "**وان الیٰ ربک الرجعیٰ**" (اور بلاشبہ تیرے ہی پروردگار کی طرف ہر چیز کا رجوع ہے) کہ وہ اسے چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جاسکتی، لیکن ساتھ ہی ان موجودات پر کائناتوں کی انتہا نہیں ہوجاتی، بلکہ موجودات سے کہیں زیادہ ان گنت معدومات بھی ہیں، جنہوں نے ابھی تک وجود کا جامہ نہیں پہنا، مگر ان کا موجود ہونا ممکن ہے اور وہ کائنات خلق میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یہ ساری موجودات ومعدومات مل کر ایک اور انتہائی حاوی شامل اور محیط الکل کلی کے نیچے آئی ہوئی ہیں، اس جنس کا کلی نام علم خداوندی ہے، جو موجود معدوم سب پر حاوی ہے، پس موجودات عینی شکلوں میں موجود ومعدومات علمی صورتوں میں علم الٰہی میں سمائی ہوئی ہیں۔قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان دوکلموں میں ارشاد فرمایا، "**وأحاط بکل شی علماً**" (اور اللہ جل ذکرہ ہر چیز پر خواہ وہ موجود ہوچکی ہو یا نہ ہوئی ہو) اپنے علم سے محیط ہے۔

بہرحال اس مرتب نظام کائنات کی کائناتوں سے جس کی انتہا علم الٰہی پر ہے، ہم فائدہ تو ضرور اٹھا سکتے ہیں اور ضرور اٹھانا چاہئے، جبکہ یہ ہمارے لئے بنائی گئی، اور مسخر کی گئی ہیں، لیکن انہیں بدل ڈالنے کا تصور جنون اور حماقت سے کم نہیں جب کہ فطرت علمی ہو یا عملی نہ بدلنے کی چیز نہ بدلی جاسکتی ہے۔ "**لاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم والکن أکثر الناس لا یعلمون**" (اللہ کی خلقت میں تبدیلی ناممکن ہے یہی اس کا طریقہ اور مستحکم دین ہے لیکن انسانوں کی اکثریت جہالت میں پھنسی ہوئی ہے) ٹھیک اسی فطرت پر خدا کا نظام امر بھی ایک عجیب حکیمانہ ترکیب اور تنظیم کے ساتھ قائم ہے، جس میں مسائل جزئیہ کے افراد بھی ہیں، اور ان پر کلی انواع بھی، پھر انواع کے اوپر اجناس اور اجناس پر جنس الاجناس کا احاطہ بھی، جس سے دینی مسائل کی کثرتیں سمٹ کر وحدتوں کی طرف اور

وحدتیں سمٹ کر وحدت الواحدات کی طرف رجوع کئے ہوئے ہیں۔ اور دین مثل حسی کائنات کے ایک نہایت ہی منظّم اور مرتب روحانی کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔

دین کے لاکھوں افراد مسائل کو ان کی انواع سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً نماز ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں اور ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، حج ایک نوع ہے جس کے ہزاروں مسائل ہیں، جن پر سینکڑوں تصنیفات ہیں۔ مالیات ونفقات ایک نوع ہے جس کے نیچے ہزار ہا جزئی مسائل ہیں اور ان پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، زکوٰۃ، صدقات، خیرات اور ہدایا، قرض وامانت وغیرہ مستقل نوعیں ہیں جن کے نیچے ہزاروں مسائل آئے ہوئے ہیں، تدبیر منزل ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ولادت، رضاعت، تربیت اور روابط وعلائق کے ہزار ہا مسائل ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی انواع ہیں، جن کے نیچے طلاق نکاح وغیرہ کے ہزاروں مسائل ہیں۔ پھر انتظام مملکت اور تعزیرات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں سیاسی اور اجتماعی مسائل آئے ہوئے ہیں۔ پھر بین الاقوامی معاملات کے لئے خلافت ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں مسائل ہیں اور جن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور پھر ان تمام انواع کے اوپر اجناس ہیں اور اجناس کو پھر ایک جنس کلی نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

بہرحال دینی انواع نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، مہر، خلع، ولادت، رضاعت، تربیت، لین دین، بیع وشراء، وقف وہبہ، قرض، امانت، اجارہ، حدود، قصاص، کفارات وغیرہ وغیرہ کے لاکھوں جزئیات مسائل اور ان کی بے شمار عملی صورتیں اور نمونے ہیں، جن سے دینی کتابیں اور کتابوں سے دنیا کے لاکھوں کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، جن سے امت کی خصوصیت ہی کثرت تصنیف قرار پا گئی ہے، جیسا کہ بعض علماء امت نے دعویٰ کیا ہے۔

پھر ان انواع کے اوپر اجناس کلیہ ہیں، جن کے نیچے یہ تمام نوعیں آئی ہوئی ہیں، جیسے

اخلاق، اعتقادات، عبادات، منزلیات، معاملات، معاشرات، مدنیات، اجتماعیات اور آفاقیات وغیرہ، پھران ساری مصالح کلیہ کا تعلق صفات خداوندی سے ہے، جن کے تقاضوں سے یہ علل واسرار اوران سے یہ احکام نمایاں ہوئے، اور پھران تمام صفات الٰہی کا تعلق ایک ہی کلی الکلیات علم الٰہی ہے۔ جس کے واسطہ سے یہ سرانظام ذات بابرکات الٰہی سے جڑتا جاتا ہے اور خلق وامر کی ساری کثرتیں سمٹ کر ایک ہی ذات واحد پر جا کر منتہی ہوجاتی ہیں۔ اوراس طرح خلق وامر دونوں میں توحید الٰہی کا عقیدہ فطری طور پر خود بخود ثابت ہوجاتا ہے، جوانبیاء علیہم االصلوٰۃ والسلام کا موضوع بعثت ہے۔ ''کان دین الانبیاء لاالہ الا اللہ''۔ (سارے انبیاء کا دین لا الہ الا اللہ ہی رہا ہے۔)

اس لئے اسلام نے توحید کو محض شرعیات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عالم خلق میں بھی ایک ایک فعل، ایک ایک قول اور ایک ایک نیت اور ایک ایک ظاہری ہیئت تک وسیع کر کے توحید عملی کا مستقل نظام قائم کیا ہے، تاکہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر اوراس کی ایک ایک نقل وحرکت پر بندہ اپنے خدائے واحد کی طرف رجوع رکھے اور شرک کی آلائشوں سے ملوث نہ ہو۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ جیسے کائنات خلق کے اس فطری نظام میں، دخل اندازی انسانیت کی تباہی ہے اور جس طرح کائنات خلق اوراس کی اشیاء میں ترمیم وتنسیخ کا تصور یا عمل شرک اور خلاف توحید ہے، اسی طرح اس کائنات روحانی اوراس کے کسی جزوی مسئلہ میں بھی انسانی ترمیم وتبدیلی ایک کھلا شرک ہے جسے مٹانے کے لئے انبیاء معصومین مبعوث ہوئے۔

اس لئے جیسے کائنات خلق سے فائدہ ہی اٹھاسکتے ہیں، اسے بدل نہیں سکتے۔ اسی طرح کائنات امر، یعنی شرائع سے بھی فائدہ ہی اٹھاسکتے ہیں اور اٹھانا چاہئے، اسے بدل نہیں سکتے۔ اگر کسی ایک جز میں تغیر وتبدل کا تصور باندھا جائے گا۔ تو یہ جزوی ترمیم نہ ہوگی، جس کا ایک چھوٹا سا جزو یہ ہے، بلکہ شریعت کے نظام عمومی کا رشتہ، جب کہ ساری انواع

وجزئیات میں پرویا ہوا ہے، تو جس دانہ کو بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے گا، تو صرف وہ جزئی خرابی نہ ہوگی، بلکہ پوری مالا اور ہار کی بدزیبی اور بدنمائی ہوگی، جس سے ہار کی اصلی حسین شکل وصورت باقی نہیں رہ سکتی اسی درجہ میں روحانیت کی تباہی سامنے آجائے گی، جس کی صلاح وفلاح کے لئے یہ دین اتارا گیا ہے، بلکہ ان اصول وکلیات اوران کے واسطہ سے صفات الٰہی اوران کے توسط سے علم الٰہی میں تغیر وتبدل کر ڈالنے کے ناپاک عمل کے مرادف ہوگا، جو ناممکن ہونے کے علاوہ انتہائی خباثت اور خیانت ہوگی، کہ آدمی بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی حدود میں مداخلت کرنے کی شرارت کا مرتکب ہو۔ جبکہ پورے نظام دین ودیانت کا خاکہ، بحیثیت مجموعی ایک متصل واحد شیء ہے۔ اس کے کسی جزو کو چھیڑنا پورے نظام کو چھیڑنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک حوض کے متصل واحد پانی کی سطح پر اگر ایک سمت میں بھی، ایک ڈھیلا پھینک کر، اسے ہلا دیا جائے تو ناممکن ہے کہ یہ ایک سمت کی حرکت لہر بن کر درجہ بدرجہ دوسری طرف نہ پہنچے، اسی طرح یہ تمام اسلامی شعبے اپنے اپنے اصول وکلیات کے تحت، اور پھر یہ تمام اصول کلیات اپنے باہمی ربط سے جڑ کر، ایک کلی الکلیات کے تحت، باہم ایک دوسرے سے، اس طرح جڑے ہوئے اور گتھے ہوئے اور متصل واحد ہیں، کہ دین کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کے حقیر سے حقیر تغیر کا اثر بھی پورے نظام کے ڈھانچہ پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین خدائی آئین وقوانین کے مجموعے کا نام ہے جو بندوں کی ہدایت ورہنمائی اوران کی دنیا اور آخرت کی صلاح وفلاح کے لئے، بتوسط انبیاء معصومین بھیجا جاتا ہے۔ اسلام اسی دین کا اور آخری مکمل نقشہ یا بعنوان ودیگر تمام زندگی کے ہر ہر گوشے کے لئے دستور فکر وعمل بنا کر اتارا گیا ہے، جس میں جزئی احکام بھی ہیں اور اصول کلیات بھی، علل احکام بھی ہیں اور مصالح واسرار احکام بھی، ہر حکم کسی نہ کسی علت پر مبنی، اور ہر علت کسی نہ کسی حکمت پر مشتمل، ہر جزئی کسی نہ کسی فطری کلی کے نیچے آئی ہوئی ہے، اور ہر کلی اپنے وسیع

دامن میں ہزار ہا فطری جزئیات کا ذخیرہ لئے ہوئے، اس لئے دین ایک منظّم اور منضبط ضابطۂ حیات کی صورت سے ہے، جس کی تمام جزئیات کلیات کی طرف سمٹتی گئی ہیں، اور کلیات، جزئیات کی طرف پھیلتی گئی ہیں، اور آخر کار یہ ساری کلیات، اپنی جزئیات سمیت، ایک ہی کلی الکلیات یعنی 'علم الٰہی' سے وابستہ ہوگئی ہے۔

یہ منظّم اور ظاہر و باطن کی اصلاح کا مکمل الٰہی قانون، جس کا اہم ترین جز 'پرسنل لا' بھی ہے۔ جو چار حجتوں پر قائم ہے۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) سنت رسول اللہ (حدیث محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم) اجماع و قیاس، جو اجتہاد کے دائرے کی چیز ہے جس کا اصطلاحی نام 'فقہ' ہے۔

قرآن تشریعی اصل ہے، جس سے شریعت بنتی ہے۔ حدیث تشریحی اصل ہے، جس سے شریعت کھلتی ہے۔ فقہ تفریعی اصل ہے، جس سے شریعت پھیلتی اور منضبط ہوکر آئین کی صورت اختیار کرتی ہے۔ پس جس طرح ہر مسلم فرقہ کے ہاتھ میں کتاب وسنت ہے، اسی طرح کوئی فرقہ اجتہاد سے بھی خالی نہیں، کہ نئے حوادث سب کے لئے ہیں اور ان کے پیش آنے پر سب ہی اپنے اپنے اصول تفقہ سے مسائل کا استخراج اور استنباط ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے فقہ ہر ایک کا الگ الگ اور اصول فقہ جدا جدا۔ بناء بریں کسی بھی فرقہ کے لئے ان چار حجتوں سے چارۂ کار نہیں، البتہ ان چار حجتوں میں سے پہلی دو اصلیں، یعنی کتاب وسنت 'وحی الٰہی' جو بواسطۂ ملک یا بکلام خداوندی قلب نبوت پر اتری ہیں اور دوسری دو اجتہادی اصلیں یعنی اجماع و قیاس 'القاء ربانی' جو کتاب وسنت کے علم راسخ، عقل صافی اور تقویٰ شعار ذوق و وجدان پر وارد ہوتی ہیں، اس لئے اسلام میں ایک شرائع اصلیہ ہیں، جو پہلی دو اصلوں سے متعلق ہیں۔ اور شرائع فرعیہ ہیں، جو دوسری دو اصلوں سے وابستہ ہیں، مگر وہ پہلی ہی دو اصلوں سے ملحق اور ان ہی پر متفرع ہیں۔

اندریں صورت ان چار اصولوں میں سے کسی ایک کو بھی غیر شریعت کہنے کی جرأت

نہیں کی جاسکتی۔ اور جو حصہ اجتہادی فرعیات کا ہے، خواہ وہ کسی بھی فرقہ کا ہو، وہ جب کہ اس کے علم و یقین کے مطابق، کسی نہ کسی قرآنی یا حدیثی کلیہ سے یا کسی جزئی حکم کی علت جامعہ سے، بتوسط اجتہاد نکلا ہوا ہے، تو کتاب وسنت ہی میں سے نکلا ہوا، اس کا جزو ہوگا۔ جس سے واضح ہے کہ کہ مجتہد کا فعل صرف استخراج و استنباط مسائل ہے، ایجاد مسائل نہیں، مخفی مسئلہ کا بتانا ہے، بنانا نہیں۔ اندریں صورت کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیر شریعت کہا جائے، اور اسے شرعی حجت نہ مانا جائے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان تمام شرعی حجتوں کا درجۂ حجیت یکساں نہیں ہے، لیکن اس فرق سے چاروں کی نفس حجیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جبکہ تمام اجتہادی عناصر بالواسطہ اور بلاواسطہ کتاب وسنت ہی سے وابستہ ہیں، جو اس دین کی حقیقی اصلیں ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا عظیم احسان ہے، کہ اس نے اس امت میں ایسے مخصوص ورثاء انبیاء بھی ہر دور میں پیدا کئے، جنہوں نے وحی الٰہی کو جہاں بکمال صحت درایت وسند بامانت ہم تک پہنچایا، وہیں اس وحی خداوندی کی چھپی ہوئی جزئیات بھی بکمال روایت وتفقہ کھول کر امت کے سامنے رکھ دیں۔ پس جس طرح وحی کی درایت کو حفاظ اور محدثین نے ہم تک پہنچایا، اسی طرح اس کی درایت کو فقہائے ملت نے ہم تک پہنچادیا۔ اگر ان کی پہنچائی ہوئی روایت، شریعت الٰہی کا اہم جزو ہے، تو یہ درایت بھی شریعت کا دوسرا اہم جزو مانی جائے گی، اس لئے ان چار حجتوں، اور ان سے ثابت شدہ احکام میں سے کوئی ایک چیز بھی بوجہ شریعت ہونے کے، ایسی نہیں رہتی، جو انسانی ترمیمات کی گرفت میں آسکے۔ ورنہ یہ فطرت کی تبدیلی کے مرادف ہوگا۔

اسی لئے ہم نہ صرف مسلمانوں، بلکہ اس ملک کے عظیم رہنماؤں اور دانشور حکام سے یہ کہتے ہیں کہ اور بڑے خلوص سے کہتے ہیں، کہ ہم یکساں 'سول کوڈ' کے منصوبے کو مسترد کرکے، اپنے اس عقیدہ کا اعلان کرتے ہیں، کہ 'مسلم پرسنل لا' میں پارلیمنٹ کے ذریعہ

سے ہو، یا حکومت کے راستے سے، یا کسی اسمبلی کی سفارش سے، کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اسلام کا قانون فطرت الٰہی پر قائم ہے اور وہ ناممکن التبدیل ہے۔ 'فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله (اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے انسانوں کو بنایا۔ خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی ہے سیدھا دین، لیکن انسانوں کی اکثریت، اس سے جاہل اور ناواقف ہے۔)

اس دور جہالت و نادانی کا نتیجہ ہے کہ دین سے جاہل اور ناواقف اور بزعم خود واقف کار ایک طبقہ کچھ جزئیات لے کر کھڑا ہوا ہے اور ان میں ترمیمات کا مطالبہ کر رہا ہے۔ گویا اسے سارا دین چھوڑ کر جب اس میں کہیں بھی انگلی رکھنے کی جگہ نہ ملی تو ان چند جزئیات کو ہدف بنا کر سامنے آیا۔ اور بزعم خود اس نے گویا بڑی فلسفیت اور زعیمی کا کارنامہ انجام دیا، لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان ساری خرابیوں کی جڑ اور بنیاد مذہب کے بارے میں ان لوگوں کا سیاسی تصور ہے۔ یہ لوگ دین اور خدائے برتر کو بھی معاشرتی نقطۂ نظر اور پیٹ ہی کی خاطر سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے ایک کلیہ ایجاد کر رکھا ہے، جس کے یہ گل کھل رہیں۔ اور وہ یہ کہ مذہب انسان کا ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اس تصور کی نامعقولیت سے تھوڑی دیر کے لئے الگ ہو کر، اس کے آثار کو دیکھا جائے، تو مشاہدات ہی سے اس کے اصول کا کھوکھلا پن سامنے آجاتا ہے۔ اس کے آثار میں پہلی مہلک صورت حال تو یہ پیدا ہوگی، کہ پرائیوٹ معاملات میں ظاہر ہے کہ صرف عبادات اور اذکار ہی مذہب میں داخل رہ سکیں گے، بقیہ دین کے تمام شعبے جیسے معاملات، مالیات اور وہ تمام رابطے کہ جس میں انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے، دین سے خارج ہو کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائیں گے، وہ جس طرح چاہیں گے اپنی من مانی کارروائی کر سکیں گے۔ یہی وجہ کہ انسان اگر رات بھر نفلیں پڑھے اور دن بھر ذکر و تلاوت میں مصروف رہے، تو ان لوگوں پر اور ان کے کاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نہ ان کی روٹی بند ہوتی ہے۔ نہ ان کی تنخواہیں رکتی ہیں اور

نہ ان کے نظام میں کوئی فرق پڑتا ہے، لیکن جونہی انسان اس مفروضہ پرائیویٹ حد سے نکل کر میدان معاملات میں اترتا ہے، تو یہ لوگ فوراً قانون کے دفتر اور شکوک و شبہات کے پشتارے اور رکیک تاویلات کے ڈھیر لے کر پہنچ جاتے ہیں، تاکہ ایک سادہ لوح انسان اپنے دینی طرز فکر اور فکری طرز عمل پر جم نہ سکے، اور ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے، اس کا مضر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادات کو چھوڑ کر دین کے بقیہ تمام شعبے، ان کے اختیار اور تصرف میں آجائیں، اور اسلام جیسا جامع دین اور مکمل دستور حیات، جس کی بشارت انبیاء سابقین دیتے آرہے تھے، ان حدثاء الثنان سفهاء الاحلام (نوخیز ناتجربہ کار اور خام عقل لوگوں) کے ہاتھوں میں پڑ کر ناقص و ناتمام اور آدھا، تہائی رہ جائے۔

دوسری مہلک صورت یہ پیدا ہوگی کہ جب لوگ اسلام کے تمام معاملاتی اور اجتماعی کاموں کو اپنی ناقص رائے اور جزوی عقلوں سے طے کرنے لگیں گے تو دین وحی الٰہی اور نقل صحیح کی حکومت سے نکل کر عامۃ الناس کی عقلوں کے زیر حکومت آجائے گا، حالانکہ دین وحی خداوندی اور مستند نقل صحیح کی بنیادوں پر قائم ہے، نہ کہ عقلی اختراعات اور اوہام و خیالات پر، جس سے ان کے لئے دینی شعبوں میں کتر بیونت کی گنجائش پیدا ہو۔

تیسرے یہ کہ عقلوں میں تفاوت ایک مشاہد بات ہے۔ عوام ہوں یا خواص، عقلیں سب کی ایک درجہ کی نہیں ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ جب دین اور اس کے تمام معاملاتی پہلوؤں کا محور یہی جزوی عقلیں ہوں گی تو دین طرح طرح کے خیالات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا اور جتنی عقلیں موجود ہوں گی اتنے ہی مذہب تیار ہو جائیں گے، جس سے نفس دین تو سرے سے گم ہو کر رہ جائے گا، ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ اسلامی دستور کی کوئی نوع اور نوع کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں، جس میں قانون کے ساتھ اخلاق کا رنگ گھلا ہوا نہ ہو، حتی کہ اجتماعی اور سیاسی احکام کے ساتھ بھی کتاب و سنت میں تقویٰ، طہارت، خشیت اللہ، رضا جوئی حق، اور یادگاری آخرت کا جوہر شامل ہے، جس سے یہ تمام

احکام ہم رنگ عبادت بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوری عقلیں اور وہ بھی بے قید، بے فکر، بے ذوق اور آزاد منش لوگوں کی دین مرتب کریں گی، تو اس میں فلسفیت اور فلفیست بھی نہیں۔ بلکہ سفسطیت، تو کسی حد تک ضرور آجائے گی۔ لیکن اخلاقیت کا کوئی شمہ شامل نہ ہوسکے گا اور اس طرح یہ نام نہاد دین سارا عام دنیوی قوانین کی طرح ایک روکھا پھیکا رسمی قانون اور دنیاوی دستور بن کر رہ جائے گا۔ جس میں دیانت، قرب الٰہی، محبت خداوندی اور آخرت کے آثار کی کوئی گنجائش نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ اسلام نے مذہب کا جو تصور دیا ہے، وہ اس تصور سے یکسر مختلف اور اس کے منافی ہے۔ اسلام ہرگز اس کا قائل نہیں، کہ بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو دو، اور پوپ کا حصہ پوپ کو دو، بلکہ اس نے بادشاہ اور پوپ کے سب حصے ختم کر کے، صرف ایک ہی واحد قہار خدائے لم یزل کا حصہ دین و دنیا دونوں میں قائم کیا ہے۔ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا ایک ہی ذات واحد کی طرف اپنی نیت اور عمل اور طرز فکر و نظر کا رخ رکھنا اس نے سکھایا، اس کے نزدیک کے مذہب انسان کا کوئی نجی یا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے۔ جس سے دنیوی زندگی کے معاملات خارج ہوں، بلکہ عالم انسانیت کی صلاح وفلاح کا ایک کھلا دستور ہے، جس میں ولادت سے لے کر وفات تک کے تمام معاملات اور نشیب وفراز اس کی حدود میں داخل ہیں۔ قرآن کریم کا کھلا اعلان ہے: ''**قل إن صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العٰلمین. لاشریک له وبذلک أمرت وأنا أول المسلمین**''. اس میں امہات عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے ساتھ بقیہ تمام عبادت موت وحیات کے درمیان ہر ایک نقل وحرکت، کھانا پینا، رہنا سہنا، ملنا جلنا، دوستی دشمنی، قومی اور بین الاقوامی معاملات سب کو دین کا جزو بنا کر، اسلام کہا گیا ہے اور سب کے حقوق کے بارے میں چاہے وہ انفرادی ہوں یا اہلی، پڑوس کے ہوں یا دوسری اقوام کے، بین الاقوامی ہوں بین الملی، جامع قوانین پیش کئے، جن سے قرآن کریم کتب حدیث اور کتب فقہ بھری ہوئی ہیں۔

اس لئے مذہب اور بالخصوص اسلام کو آدمی کا کوئی نجی اور پرائیویٹ معاملہ کہنا پورے اسلام کا تار و پود بکھیر دینا ہے، جسے اسلام قبول نہیں کرسکتا۔ اگر یہ نام نہاد مصلحین یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتے ہوں، کہ ہندوستان کا قانون آدمی کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اس میں جس کا جو جی چاہے، تغیر وتبدل کرسکتا ہے، تو دین اور خدا کے قانون کے بارے میں انہیں یہ جرأت کیوں ہے؟

بہرحال پرسنل لا کی ان جزئیات کے بارے میں شکوک وشبہات کی تو الحمدللہ علماء نے قلعی کافی کھول دی ہے، جو آپ حضرات کے سامنے آئے گی۔ مجھے تو اس موقعہ پر یہ عرض کرنا ہے، کہ یہ جزئیاتی یا جزوی ترمیم کے خواہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر درحقیقت ان جزئیات کو اصول کے اور ان کے واسطے سے اسلام کے پورے نظام کو چیلنج کر رہے ہیں، جن کے نیچے یہ ساری جزئیات آئی ہوئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس قسم کے جزوی منصوبوں کو لے کر کوئی دانا دشمن یا ناداں دوست کھڑا ہوا تو علماء حق نے اس حقیقت کو بھانپ کر، اس کا سامنا کیا اور کسی بھی سکوت واغماض سے کام نہیں لیا۔

ہندوستان میں انگریزی اقتدار آنے پر حالات بدلے، ان کے مسائل ہی نہیں، بلکہ نئے نئے الحادی نظریات اور لادینی کے نئے نئے جذبات دلوں میں ابھرنے شروع ہوئے اور چند دن کے بعد ایک مستقبل گروہ، ان کے انداز فکر وعمل کا تیار ہوگیا، جس نے نہ صرف اسلامی انداز فکر وطرز معاشرت کو ترک کیا، بلکہ رفتہ رفتہ اسلامی معتقدات کو بھی ہدف ملامت بنانا شروع کردیا۔

لیکن حق تعالیٰ جزائے خیر دے امت کے علماء ربانی اور مشائخ حقانی کو، جنہوں نے اپنی فراست باطنی سے اندازہ لگا کر تحفظ دین کی داغ بیل ڈال دی۔

بالخصوص اسلامی مسائل میں عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کو علماً وعملاً محفوظ کردینے کا

ایک حصار قائم کردیا ہے، جو آج تک قائم ہے، اس لئے مسلم پرسنل لا کا مسئلہ پندرہ بیس سال پرانا نہیں، جیسا کہ بعض حضرات یہی خیال کئے ہوئے ہیں اور اسے علماء کی خاموشی اور شکوے کے ساتھ، ان کی بے توجہی کو پیش کرتے ہیں، بلکہ یہ مسئلہ اور علماء کی طرف سے اس کے بارے میں اقدام ودفاع سو سال پرانا ہے۔

چنانچہ 1857 کے بعد جب انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوگیا، تو ان ورثاء انبیاء نے سب سے پہلے مسلم پرسنل لا ہی کے تحفظ کی فکر کی۔

1867 میں جب دارالعلوم، دیوبند کی بنیاد پڑی، تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ نے سب سے پہلے، ان ہی عائلی قوانین کے اجرا کی فکر کی۔ ان مقدسین سے یہ تو بعید تھا کہ وہ اسلام کے عائلی قوانین کی برقراری، اور اجراء کے لئے انگریز سے التجا کرتے، اس لئے اسی ابتدائی دور میں حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم ہی میں غیر رسمی انداز سے عہدۂ قضاء قائم کیا اور دارالعلوم کے اولین صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کو قاضی مقرر فرمایا، جس کے تحت پرسنل لاء کے عائلی مسائل اور الجھے ہوئے معاملات، شرعی اصول پر طے ہونے لگے۔ انگریزوں کی طرف سے رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ مسلمان نامی لوگوں ہی کو، اس سلسلہ کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھایا گیا، بالآخر تغیر احوال سے ان کے دور کے ساتھ، اس نظام کا دور بھی ختم ہوگیا، لیکن مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی جو داغ بیل، ان بزرگوں نے ڈالی تھی، وہ دلوں کی زمین میں قائم ہوگئی، گو اس کے خلاف کی داغ بیل بھی اسی وقت سے مسلم صورت افراد کی طرف سے پڑ چکی تھی، اس لئے مسلم پرسنل لاء کے بارے میں مرض اور علاج دونوں ہی سو برس پرانے ہیں۔

انگریزوں کے اقتدار پر نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ہندوستانیوں میں سیاسی حقوق طلبی کا داعیہ پیدا ہوا، عامۃً سیاسی جماعتوں نے سیاسی مطالبات پیش کئے، لیکن مذہبی مطالبات کو نظر انداز کردیا، جس سے ان دینی حقوق اور بالفاظ دیگر پرسنل لا کے کالعدم

ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان بدلتے ہوئے حالات میں علمائے دیوبند نے اپنے اسلاف کے نقش قدم کو سامنے رکھ کر خود اسی مسئلہ پر میمورنڈم تیار کیا، جو دس دفعات پر مشتمل تھا۔ نومبر 1917 میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند، کی سربراہی میں ایک مؤقر وفد دہلی پہنچ کر وزیر ہند سے ملا اور میمورنڈم پیش کیا، جس میں صفائی سے پہلے ہی ظاہر کردیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے جو شرعی قوانین سے متصادم ہو، وہ ہمارے لئے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

اس میمورنڈم میں بنیادی مطالبے دو تھے، ایک یہ کہ ہندوستان میں پرسنل لا کے اجراء کے لئے محکمۂ قضاء قائم کیا جائے۔ چونکہ شرعی اصول پر بہت سے مسائل کی تنفیذ کے لئے مسلم حاکم شرط ہے، اس لئے قاضیوں کا انتخاب وتقرر اہل سنت والجماعت سے ہو، لیکن اس کونسل میں ہر فرقہ کے علماء نمائندے اور ممبر ہوں اور مسائل کا فیصلہ ہر فرقہ کے اپنے فقہی اصول پر ہو۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر، مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہ عام کے اداروں کے تحفظ ونگرانی ونظم نسق کے لئے 'شیخ الاسلام' کا عہدہ قائم کیا جائے، جو ان تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ چلانے کا ذمہ دار ہو۔

ان مطالبات پر اس دور کے تقریباً 5 سو علماء کے توثیقی دستخط حاصل کئے گئے، جو آج بھی دارالعلوم دیوبند کے 'محافظ خانہ' میں موجود ہے۔

اس کے بعد 1929 میں ہندوستان میں مسلم اوقاف کی تنظیم کا مسئلہ اٹھا، جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک اہم جزو تھا، گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی، جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے۔ اس کا یہ استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے۔ اس کا یہ استفساری مراسلہ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند کے نام موصول ہوا، جس کا ایک اصولی جواب انہوں نے روانہ کردیا۔

فروری 1930 میں جب مجھے دارالعلوم کا اہتمام تفویض کیا جاچکا تھا، حضرت ممدوح کے وصال کے بعد اس مراسلت کا سلسلہ مجھ سے قائم ہوا۔ اور تا اختتام کار احقر ہی سے جاری رہا، اس پر وقف کے مسائل کی تفصیلات مرتب کرائی گئیں۔ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی قیادت میں سرکاری مسودہ وقف کے بل پر تنقید کے ساتھ پیش کردہ اشکالات کا تحریری حل پیش کردیا گیا اور ساتھ ہی احقر ناکارہ نے ایک تحریر بھی بنام 'الانصاف فی قانون الاوقاف' پوری جماعت کی طرف سے مرتب کی، جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ثبت ہوئے۔ احقر ہی نے اس پر مقدمہ لکھا اور یہ ساری کارروائی ایک کتابچہ کی صورت میں طبع کرا کر شائع کی گئی۔ اور ممبران اسمبلی کے نام بھی ارسال کی گئی اور اس سلسلہ میں مناسب وقت تمام مساعی عمل لائی گئیں، جس کی جملہ کارروائی ایک مطبوعہ کتابچہ کی صورت میں 'محافظ خانہ' دارالعلوم میں محفوظ ہے۔

پھر برطانوی حکومت ہی کے زمانہ میں شاردا ایکٹ کا مسئلہ اٹھا، جو پرسنل لا کا ایک مستقل جزو تھا۔ علماء دیوبند نے اس پر مضامین لکھے اور حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے ایک مستقل رسالہ شاردا بل کے بنیادی محرکات اور عمر نکاح کے شرعی قانون میں ترمیم کئے جانے کی تردید کے ساتھ، اس پر پیش کردہ اشکالات کا حل پیش کیا۔ اور اس پر مناسب وقت جدوجہد کی گئی۔ پھر برطانیہ ہی کے دور میں، ان ہی عائلی مسائل کو شرعی قوانین کے مطابق طے کرنے کے لئے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے بہار میں 'امارت شرعیہ' قائم فرمائی، جو آج تک الحمدللہ قائم ہے اور آج اس کے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ہیں، جو آپ کے سامنے موجود ہیں، یہ امارت مسلم پرسنل لا کی عملی صورت ہے، جو ترمیم وتبدیلی کے اوہام وخیالات کا عملی جواب بنی ہوئی ہے۔

پھر انقلاب 1947 سے کچھ قبل علماء دیوبند کی طرف سے حضرت تھانوی نے رسالہ 'الحیلۃ الناجزۃ' شائع کرایا، جس میں ظالم خاوندوں سے، بے کس اور بے بس عورتوں کی

گلوخلاصی کی شرعی صورتیں یکجا فرمائی اور اسی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند میں علماء کی ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس نے ان ہی شرعی اصولوں کی روشنی میں فیصلے کرکے، سینکڑوں عورتوں کو رہائی دلائی اور ان کی مشکلات کا قرار واقعی حل کیا۔

پھر 1947 کے انقلاب اور تقسیم ملک کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے 'تنسیخ زمینداری' کا مسئلہ اٹھا، جس کا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑتا تھا۔ جو پرسنل لا ہی کا بنیادی جزو تھا، اس بارے میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ایک وفد، جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا، دہلی میں مولانا آزاد مرحوم کی خدمت میں پیش ہوا اور گفت وشنید کی، پھر مولانا ہی کی ہدایت پر دوبارہ یہی وفد لکھنؤ جاکر پنڈت پنتھ 'وزیراعلیٰ یوپی' سے ملا اور بموجودگی دیگر وزراء یوپی کونسل اور چیئرمین اوقاف کے مسئلے میں بحث وتمحیص کی۔

غرض علماء حق نے 'نهی عن المنکر' کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور اس عائلی قوانین کے مشترک، منصوبہ کو خلاف شرع ہونے کی وجہ سے بڑی قوت سے چیلنج کیا۔ مضامین اور مقالات شائع کئے اور آخر کار مسلم پرسنل لا کے تمام مسائل پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دارالعلوم دیوبند نے ایک مبسوط رسالہ بنام 'ہمارے عائلی مسائل' شائع کیا، جس میں ان تمام پیش پا افتادہ موانع کو، جن کی آڑ میں ترمیم قانون کی صدائیں بلند کی گئی تھیں، معقول اور منقول انداز سے رد کرکے ان کا شرعی حل پیش فرمادیا۔

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ عائلی مسائل اور پرسنل لا کے مرض نے جو روپ بھی اختیار کیا، علماء امت نے، اس کے معالجہ اور اصلاح میں قلمے، سخنے، درمے قدمے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

آج پرسنل لا پر وہی وقت پھر گزر رہا ہے، جو سو برس میں بارہا گزرا اور وہی علماء اس سلسلہ میں پھر کھڑے ہوئے ہیں، جو پہلے سے مدافعت کرتے چلے آرہے ہیں، نیز آج بھی وہی مسلم کہلانے والے چند لوگ اس کی ترمیم کے نعرے لئے ہوئے کھڑے ہیں، جن کا

پرانا روگ ایک ہی تھا، اور وہ شرعی مسائل کو لادینی فکر، معاشی یا سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور سوچنا اور اسی خاکہ پر قانون شرعی کو ڈھالنے کی سعی کرنا، درآں حالیکہ وہ ان مسائل اور ان کی حقیقی بنیادوں سے نہ قطعاً واقف ہیں اور نہ ہی ان کے سمجھنے کے ذوق سے آشنا ہیں۔

پرسنل لا کا علمی جائزہ لینے اور اس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لئے حضرات اساتذہ ارباب افتاء دارالعلوم دیوبند کی ایک کمیٹی بنام 'پرسنل لا کمیٹی' بنادی گئی، کہ وہ ان مسائل کے بارے میں آج کے شکوک وشبہات کا مواد فراہم کرکے، مدلل دفاع کا فریضہ انجام دیں، چنانچہ کمیٹی نے اپنا کام خاطر خواہ طریقہ پر مکمل کرکے پیش کردیا۔ کمیٹی کے سامنے چند بنیادی امور رہے، جن کو بطور اصول موضوعہ احقر نے لکھ کر بھیج دیا تھا۔

کمیٹی نے انہیں اصولوں کی روشنی میں کام کیا اور امکانی حد تک پرسنل لا کے زیر بحث مسائل کی جمع وترتیب کے ساتھ زبان زد اشکالات ومواقع اور ان کے شرعی جوابات کا مواد فراہم کرکے اسے مرتب کردیا۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان مسائل کے خلاف جس شوراشوری سے مشکلات کا ڈھول پیٹا جارہا تھا، ان میں سے کوئی ایک مشکل بھی، کمیٹی کے سامنے ایسی نہیں آئی، کہ اسے عام معمول بہ پہلو کے خلاف کسی دوسرے غیر معمول بہ پہلو کی ترجیح وانتخاب سے کام لینا پڑا ہو، کیونکہ عموماً پیش کردہ مشکلات کچھ تو ازقسم حیلہ جوئی ہیں کہ اپنی سہل انگاری اور کم ہمتی کی وجہ سے لوگوں نے عمل تو خود نہیں کیا اور خودساختہ مشکلات کا الزام شریعت کے سر تھوپ دیا۔ ظاہر ہے کہ ان مشکلات کو تقاضائے نفس تو کہا جاسکتا ہے، لیکن تقاضائے فطرت یا مقتضائے حق کہنا بہت مشکل ہے۔

بعض مشکلات رسمی اور رواجی قسم کی ہیں، جو رسم ورواج کی کورانہ پابندیوں، ماحول کی خرابیوں اور غیر طبعی جکڑ بندیوں سے پیدا شدہ ہیں، مگر جب کہ شریعت کا موضوع ہی جاہلانہ رسوم رواج کو مٹا کر اسوہائے نبوت پر دنیا کو لگانا ہے، تو شریعت کو تو حق ہے کہ ان رسوم اور

ان کے ماحول میں ترمیم تغیر کرے، لیکن رسوم ورواج کو قطعاً حق نہیں ہے کہ وہ شریعت میں ترمیم کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔

بعض مشکلات خیالی اور وہمی قسم کی ہیں کہ ایک طبقہ کو مظلوم اور محروم فرض کرکے شریعت کے دئے ہوئے حق سے اسے زائد حق دلوائے جانے کا شور مچایا گیا ہے، درآں حالیکہ اسے مقرر حق سے زائد حق دئے جانے میں کتنے ہی دوسرے اہل حقوق کی حق تلفیاں مضمر ہیں۔

مگر شک اندازوں کے سامنے زباں زد طریق پر حقوق کی کمی کا پہلو تو آگیا، مگر لاعلمی کی وجہ سے تلافی کا پہلو نہ آیا، درآں حالیکہ شریعت ہر انسانی طبقہ کو اس کی خلقی اور فطری اور ساتھ ہی عقلی اور شعوری خصوصیات کے بہ ہی قدر حقوق واختیارات وفرائض عطا کئے ہیں جو کمال عدل اور اعتدال پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ معتدل اور جامع احکام سے روگردانی اور تجاوز ہی کا نام افراط وتفریط اور ظلم ہے اور جسے مٹانے کیلئے یہ فطری شریعت بھیجی گئی ہے۔

بہرحال پرسنل لا کے مسائل کے سلسلے میں جس قدر بھی زباں زد مشکلات کمیٹی کے سامنے آئیں، ان میں کوئی بھی شکل اصولی رنگ لئے ہوئے نہیں تھی اور اگر اصولی رنگ بھر کر کسی چیز کو اصولی بنایا بھی گیا تو وہ فرضی اور خودساختہ اصول سے بااصول کہلائی گئی تھی، غرض نہ کوئی جزوی مشکل سامنے آئی اور نہ اصولی۔ بلکہ محض ناتربیت یافتہ دماغوں کی اپج لاعلموں کی خیالی مشکلات، بےعملوں کی حیلہ جوئی اور اسیرانِ رسوم ورواج کی پہلو بھی اور یا پھر دانا دشمنوں کی خوردہ گیریاں تھیں، جن کی وجہ سے قانونی توسعات تلاش کرنے کی کمیٹی کو کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں دو ہی قسم کے مسائل ہیں یا کتاب وسنت میں منصوص ہیں یا کتاب وسنت سے ماخوذ۔

منصوص مسائل میں تو کسی ترمیم وتبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کتاب وسنت

کا کوئی بدل ہی ممکن نہیں ہے، اجتہادی مسائل تو اجتہادی کا بدل اجتہاد ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اصل اجتہاد پر عمل کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے، لیکن اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو اجتہادی مسائل میں بھی انتخاب وترجیح کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ رد وبدل یا ترمیم وتنسیخ کا سوال پیدا ہو۔

کمیٹی کے سامنے اس قسم کا سوال ہی نہ تھا اور نہ ہی مسائل کے خلاف کوئی علمی یا عقلی مشکل اور رکاوٹ ہی سامنے آئی تو اسے مسائل میں تبادل یا ترجیح وانتخاب کی گنجائش تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔

اس کنونشن کا بنیادی مقصد پرسنل لا تحفظ اور فتنہ ترمیم سے اس کا بچاؤ کرتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے اہل علم وفضل اور دانشوروں کو یہ اعلان کرنا ہے کہ مسلمانان ہند بہمہ مکاتیب فکر اپنے پرسنل لا سے نہ کسی حالت میں دستبردار ہوسکتے ہیں، نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم وتبدیلی گوارا کرسکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے مشترک قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جو پرسنل لا کے کسی ایک جزئیہ پر بھی اثر انداز ہو، خواہ وہ سول کوڈ ہو یا بالواسطہ قانون سازی۔

بالفاظ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، جن پر ان کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور ان کا ممتاز شرعی اور قومی امتیاز قائم ہے۔

رہے وقت کے تقاضے تو اسلام کے جامع اور معتدل احکام میں وقت کے کونسے تقاضے ہیں، جو پورے نہیں ہوئے یا نہیں ہوسکتے۔ نزول وحی کے بعد سے اب تک چودہ قرون میں وہ کونسی ایسی مشکل اور کونسا ایسا حادثہ ہے، جس کے پیش آنے پر قرآن وحدیث اور اس سے مستنبط شدہ علوم نے قرار واقعی رہنمائی نہیں کی اور فتنوں کا استیصال نہیں کیا۔ لیکن جہاں شک اندازوں کو دین یا دین کی تاریخ کی خبر ہی نہ ہو اور وہ دین سمجھنے، سمجھانے کے راستے ہی نہ چلیں، بلکہ اسی دینی لاعلمی اور بے بصیرتی پر قناعت کرکے اس ہی کو علم سمجھتے رہیں، درآں

حالیکہ وہ جہل مرکب ہے علاج ہی کیا ہوسکتا ہے پھر جو شبہات وہ اٹھا رہے ہیں، وہ آج کے حوادث بھی نہیں اور کچھ نئے بھی نہیں ہیں، جو پیش نہ آچکے ہوں صرف روپ کا فرق ہے۔

وہی فتنہ لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

چنانچہ شک انداز اگر کسی اصلی روپ میں بھی سامنے آئے تو انہیں ہمیشہ منھ کی کھانی پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہود ونصاریٰ حجت وبرہان سے سامنے آئے، مگر اسلامی حجتوں کے سامنے عاجز ہوکر پسپا ہوئے۔ اس سے کام نہ چلا تو اسلام کے خلاف جنگیں لڑیں۔ سازشیں کیں، بالآخر شکوک وشبہات پیدا کرکے مسلمانوں کو ڈگانا چاہا، مگر ناکام ہوئے، بالآخر انہوں نے نفاق کے راستے سے حملہ آوری کا میدان ہموار کیا۔ اور مسلمانوں میں ایسے گروہ کھڑے کردیئے جنہوں نے اسلام ہی کے نام پر اسلام کے خلاف شور مچایا اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کی۔ یہی روش آج بھی اختیار کی گئی ہے اور مسلم نامی افراد کی طرف سے شک اندازی کرکے مسلمانوں کو ورغلانے کی سعی کی جارہی ہے، لیکن اسلام کے فطری اصول کی کسوٹی پر پرکھ کر علماء اسلام نے جیسے ہر ہر زمانہ میں اس قسم کے دورخے لوگوں کے حربوں کو ناکام بنایا ہے اسی طرح آج بھی وہ اسی قسم کے منافقانہ حملوں کی زد سے اسلام کو محفوظ رکھ کر ان حربوں کو ناکام بنانے کی قدرت رکھتے ہیں، اور ان شاء اللہ یہ سب حربے ضرور ناکام ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ آج اس فطری قانون الٰہی کے خلاف بے بصیرتی سے شکوک وشبہات کے میدان ہموار کرکے انہیں ناقابل تسلیم اور ناقابل عمل باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں، لیکن کسی بھی صحیح فکر وخیال یا نظریہ وعقیدہ کی راہ میں پیش آمدہ دشواریوں، ماحول کی ناسازگاریوں یا اس کے دلائل وبراہین سے لاعلمی وبے بصیرتی کسی درجہ میں بھی اس سے دست برداری کے لئے وجہ یا معقول بنیاد قرار نہیں پاسکتی۔

پرسنل لاء کے بارے میں سرکاری طور پر گو یہ بھی اعلان ہے کہ اس میں مسلمانوں کی مرضی

کے بغیر کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہیں ہوگی، لیکن ساتھ ہی بالواسطہ قانون سازی کے ذریعے تبنیت اور سرکاری ملازمین کے لئے نکاح ثانی کے حق پر پابندی نے جو پرسنل لا میں عمل ترمیم کا آغاز ہے پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کی تشویش کو حق بجانب بنادیا ہے۔ اس لئے وہ متفقہ آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے اور جس کی گونج ان شاءاللہ رائیگاں نہیں جائے گی۔

شک اندازوں کے مضمرات اور دلوں کے چور کو سمجھنے کے لئے یہ پیش نظر رکھ لینا کافی ہے کہ مذہب اور دین کے بارے میں ارباب سیاست کا وضع کردہ مذہبی تصور یہ ہے کہ مذہب انسان کا ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے، یہ تصور درحقیقت انہوں نے محض اپنے سیاسی مقاصد کو مذہب کی دستبراری سے محفوظ رکھنے کے لئے وضع کیا ہے، ممکن ہے کہ کوئی مذہب ایسا ہی پرائیوٹ ہو، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے میں تفصیل سے اوراق سابقہ میں عرض کرچکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا تصور اس تصور سے یکسر مختلف ہے وہ اپنے دائرہ وتربیت سے کسی گوشۂ حیات کو باہر تسلیم نہیں کرتا اور یہی اسلام کے کامل اور مکمل مذہب اور دستور حیات ہونے کی بڑی دلیل ہے جس کا نعرہ قرآن نے ''**ونزلنا علیک الکتاب تبیٰناً لکل شی وھدی ورحمة وبشریٰ للمسلمین .**'' کے پاکیزہ کلمات سے لگایا ہے اور جس کی اصولی وضاحت سطور سابقہ میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے دائرہ حکم وتربیت سے کسی گوشہ زندگی کا مستثنیٰ نہ ہونا ہی غرض مند سیاست کی راہ میں سنگ گراں بن رہا ہے، اور اسلام ہی سنگ گراں بن بھی سکتا ہے، لیکن اس پر یقین واطمینان کیا جائے کہ اس کے برخلاف یہ دماغی گمبھیر کے افکار ونظریات اور فلسفہ وسیاست کے شاطرانہ حربے نہ کبھی کامیاب ہوئے ہیں نہ آج ہوں گے۔

چونکہ اسلام اپنے احکام کی نقل وعقل معقولیت ومنقولیت، مادیت وروحانیت انفرادیت واجتماعیت، عبادت ومعاشرت رابطہ انسانی اور علائق ربانی کا وہ حسین امتزاج ہے جو عقل انسانی کو صحت مند روایات کے ساتھ ساتھ حجت وبرہان اور روایت سے مطمئن

کرکے دعوتِ قبول دیتا ہے، اس لئے مسلمانوں کا تعلق اسلام سے پہلے فطری ہے پھر جذباتی، جب کہ بالعموم روایاتی خوش عقیدگی کی بنیادوں پر قائم شدہ مذاہب سے ان کے پیروؤں کا تعلق اول وآخر جذباتی ہے۔ اس لئے جب انہیں جذبات سے الگ کرکے خالص عقل ونقل کی کسوٹی پر رکھا جاتا ہے تو وہ پورے نہیں اترتے، اس لئے ان میں بے تکلف ترمیم تنسیخ اور ردو بدل کا عمل جاری ہوجاتا ہے اور ہورہا ہے، مگر ناخواندہ یا بزعم خود خواندہ، مگر ناخواندہ لوگ اسلام کو بھی اسی پر قیاس کرکے ترمیم وتنسیخ کے تصورات باندھنے اور اس کے نعرے لگانے کھڑے ہوگئے، لیکن حجت وبرہان کا مرتب نظام جس سے وہ یکسر بے خبر ہیں، اس قسم کے تصورات کو بیک جنبش ابرو کوڑے کچرے کی طرح نکال کر باہر پھینک دیتا ہے آج اگر شدید ضرورت ہے تو مسلمانوں کو تعلیم وتربیت کی ہے کہ وہ اسلام کے قانون کو سمجھیں اور خلوص کے ساتھ اسے استعمال میں لائیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسی راہ عمل ہموار کردینے کی ہے جس پر پرسنل لا خود اپنی ہی معنوی قوت سے تعمیری انداز میں چلے اور آگے بڑھے جس کا عملاً چلتے رہنا ہی اس قسم کے فتن اور وسوسہ اندازیوں کا سدباب اور عملی جواب ہے۔

اس عظیم اجتماع سے جس میں ہر مکتب کے فضلاء جمع ہیں یہ توقع بجا طور پر قائم کی جاسکتی ہے وہ پرسنل لا کو عملاً جاری کردینے کے لئے کوئی راہ عمل متعین کرکے اس کی داغ بیل ڈال دے۔ آخر کلام میں اس گذارش پر اس طولانی دفتر کو ختم کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کا اعلان اس بارے میں جیسا کچھ بھی ہو بہرحال اعلان ہے کہ پرسنل لا میں اس وقت تک تبدیلی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مسلمان خود ہی اس کی خواہش نہ کریں، اس نام پر تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار نمائندے متفقہ طریقے پر اعلان کرتے ہیں کہ ہم پرسنل لا سے کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہوسکتے، ہم اس کی ترمیم وتبدیلی کبھی گوارا نہیں کرسکتے، اور ہم کسی ایسے مشترک قانون کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے جو پرسنل لا کے کسی ایک جزئیہ پر بھی اثر انداز ہو، بلکہ اسی کے ساتھ اگر ہم یہ بھی کہیں کہ پرسنل لا کے سلسلہ میں تبنیت اور ملازمین سرکار پر تعدد

ازدواج کے بارے میں جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ مسلمانوں کی حد تک اٹھالی جائیں تو گورنمنٹ کے اس اعلان کی صداقت غیر مشتبہ ہوجائے گی، وہ شبہات باقی نہ رہیں گے جو اس اعلان کے بعد اس قسم کی جزئیات سے پیدا ہوگئے ہیں، پرسنل لا کے فطری حصوں کے ساتھ اس کے عملی نظام کا کوئی خاکہ بھی اس تاریخی اجتماع کی طرف سے آجائے جس پر پرسنل لا اپنے پیروں پر چل پڑے اور چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس تاریخی اجتماع کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا جس کو آج اور مستقبل کی نسلیں کبھی فراموش نہیں کرسکیں گی۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی فرد یا طبقہ شریعت اور شرعی قوانین کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ اپنا دنیوی اور اخروی انجام خود سوچ لے، قانون شریعت یا علماء اس کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے۔

میں آخر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے ممبئی کے مخلص دردمند اور باحمیت مسلمانوں کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اپنی روایتی حوصلہ مندیوں اور فراخدلانہ جذبات سے پرسنل لا کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بمبئی میں اس کنونشن کے انعقاد کا ذمہ لیا اور اسے عملاً کرکے دکھایا جس کی بدولت یہ مختلف رنگ کے پھولوں کا گلدستہ اس تاریخی اجتماع کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پھر مختلف مکاتب فکر کے اہل علم وفضل اور بزرگوں اور اطراف ملک سے آئے ہوئے دانشوروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بمبئی کی استقبالیہ کمیٹی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس عظیم اجتماع کو کامیاب اور اس کے کام کو مضبوط اور مستحکم بنایا۔

☆☆

تحفظ دین وشریعت کے چند ستون

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

1972 میں تحفظ دین وشریعت کی خاطر اسلامیان ہند کا ایسا مضبوط ومستحکم اور پرجوش اتحاد منظر عام پر آیا جسے شاید ہی اس سے پہلے سرزمین ہند پر چشم فلک نے دیکھا ہو۔ ملت اسلامیہ کو کلمہ واحدہ کی بنیاد پر ایک دھاگے میں پرونے کے لئے جن عالی مرتبت شخصیات نے راتوں کی نیند حرام کیں اور دن کا چین وسکون تیاگ دیا وہ ہمارے لئے آج بھی چراغ راہ ہیں۔ ذیل میں چند نگہبان دین وشریعت کا تعارفی خاکہ پیش کیا جارہا ہے (جنہوں نے ملت کو مجتمع ومتحد کرنے کیلئے مسلم پرسنل لا بورڈ جیسی نمائندہ تنظیم قائم کی) تاکہ ان کے نقوش کار، بے نفسی اور کمال درجہ کی دردمندی سے استفادہ کیا جاسکے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: (1983 دورِ صدارت 1972)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو قائم کرنے اور اسے ہمہ گیری عطا کرنے میں جن دو مرکزی کرداروں نے نمایاں رول ادا کیا تھا ان میں سے ایک تھے بہار اڑیسہ کے امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی اور دوسرے سید العلماء حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسی عظیم تحریک کو پوری قوت کے ساتھ برپا کرنے کے

لئے اس وقت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسی بابرکت، باعلم اور فکر ونظر رکھنے والی موزوں ترین کوئی دوسری شخصیت موجود نہیں تھی۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے رفیق کار مولانا سید منت اللہ رحمانی کے مشورہ وتعاون سے 1972 کے وسط میں ایک اجلاس دیوبند میں منعقد کیا جس میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اراکین، ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین قانون ودانشوروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اہل فکر ونظر کو حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ نے شریعت اسلامی پر خطرات کے منڈلاتے بادل، اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں اور حکومت کے منفی رویوں سے آگاہ کیا اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی اپنی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے حالات میں، جبکہ قوانین اسلام اور ہماری شریعت پر شب خون مارنے کی تمام سازشوں سے ہم مطلع ہو چکے ہوں، کیا ہم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ ہم مکاتب فکر اور مسالک کی تمام دیواروں کو منہدم کر دیں اور شریعت کے ہر ہر جز کی حفاظت کے لئے ایک ہو جائیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیبؒ کی اضطراری کیفیت اور درد وغم میں ڈوبی ہوئی گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ اسی مجلس میں یہ طے پا گیا کہ ایک وفد ممبئی جائے اور ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' کی تیاری کی فضا ہموار کرے۔ اور یہیں سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا عملی طور پر آغاز ہو گیا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تحریک کی اس ابتدائی مہم میں سابق گورنر بہار مسٹر یونس سلیم، قاضی مجاہدالاسلام قاسمی، ڈاکٹر طاہر محمود وغیرہ شریک تھے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کی سرکردگی میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا منظور نعمانیؒ اور مولانا محمد سالم قاسمی پر مشتمل ایک وفد ممبئی کے لئے روانہ ہوا اور شب وروز کی محنت وجدوجہد کے بعد بالآخر 28-27 دسمبر 1972 کا وہ تاریخ ساز دن بھی آیا جب ملت اسلامیہ کے پانچ لاکھ سے بھی زائد بزرگوں، جوانوں اور ہر مکتب فکر کے قائدین کا ٹھاٹھیں

مارتا ہوا سمندر ممبئی کنونشن میں موجود تھا۔ اس کنونشن کی غیر معمولی کامیابی اور اتحاد ویکجہتی کے عظیم الشان مظاہرے کے نتیجے میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ اس کے بانی صدر منتخب ہوئے۔

حضرت ممدوحؒ کی ذات گرامی ہی تھی کہ جن کی بھاری بھرکم شخصیت نے مختلف الخیال قائدین اور عوام کو ایک دھاگے میں پرو کر مسلم پرسنل لا بورڈ کو ایک عظیم قوت میں تبدیل کر دیا اور بورڈ کو مرکزی اتحاد کا ایسا نمونہ بنایا جو آج بھی اپنی افادیت وتاثیر کے اعتبار سے ثمر آور ہے۔ موصوف تاحیات بورڈ کی صدارت فرماتے رہے اور کم وبیش 60 سالوں تک ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے، دارالعلوم دیوبند کے لئے وہ تاریک اور سیاہ دن تھا جب ان کو دارالعلوم کی اہتمامیت سے علاحدہ ہونے پر مجبور کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں دارالعلوم دو حصوں میں تقسیم ہوا، ہندستانی مسلمانوں پر اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ غم اور افسوس کا لمحہ نہیں گزرا۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ:

1972..... 1991

دین وشریعت کے نگہبان اور قافلہ سخت جاں کے میر کارواں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی قوانین شرعی کی حفاظت اور اس کے عملی نفاذ کے لئے جس قدر بے چین ومضطرب تھے اس کا صحیح اندازہ تو ان کے رفقاء اور وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان کی صبح وشام، ان کا گفتار وکردار اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت قریب سے دیکھا ہو۔ بلاشبہ بیسویں صدی میں اس جیسا علم وعمل کا پیکر اور عزم وہمت کا کوہ گراں پیدا نہیں ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے جو شعور وفکر اور بیداری ہندوستان میں آئی وہ موصوف کی ہی رہین منت ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علمی، تحقیقی، تربیتی، تصنیفی، اصلاحی، تبلیغی اور تحریکی کاموں میں علماء بہار کا اہم حصہ رہا ہے، امام منطق وفلسفہ صاحب سلم العلوم حضرت علامہ محبّ اللہ بہاریؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، صاحب عون المعبود شیخ شمس الحق عظیم آبادیؒ، اسلامی معاشرے کے تشکیل کے نقیب اور بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور مجاہد آزادی حضرت سید شاہ محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کردار ہمارے دل ودماغ کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے نقوش جمیل سے ایک جہان مستفید ہوا ہے، ادیب شہیر علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی علمی، تحقیقی وتصنیفی کارناموں کو کسی طرح نہیں بھلایا جاسکتا۔ اسی طرح لاتعداد علمائے دینِ متین اس سرزمین میں پیدا ہوئے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، انہی شخصیات میں سے حضرت اقدس مولانا بشارت کریم صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ، مولانا ولایت علیؒ اور مولانا یحییٰ علی عظیم آبادیؒ، شاہ ولی اللہ تحریک کے علم بردار بن کر سامنے آئے اور سب سے اخیر میں علم وادب اور فقہ وشریعت کے رمز شناس مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تیسرے صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بانی اور امارت شرعیہ نے بہار واڑیسہ کے قاضی القضاء حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے شاہ ولی اللہ تحریک کے میر کارواں کی حیثیت سے عالم اسلام میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی علماء ومفکرین نے علم و تحقیق کی بزم میں چار چاند لگایا اور دعوت وتبلیغ واصلاح امت کو اپنا فریضہ جان کر زبردست محنت کی۔ صوبہ بہار کی دو عظیم شخصیتوں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اس خطہ میں کبھی دینی مزاج وماحول کے لیے سرگرداں رہے تو کبھی رسوم وبدعات کے خاتمہ کے لیے گاؤں گاؤں کی خاک چھانتے رہے اور کبھی قادیانیت سمیت دیگر فرقۂ باطلہ کی سرکوبی کے لیے شب وروز ایک کرتے رہے۔ ان بزرگوں نے اصلاح

معاشرہ اور فرقۂ باطلہ کی سرکوبی کے لیے مدارس ومکاتب کے قیام کی تحریک شروع کی، ان بزرگوں نے اصلاح معاشرہ اور فرقہ باطلہ کی سرکوبی کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے اندر ملی حمیت اور قوانین اسلامی کے نفاذ کی لو مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جلائی تھی جسے سخت سے سخت حالات اور تیز وتند آندھی میں بھی وہ روشن رکھنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام دشمن عناصر حکومت کے ذریعہ قوانین اسلامی پر شب خون مارنا چاہتے ہیں تو وہ برداشت نہ کرسکے اور اپنی بے چینی کا اظہار اس وقت کے طبقۂ علماء کے سرخیل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے کیا۔ پھر کیا تھا دونوں ہی بزرگوں نے اپنی فراست ایمانی، ملی غیرت اور عزم وہمت وخود اعتمادی کے ساتھ ایک ایسی فضا تیار کی کہ دسمبر 1972 میں ممبئی میں ایک ایسا تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک ہزار سے زائد علماء وقائدین اور پانچ لاکھ سے زائد سامعین کا ایک ایسا اجتماع جہاں نہ کوئی دیوبندی تھا نہ کوئی بریلوی، نہ کوئی شیعہ تھا نہ سنی، بلکہ کلمہ واحد کی بنیاد پر سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر جوش ایمانی کا بھرپور مظاہرہ کررہے تھے۔ اس بے مثال اتحاد کا سہرا حضرت امیر شریعت کے سر جاتا ہے۔ جن کی وسعت ذہنی اور شب وروز کی جدوجہد سے ہی ایسا منظر سامنے آیا تھا۔ اس اجلاس کے نتیجے میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اور مولانا منت اللہ رحمانی اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے لے کر ملک کے ہر گوشے میں اس کا تعارف تک ہر جگہ مولانا رحمانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور گجرات سے بنگال اور آسام تک بورڈ کی مہمات اور تحریک جو بے مثال کامیابی ملی اس کے پیچھے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی پرکشش شخصیت اور جہد مسلسل کارفرما تھی۔ ممبئی، حیدرآباد، رانچی، پٹنہ، کلکتہ اور ملک کے بیشتر حصوں میں منعقد ہونے والے بے شمار بڑے بڑے اجتماعات میں شرکت کرنے والے مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے

ہیں کہ ''میں نے کبھی بورڈ کی طرح پرتاثیر و پرہجوم اجلاس نہیں دیکھے۔''

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام بہار واڑیسہ کے چوتھے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا عظیم کارنامہ ہے۔ انہوں نے بورڈ کو پوری ملت کی نمائندہ جماعت اور اس کو ایک عظیم قوت میں تبدیل کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو ملت کے تمام طبقوں اور صاحب اقتدار کے گلیاروں میں جو وقار و اعتماد حاصل ہے وہ انہیں کا طفیل ہے۔ انہوں نے بیش قیمت لٹریچرس خود تحریر فرمائے اور کچھ دوسروں سے لکھوائے اور انہیں مختلف زبانوں میں شائع کروا کر مسلمانوں کو اپنے عائلی قوانین کے تحفظ کے سلسلہ میں شعور و فکر اور علم آگہی سے نوازا اور شریعت پر کسی بھی جانب سے ہونے والے حملوں کا دندان شکن جواب دینے میں ذرا بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

حضرت ممدوحؒ کا ایک اہم علمی و شرعی کارنامہ ''قوانین اسلامی کی تدوین'' ہے جو انہوں نے ممتاز علماء اور فقہاء اور ماہرین قانون کے ذریعہ مرتب کرائی ہے۔ اور ان کی زندگی میں ہی یہ کتاب مکمل ہوگئی تھی۔ یہ کتاب دارالقضاء اور ملکی عدالتوں میں مستند ماخذ اور حوالہ کا کام دے گی جس میں عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین کی گئی ہے۔ یہ کتاب ان کتابوں سے بے نیاز کردے گی جو انگریزوں نے مسلم ماہرین سے لکھوائی تھی اور وہی کتابیں آج ملکی عدالتوں میں مقدمات کے فیصلہ کرنے میں معاون و مددگار ہیں۔ حضرت موصوف کی نگرانی میں تیار شدہ یہ دستاویزی کتاب نظر ثانی اور ضروری اضافوں کے ساتھ حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ کے دور صدارت میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے ہندوستانی مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں ایک ایسا مرکز عطا کیا ہے جو داخلی اور خارجی طور پر انہیں نہ صرف مستحکم کرتا ہے بلکہ ایک زندہ قوم کی طرح جینے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نشان راہ پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: (1999 دورِ صدارت 1983)

ملت اسلامیہ کا متحدہ و مشترکہ پلیٹ فارم اور تحفظ دین و شریعت کا بے نظیر کارواں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' طبقہ علماء کے سرخیل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں محو سفر تھا کہ اچانک 17/ جولائی 1983 کو بورڈ کے صدر حضرت قاری محمد طیب صاحب کے انتقال کا حادثہ جانکاہ پیش آیا۔ یہ حادثہ جہاں اسلامیان ہند کے لئے ایک المیہ تھا وہیں مسلم پرسنل لا بورڈ اور اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے لئے کسی امتحان و آزمائش سے کم نہ تھا۔ مولانا رحمانیؒ نے 28/ دسمبر 1983 کو بورڈ کا سالانہ اجلاس مدراس میں بلایا اور منجدھار میں جانب منزل رواں دواں ملت کی اس کشتی کے کھیون ہار اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے جانشیں کی حیثیت سے مولانا رحمانیؒ کی ہی تحریک پر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کو منتخب کرلیا گیا۔ یوں تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بورڈ کے بانی رکن تھے، مگر منصب صدارت پر فائز ہونے کے بعد بورڈ کو جو عالم گیر شہرت، سواد اعظم کی سمع و طاعت اور مختلف میدان ہائے کار میں زبردست کامیابی ملی اس میں موصوف کے علم تفقہ، شعور و فکر اور داعیانہ کردار کا بہت بڑا دخل تھا۔ مولانا فراست ایمانی، دور اندیشی اور حکمت و تدبر کے ساتھ وقت کے نازک سے نازک مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا عہد صدارت 1983ء سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد ان کی ایماء پر کلکتہ، دہلی، جے پور، احمد آباد، میرٹھ، پٹنہ اور ممبئی میں بورڈ کے عظیم الشان و تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوئے جو بورڈ کے تعارف اور ملت کے دیگر مسائل کو حل کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا معاملہ آیا، شاہ بانو کیس کے

ذریعہ شریعت میں ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی اور شیلا نیاس سے لے کر بابری مسجد کے انہدام تک کا حادثہ جانکاہ بھی پیش آیا اور وندے ماترم کا شوشہ بھی کھڑا کیا گیا، ہر مسئلہ پر حضرت مولانا علی میاں ندوی نے شریعت محمدی اور تشخص اسلامی کے تحفظ کو ملحوظ رکھا اور اغیار وفرقہ پرست قوتوں کو دوٹوک انداز میں دندان شکن جواب دیا اور اپنے موقف کو نہایت مضبوط و مدلل انداز میں پیش فرمایا۔

اپریل 1985 میں سپریم کورٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ (125) کا سہارا لے کر شاہ بانو مقدمہ میں مسلم مطلقہ خاتون کو زندگی بھر یا تا نکاح ثانی شوہر پر نان نفقہ لازم قرار دینے کا غیر شرعی فیصلہ دے دیا جو شریعت اسلامی پر براہ راست حملہ تھا۔ حضرت موصوف اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ چونک پڑے، بلکہ لرز گئے اور انتہائی سخت حالات میں صدائے احتجاج بلند کیا۔ 2/فروری 1986 کو وزیر اعظم راجیو گاندھی اور دیگر سیاسی وقانونی حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ اس مسئلہ پر ایک طرف غیر مسلم تنظیمیں اور نام نہاد حقوق نسواں کی علمبردار جماعتیں بورڈ کے آمنے سامنے تھیں تو دوسری طرف کچھ روشن خیال ونام نہاد مسلم دانشوروں سے بھی بورڈ کا سابقہ تھا۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی قیادت میں بورڈ نے ملک گیر ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔

ملک کے چپہ چپہ میں اس تحریک نے انقلاب برپا کر دیا جس کے نتیجے میں ہزار مخالفتوں کے باوجود پارلیمنٹ کو ''قانون حقوق مسلم مطلقہ 1986'' پاس کرنا پڑا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی اس زبردست کامیابی کے پیچھے دراصل حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی جرأت مندانہ قیادت اور صبر آزما جدوجہد کارفرما تھی۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ سترہ سال تک مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت وصدارت کی ذمہ داریاں احسن طریقے پر انجام دیتے رہے، بلاشبہ ان کا دور صدارت مسلمانان ہند کے لئے نہایت مبارک ومسعود اور منظم ومتحد دور سے گزرا ہے،

حضرت مولانا نے مرکز اتحاد کی حیثیت سے مسلم پرسنل لا بورڈ کو نئے افق اور نئی وسعتیں عطا کی ہیں اور ان کی وجہ سے بورڈ کو وقار واعتماد حاصل ہوا ہے۔

صد افسوس کہ علم وفضل کا یہ روشن چراغ 31/دسمبر 1999 کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اللہ ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

مفکر ملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ: (2002 دورِ صدارت 2000)

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی ابتدائی مہم سے لے کر آج تک اپنی علمی، فکری اور عملی جدوجہد سے بورڈ کو مسلسل تقویت پہنچاتے رہے ہیں۔ انہوں نے بورڈ کو درپیش مختلف چیلنجوں کا دندان شکن جواب دیا اور بورڈ کی سرگرمیوں میں وہ شروع سے ہی شریک وسہیم رہے ہیں کیونکہ بورڈ کے قیام کا تخیل جب اس کے بانی امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے دست وبازو کی حیثیت سے ان کے جملہ علمی وفکری کاموں کو انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ جب مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے سلسلہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے جو خصوصی میٹنگ دیوبند میں بلائی تھی، حضرت قاضی صاحب اس میٹنگ میں بھی موجود تھے اور اس تاریخ ساز میٹنگ میں تاریخی تجاویز بھی انہوں نے ہی پیش کی تھی اور ممبئی میں ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' کی تیاری اور اسے مفید ومؤثر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے شاہ بانو کیس کا مسئلہ آیا تو بورڈ کے قائدین چونک پڑے اور اسے شریعت میں مداخلت تصور کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اس کے خلاف جمہوری طریقے پر احتجاج کریں اور شرعی قانون پر نئے قانون کی بالادستی سے عوام کو بھی باخبر کریں

گے۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے ایک وفد ترتیب دیا جس نے ملک بھر کے دورے اور جلسوں کا پروگرام بنایا۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور پنجاب سے آسام تک بورڈ کے جس وفد نے ملک میں کہرام مچادیا اس میں اپنے پیش رو کے ساتھ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی پیش پیش تھے۔ کہیں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ہمراہ اور کہیں مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شراکت میں اور بہت سی جگہوں پر خود میر کارواں رہے اور اپنی علمی بصیرت، مخصوص لب ولہجہ اور انداز خطابت سے ملک کے کونے کونے میں ایسا جادو جگایا کہ بورڈ امت مسلمہ کی آواز بن گیا۔ حضرت قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا تعارف نہایت واضح اور مدلل انداز میں کیا۔ اس موضوع پر ان کی لکھی ہوئی ایک گراں قدر تحریر کتابی صورت میں متعدد بار شائع بھی ہوچکی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے جے پور کے اجلاس میں نظام دارالقضاء کے قیام سے متعلق تجویز منظور کی اور حضرت قاضی صاحب کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ قاضی صاحب نے اس کے لئے نہ صرف یہ کہ کئی دارالقضاء قائم کئے، بلکہ امارت شرعیہ کی نگرانی میں ایک بے مثال ادارہ بھی قائم فرمایا جہاں ممتاز فضلاء کو قضاء وافتاء کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی نگرانی میں عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین کا کام شروع کیا تھا جو مولانا رحمانی کی زندگی میں ہی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا، اس اہم علمی کام میں بھی حضرت قاضی صاحب شریک رہے اور امارت شرعیہ کے اپنے چند رفیق کار کے ساتھ اس کی تکمیل میں کلیدی رول ادا کیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے دوسرے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے انتقال کے بعد 23/اپریل 2000 کو جب ارباب حل وعقد نے باتفاق رائے قاضی صاحب کو بورڈ کا صدر منتخب کیا تو اس کو ملک وبیرون ملک کے علماء قائدین نے ''حق حق دار رابرسید'' کہا اور نہایت اطمینان کا اظہار کیا۔ میڈیا نے اس انتخاب کو بڑی اہمیت دی اور

شاید ہی کوئی خبر رساں ایجنسی ہوگی جس نے اس خبر کو نمایاں نہ کیا ہو۔ بورڈ کی صدارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد سے موصوف نے بورڈ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور بورڈ کو متحرک وفعال بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، افسوس کہ ملت اسلامیہ ہند کا یہ بے لوث اور دانشور قائد ملت کے متحدہ پلیٹ فارم کو آنے والے لوگوں کے لئے چھوڑ کر 4/اپریل 2002ء کو اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: 2002.....تاحال

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب کی وفات کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لیے ذمہ داران بورڈ کے متفقہ فیصلے سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا انتخاب کیا گیا۔ آپ نے بورڈ کی صدارت جس شان سے فرمائی اس سے مسلم پرسنل لا بورڈ کی اہمیت اور اس کے اثر ورسوخ میں بے پایاں اضافہ ہوا۔ آپ نے بابری مسجد سے دستبرداری کے سلسلے میں نہ یہ کہ سخت گیر ہندوؤں کی مخالفت کی، بلکہ بعض نام نہاد مسلم دانشوروں کی رائے کو بھی مسترد کیا اور آنند سرسوتی کانچی پیٹھ شنکر آچاریہ کو گھٹنہ ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ آپ کی صدارت میں 21 تا 23 جون 2002 کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا 16واں اجلاس چارمینار حیدرآباد میں منعقد ہوا جس میں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی کوششوں پر روک لگانے کے لیے متعدد تجاویز پیش کئے گئے۔

آپ ہی کی صدارت میں 17واں اجلاس یکم، 2 مارچ 2003 کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پرسنل لا بورڈ پر منڈلاتے خطرات کو ٹالنے کی حکمت عملی پر غور وخوض کیا گیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کا 18واں اجلاس بھی آپ ہی کی صدارت میں تاج المساجد بھوپال میں مورخہ ۲۹/اپریل تا یکم مئی ۲۰۰۵ء میں منعقد ہوا۔ بورڈ کا 19واں

اجلاس ۱۰ تا ۱۲ رجنوری جنوبی ہند چنئی میں منعقد ہوا۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا 20 واں اجلاس آپ کی صدارت میں مورخہ ۲۹ رفروری تا ۲ مارچ ۲۰۰۸ء کو کولکاتہ پاک سرکس میں منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے گوشہ گوشہ سے بورڈ کے مندوبین نے شرکت کی اور بورڈ کی طرف سے پیش کردہ تجاویز پر اتفاق رائے قائم ہوا۔ اس طرح سے مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کے عائلی مسائل کے تحفظ کے حوالے سے آپ کی قیادت میں سرگرم عمل ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے سایہ کو تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور بورڈ اپنی کارکردگی میں رواں دواں رہے۔

حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ:

(1991 دور جنرل سکریٹری شب تا حال)

مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی و جنرل سکریٹری امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے وصال کے بعد اراکین بورڈ کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو نہایت ذمہ داری اور بنا کسی تھکاوٹ اور اکتاہٹ کے عرصہ دراز سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے دست راست بن کر امارت شرعیہ کے منصب نظامت پر گراں قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ تیس برس تک امیر شریعت رابع حضرت مولانا رحمانی کی نگرانی میں کام کا تجربہ، ان کی فکری مسلک و مشرب سے واقفیت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک شروع ہی سے شرکت کی وجہ سے حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم کو بورڈ کو متحرک و فعال رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس لئے بھی کہ انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ جیسے بلند پایہ عالم دین اور عالم اسلام کی معروف شخصیت کے تعاون و حمایت میں کام کرنے کا موقع ملا جن کی بھاری بھرکم شخصیت مرکز اتحاد بنی ہوئی تھی۔

اور آج انہیں ایک ایسے صدر (حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی) کے ساتھ کام

کرنے کا موقع ملا ہے جن کے ساتھ پچھلے چالیس برسوں سے ذہنی و فکری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق رہا ہے۔ مولانا مجاہدالاسلام قاسمی اور مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم نے مشترکہ طور پر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے دائرہ کار کو جو وسعت دی ہے، امید کی جاتی ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں مسلم پرسنل لا بورڈ کو بھی عظیم الشان قوت میں تبدیل کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم کی سرکردگی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا احمد آباد اور ممبئی میں عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا جو اپنی اہمیت وافادیت اور تاثیر کے لحاظ سے نہایت اہم اور تاریخ ساز اجتماع تھا۔ مولانا کی نگرانی میں بورڈ نے بابری مسجد و دیگر مقدمات کی کامیاب پیروی کی ہے۔ اللہ انہیں ملت کی رہبری کی مزید توفیق دے اور صحت وعافیت سے نوازے۔ آمین

مسلم پرسنل لا بورڈ کو نائبین صدور حضرت مولانا سید کلب صادق صاحب، مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، مولانا سراج الحسن صاحب، جیسی بلند و بالا شخصیتوں کی حمایت وتعاون حاصل ہے اور شروع سے ہی کلیدی عہدہ و پر فائز ہو کر گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے علاوہ بورڈ کو جناب عبدالستار یوسف شیخ، جناب محمد عبدالرحیم قریشی اور حضرت مولانا سید ولی رحمانی جیسے فعال و متحرک اور ذی اثر شخصیتوں کا بھی تعاون حاصل ہے جو بحیثیت سکریٹریز مفوضہ ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کر رہے۔

جناب یوسف پٹیل، سابق سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ:

عالی جناب یوسف پٹیل عروس البلاد ممبئی کی معروف و مشہور شخصیت تھی علماء سے خاص لگاؤ، مقامی و ملکی مسائل سے باخبر اور فکرمندی ان کا خاص وصف تھا۔ انہوں نے ممبئی کے بے شمار سیاسی، سماجی اور ملی مسائل کو حل کرنے اور ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے جو

فعال رول ادا کیا ہے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

''آل انڈیا مسلم پرسنل کنونشن'' جو دسمبر 1972 میں ممبئی میں منعقد ہوا تھا جس میں ہزاروں علماء ومشائخ اور ہر مکتب فکر کے قائدین نے شرکت کی تھی اور اجلاس عام میں پانچ لاکھ سے زائد مسلمانوں کا ایک پرجوش ہجوم تھا اجلاس کو کامیاب بنانے اور کے نظم ونسق کو سنبھالنے نیز مفید وبارآور بنانے کے پیچھے جن لوگوں کی شب وروز کی محنت اور انتھک جدوجہد شامل تھی ان میں جناب یوسف پٹیل کا امتیازی رول تھا۔ اس اجلاس کی غیر معمولی کامیابی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی وجہ بنی، چنانچہ 1973 میں حیدرآباد کے اجلاس میں باضابطہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جناب یوسف پٹیل اپنی خدمات، جدوجہد اور فعالیت کی وجہ سے مسلم پرسنل لا بورڈ اور علماء وقائدین سے قریب تر ہوتے چلے گئے یہاں تک انہیں مسلم پرسنل لا بورڈ کا سکریٹری نامزد کیا گیا اور انہوں نے مرتے دم تک مسلم پرسنل لا بورڈ کو تقویت پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ اللہ ان جیسے مرادن کار اور مخلص لوگوں کو پیدا فرمادے اور ملت کے بکھرے ہوئے گیسو سنوار دے۔ (آمین یارب العالمین)

☆☆

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف!

مسلم پرسنل لاء بورڈ: ماضی، حال اور مستقبل

● مولانا نوراللہ جاوید قاسمی

انگریزی استبداد سے قبل مغلیہ دور حکومت میں زندگی کے اکثر شعبوں میں مسلم پرسنل لاء نافذ تھا۔ جہانگیر کے دور اقتدار میں انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور آہستہ آہستہ ملک کے اقتدار پر قبضہ جمالیا۔ اس طرح مغلیہ حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے 700 سالہ روشن اور تابناک دور اقتدار کا چراغ گل ہوگیا۔ پورے ملک پر برٹش سامراج کا جھنڈا لہرانے لگا۔ برطانوی حکمرانوں کا ہندوستان پر صرف حکومت کرنا مقصد نہیں تھا، بلکہ وہ ہندوستان کو ایک عیسائی اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ 1866 میں انگریز حکمرانوں نے ملک کے آئین کا جائزہ لینا شروع کیا اور دستور ہند میں شامل اسلامی قوانین کو آہستہ آہستہ نکالنا شروع کردیا۔ سب سے پہلے دستور سے قانون شہادت، اور قانون معاہدات منسوخ کیے۔ اس کے بعد باری آئی معاشرتی قانون میں تبدیلی کی جن میں نکاح، طلاق، خلع، میراث وغیرہ شامل ہیں۔ دستور سے اسلامی قوانین کو نکالنے پر مسلمانوں کی جانب سے سخت احتجاج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت کے علماء نے انگریزوں سے برہم ہوکر محاذ قائم کردیا تھا، لہٰذا معاشرتی قانون میں تبدیلی کا جائزہ لینے کے لیے انگریزوں نے 'رائل کمیشن' مقرر کیا۔ کمیشن نے معاشرتی قانون کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو رپورٹ سونپی کہ معاشرتی قانون کا تعلق مذہب سے بہت ہی گہرا ہے۔ لہٰذا

اگر اس میں تبدیلی کی گئی تو اسے ملک کے مسلمان مذہبی امور میں مداخلت اور آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف سمجھیں گے اور انگریز کے خلاف میدان میں کود جائیں گے۔ انگریزوں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے معاشرتی قانون میں تبدیلی کے ارادے کو ترک کردیا اور طے کیا کہ معاشرتی اور عائلی مسائل میں مسلمان شریعت اور ہندو دھرم شاستر پر عمل کرتے رہیں۔

انگریزی اقتدار کے آخری دہائی 1936 میں ایک عدالت نے ہندو رواج کے مطابق وراثت میں بہن کو حصہ دینے سے انکار کردیا۔ عدالت کے فیصلہ پر پورے ہندوستان میں تحفظ شریعت کے حوالہ سے بہت مضبوط اور مستحکم آواز اٹھائی گئی۔ مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن سجاد، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علماء ہند اور دیگر اکابرین کی سخت محنت اور کوشش کے بعد 1937 میں ''شریعت اپلیکیشن ایکٹ'' بنا۔ اس ایکٹ میں عدالت اور قانون ساز اداروں کو پابند بنایا گیا کہ اگر فریقین مسلمان ہوں تو عائلی قوانین میں فیصلہ شریعت محمدیہ کے مطابق کیا جائے۔ چاہے عرف اور رواج کا تقاضا کچھ بھی ہو۔

1947 میں ملک کو آزادی ملی اور ایک بار پھر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں قانون سازی کا عمل شروع ہوا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت والی قانون ساز کمیٹی نے بنیادی دستور میں ملک کے تمام شہریوں کو اپنے کلچر اور تہذیب اور پرسنل لاء کے مطابق آزادی دی۔ دفعہ 29 میں وضاحت کی گئی کہ تمام شہریوں کو اپنے رسم و رواج اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی، لیکن دستور ہند کے رہنما اصول کی دفعہ 44 میں حکومتوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ پورے ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے کوشش کرے گی۔ مسلم پرسنل لاء پر مداخلت کی تلوار لٹکا دی۔ اس وقت قانون ساز کمیٹی میں شامل مولانا حسرت موہانی، جناب اسماعیل اور دیگر بعض مسلم اراکین نے اس دفعہ پر سخت اعتراض

کیے اور اس میں ترمیمات پیش کی، لیکن بدقسمتی سے امبیڈکر نے مسلم ممبران کی ترمیمات کو رد کردیا اور ملک کے دستور کے رہنما اصول (اصل دستور میں نہیں)، میں دفعہ 44 شامل ہوگیا۔ اس وقت ڈاکٹر امبیڈکر نے مسلم اراکین کو یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ ''کوئی پاگل ہی حکومت ہوگی کہ جو اقلیتوں کے جذبات کے علی الرغم ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے کوشش کرے گی۔ کیا کوئی حکومت یہ پسند کرے گی کہ ملک کی ایک بڑی آبادی مسلمان اس کے خلاف ہوجائے۔'' امبیڈکر کی اس وضاحت کے بعد مسلم اراکین خاموش ہوگئے۔ لیکن دستور سازی کے چند سالوں بعد ہی ملک میں فسطائی ذہنیت کے حاملین کی طرف سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے آوازیں اٹھنی شروع ہوگئی۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے ملک کے دستور میں دفعہ 44 کو یہ کہہ کر شامل رہنے دیا کہ کوئی بھی حکومت اور سیاسی پارٹی ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے کوشش نہیں کرسکتی، کیونکہ وہ مسلمانوں کو ناراض کرنا نہیں چاہیں گے۔ صرف 25 سال بعد پارلیمنٹ میں متبنی بل پیش ہوا جس کا مقصد تھا کہ ملک کے تمام شہری بلا امتیاز مذہب وملت منہ بولے بیٹے کو اولاد کا درجہ دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بل شریعت کے سراسر مخالف تھا اور مسلم پرسنل لاء میں صریح مداخلت تھی۔ متبنیٰ بل نے مسلمانان ہند کے سامنے بے شمار سوالات کھڑے کردیئے کہ کیا دستور ہند میں فکری وعملی آزادی جو تمام مذاہب کو دی گئی ہے وہ محفوظ رہ سکے گی۔ کیا وہ آزادانہ طور پر بالخصوص اپنے عائلی مسائل میں شریعت اسلامیہ کے مطابق عمل کرسکیں گے۔ یہ تو ابتدا ہے آگے چل کر نہ معلوم مقنّنہ اور عدلیہ کہاں تک شریعت میں مداخلت کرکے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر آزادانہ طریقہ سے عمل کرنے سے روکنے کی کوشش کرے گی۔ یہی وہ سوالات تھے جس نے مسلمانان ہند کو بے چین کردیا۔ تمام تر مسلکی اختلافات کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کے علماء و دانشوروں نے اپنے تحفظات سے بالاتر ہوکر حکومت کے اس اقدام کے خلاف متحدہ طور پر آواز بلند کی۔

ان حالات میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایک اجلاس بلایا جس میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور اس وقت کے اکابرین دیوبند نے ملک میں مسلم پرسنل لاء کولاحق خطرات سے آگاہ کیا۔اس کانفرنس میں اکابرعلماء دیوبند، ملک کے ممتاز دانشوراور قانون داں شریک ہوئے۔اس میٹنگ میں بہت ہی اہم فیصلے کئے گئے ان ہی اہم فیصلوں میں سے ممبئی میں تمام مکتب فکر کے علماء، دانشوروں اور مسلم سماجی کارکنوں کو بلاکرایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔

آزاد ہندوستان میں 27اور 28دسمبر 1972 کا دن مسلمانان ہند کے لئے سنگ میل ثابت ہوا کہ منتشر اورآپس میں برسرپیکار مسلم جماعتوں کے نمائندوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر حکومت کے سامنے یہ ثابت کردیا کہ اگرچہ ان کے درمیان مسلکی اختلافات ہیں، لیکن جب بات شریعت میں مداخلت کی آئے گی تو وہ ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔ مہاراشٹر کالج میں منعقد مسلمانوں کی اس عظیم اجتماع میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نام سے ایک عظیم پلیٹ فارم کی تشکیل ہوئی۔

مسلم پرسنل لاءبورڈ قرآن کی آیت ’’**مااتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا**‘‘ (سورۃالحشر) (جو کچھ رسول لے کر آئے ہیں اس کو پکڑلواوررسول جن چیزوں سے منع فرماتے ہیں اس سے رک جاؤ) اور’’**لاتبدیل لکلمات الله**‘‘ کی عملی تفسیر ہے۔1972 کے بعد سے اب تک مسلم پرسنل لاءبورڈ شریعت میں مداخلت کے خلاف ایک دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔چاہے شاہ بانو کیس ہو یا طلاق کا معاملہ یا پھر ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ ہو۔ہمیشہ شریعت میں مداخلت اور ملک میں مسلم پرسنل لاء کو پامال کرنے کی کوشش کے خلاف آہنی دیوار بن کر کھڑی رہی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کو تین دہائی سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔اس دوران بورڈ کے اکثر اساسی ممبران راہی عدم ہو چکے ہیں۔اس دوران بورڈ کے تین صدر قاری محمد

طیبؒ، مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ اورقاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور ایک جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی بے مثال قیادت نے بورڈ کو ہندوستانی مسلمانوں کی مشترکہ آواز بنادیا۔یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ چند سال قبل بورڈ کو غیروں نے کئی حصوں میں منقسم کرنے کے لیے اپنوں کا استعمال کرکے اس آواز کو بے آواز بنانے کی سازش کی اور افسوس بریلی، شیعہ اور خواتین کے نام پر مسلم پرسنل لا قائم ہوا،مگرآفریں صدآفریں مسلم امہ کا سواد اعظم اس بندر بانٹ کو مسترد کرکے سازشوں کو ناکام بنادیا اور ان تمام پرسنل لا کے رہبران کو سوائے ذلت اور رسوائی کے اور کچھ نہیں ملا۔

1972 سے اب تک حالات بالکل بدل چکے ہیں۔72 میں ہندوستان کا جوسیاسی مزاج تھا وہ یکسر بدل چکا ہے۔اب ملک کی سیاست میں فرقہ واریت کا رنگ چڑھ چکا ہے۔72 میں بی جے پی جیسی فرقہ پرست پارٹیوں کی ابتدا ہو رہی تھی اب وہ سیاسی افق پر چھا چکی ہے جو کل تک اس کے ساتھ کھڑے ہونے سے کترا رہے تھے وہ سیاستداں اب کھلے عام ان کی مدح سرائی میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔یہ تو ملک کی سیاست کے مزاج میں تبدیلی تھی۔مسلم معاشرہ بھی ان تین دہائیوں میں بدل چکا ہے۔مادیت کی باد سموم نے تہذیب وثقافت اور اسلامی شناخت کو ختم کردیا ہے۔نئی نسل اسلامی اقدار سے بالکل ناآشنا ہے۔گلوبلائزیشن کا نعرہ لگا کر مسلم نوجوان بھی بین مذاہب شادیوں میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ان حالات میں ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال ہے کہ کیا مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم اور مشترکہ پلیٹ فارم کو مسلمانوں کا وہی اعتماد حاصل ہے جو 1972 اور اس کے بعد کے دنوں میں تھا؟ کیا ہماری قیادت میں وہی ولولہ اور جوش اور جذبہ ہے جو ہمارے اکابرین نے اپنے دلوں میں سجائے تھے۔یہی وہ سوالات ہیں جو مسلم پرسنل لا اور مسلمانان ہند کے سامنے ہیں۔انہیں نظر انداز کرکے قوم وملت کی صحیح رہنمائی نہیں کی جاسکتی۔حقیقت کا اعتراف حالات کو بدلتے تیور کے مطابق ڈھالے بغیر کوئی

جماعت اور تنظیم پر اعتماد قیادت نہیں دے سکتی ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک نہ جانے کتنی تنظیمیں اور ادارے معرض وجود میں آئے اور چلے گئے۔ ہماری ان ہی آنکھوں نے ان کی بلندی بھی دیکھی اور گمنامی بھی۔ ان تنظیموں کا عروج وزوال ہمارے لیے تماشہ نہیں، بلکہ عبرت ہے۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کر کے اپنی کمیوں کو دور کرنے کا حوصلہ کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تین دہائیوں کے بعد بھی مسلم پرسنل لا آج مسلمانوں کی سب سے معتبر آواز ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ ہم نے 72 میں جن بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹا تھا وہ اب پھر سے بکھرنے لگے ہیں۔ نمائندگی کے نام پر انگلیاں اٹھنے لگی ہیں۔ ہر حلقہ اور جماعت کو شکایت ہے کہ انہیں صحیح نمائندگی نہیں دی گئی۔ ایک بڑے حلقے میں یہ شکایت ہے کہ چند افراد نے بورڈ کا ہائی جیک کر رکھا ہے وہ جس طریقہ سے چاہتے ہیں بورڈ کی قیادت کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات کہاں تک مبنی بر حقائق ہیں یہ اپنی جگہ الگ موضوع ہے، لیکن اس میں کوئی دورائے نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کی چکاچوند میں خود کو ہائی لائٹ کرنے کی ہوڑ میں بورڈ کے وہ افراد ترجمان بن کر سامنے آئے جنہوں نے اسلامی فقہ کا شاید ہی مطالعہ کیا ہو۔ نتیجۃً ان کی کم علمی کی وجہ سے بورڈ کو نہ صرف شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ ان کی حرکات فقہ اسلامی کی جگ ہنسائی کا سبب بھی بنی۔ یہی وہ اسباب ہیں جو بعض حلقوں کو بورڈ کے تئیں بدظن بناتی ہے۔ اگر ان پر روک نہیں لگائی گئی تو یہ افراد بورڈ کے لیے ایسے ناسور بن جائیں گے جنہیں نہ نگلنے میں بنے گا اور نہ اگلنے میں۔ اس وقت بورڈ کی خامیوں کو گنانا ہمارا مقصد ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی ہماری بساط ہے کہ ہم چراغ پر انگلی اٹھائیں، لیکن ایک صحافی اور گھر کا وفا شعار فرد ہونے کے ناطے اپنے بڑوں کے سامنے چند باتیں جو چند سالوں سے دل میں کھٹک رہی تھیں انھیں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کمی جو سب سے زیادہ محسوس کی گئی وہ ذرائع ابلاغ سے تال میل کی کمی رہی۔ بورڈ کے پاس ایک بھی ایسی ٹیم بر وقت دستیاب نہیں ہے جو بر وقت

بریفنگ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ میڈیا ایسے افراد سے رابطہ قائم کرتی ہے جو پہلے سے نیوز چینلوں کے دفتروں میں اپنے لمبے چوڑے بائیوڈاز بھیج رکھے ہیں جس میں تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر رہتا ہے کہ وہ اسلامی فقہ کے ماہر اور مسلم پرسنل لا کے ترجمان ہیں۔ انگریزی اخباروں میں کام کر رہے بعض مسلم صحافی بار بار یہ گلہ کرتے نظر آتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کے صدر دفتر میں فون کرنے سے کوئی قابل ذکر فرد نہیں ملتا جو حقائق سے روشناس کرا سکے۔

مسلم پرسنل لا کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے اسے داخلی اور خارجی کے نام پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خارجی سطح پر لاحق خطرات سے قوم وملت سے سب واقف کراتا ہے، لیکن داخلی سطح پر مسلم پرسنل لا کو جو خطرات لاحق ہیں اس سلسلہ میں بتلانے والا شاید کوئی ملتا ہے۔ جمعہ کے خطبے سے لے کر اجلاس عام تک ہر مقرر یہ تقریر کرتا ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں، اس طرح کی پر جوش تقاریر ہوتی ہیں، لیکن ہمارا یہ المیہ ہے کہ قوم وملت کو 'مسلم پرسنل لا کیا ہے؟'، اس میں تبدیلی کیوں نہیں ہو سکتی، یکساں سول کوڈ کیا ہے؟' جیسی اہم باتیں بتانے والے افراد شاید ہی ملیں گے۔ ابھی اس کا نظارہ مغربی بنگال میں دیکھنے کو اس وقت ملا جب ریاستی حکومت نے لازمی نکاح رجسٹریشن بل پاس کرنے کا اعلان کیا، حکومت کے اعلان کے بعد ملی رہنماؤں سے لے کر مسجدوں کے امام تک نے حکومت کے خلاف خوب بیان بازی کی۔ اسے المیہ کا نام ہی دیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو یہ تک خبر نہیں تھی کہ لازمی نکاح رجسٹریشن سے کہاں مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہے۔ کولکاتا میں ایک مشہور مسجد کے امام جو اپنے آپ کو مفتی بنگال سے مخاطب ہوتے ہیں انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت چاہتی ہے کہ آپ اپنے شاہی امام سے نکاح پڑھانے کے بجائے ان کے مقرر کردہ افراد سے نکاح پڑھائیں اسے مسلمان نہیں ہونے دیں گے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس طرح کی مثال آئے دن دیکھنے کو ملتی ہے۔ مسلم پرسنل لا کو داخلی سطح پر اسی طرح کی

جہالت سے خطرہ لاحق ہے۔خارجی خطرات سے مقابلے ہم خوب سوچتے ہیں اور بیان بازی کرتے ہیں،لیکن بورڈ کے پاس اس کی فکر کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔کہنے کو تو اصلاح معاشرہ کمیٹی قائم ہے۔وہ کمیٹی کہاں تک کام کررہی ہے اس کا اندازہ بورڈ کے معزز اراکین کو خود ہوگا۔میں آخر میں پھر کہوں گا کہ ہندوستان کی سیاست کا مزاج بالکل بدل چکا ہے۔معاشرہ کے اعلی فرد سے لے کر ادنی فرد تک کی سوچ تغیر وتبدل کے دور سے گذر چکی ہے اگر نہیں بدلا ہے تو ہمارے کام کرنے کے طریقے نہیں بدلے ہیں۔مسلم پرسنل لا بورڈ پر انگلی اٹھانا ہمارا مقصد ہرگز نہیں ہے اور نہ ہم چاہتے ہیں کہ خامیوں اجاگر کیا جائے، بلکہ ان تحریروں کا منشا صرف ایک ہے کہ جانیں کہ فرقہ پرست طاقتوں کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے مواقع کیسے ملتے ہیں،اس کے لیے ہم کہاں تک ذمہ دار ہیں؟۔ضرورت ہے محاسبہ کی اور مسلم پرسنل لا بورڈ سے عوام الناس کو جوڑنے کی اس کے بغیر ہم مسلم پرسنل لاء بورڈ کو داخلی سطح پر لاحق خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

☆☆

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ چنئی اجلاس کے تناظر میں

راہیں دشوار گزار سہی، منزل آشنا ہیں!

● عزیز بلگامی

قارئین کو یاد ہوگا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ایک ایسے وقت میں عمل میں آیا تھا، جب قانون شریعت کے خلاف وقت کے اقتدار کی بدنیتیاں پارلیمان میں ایک متوازی ''اڈاپشن بل'' کی شکل میں نمودار ہوئی تھیں جس کی منظوری کے لیے وقت کے وزیر قانون مسٹر ایچ آر گوکھلے نے اس اعلان کے ساتھ اسے پیش کیا تھا کہ یہ بل یونیفارم سول کوڈ کے ملک میں نفاذ کی سمت ایک قدم ہوگا۔یہ وہ حالات تھے جب ملت کے علماء، قائدین اور تنظیموں نے مسلمانانِ ہند کو بڑے تسلی بخش طریقے سے باور کرایا تھا کہ قانونِ شریعت پر شب خون مارنے کی تیاریاں ہورہی ہیں، چنانچہ اس سازش کو پوری قوت کے ساتھ کچل دینا چاہیے۔ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔تحریکِ خلافت کے بعد تاریخ ہند میں گویا یہ پہلا موقع تھا جب مسلمانانِ ہند کے مختلف طبقات بلا لحاظِ مسلک ومکتبِ فکر، شریعتِ اسلامی کے بچے کچے مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لیے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی، امیر شریعت، بہار واڑیسہ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، مہتمم دارالعلوم، دیوبند کی ایماء پر اس کا پہلا اجلاس دیوبند میں بلایا گیا تھا۔ اسی نشست میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ممبئی میں تمام طبقات کا نمائندہ کنونشن طلب کیا جائے۔ چنانچہ 27 اور 28/دسمبر 1972ء کو یہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا تھا۔اپنی نوعیت کا یہ پہلا

اجلاس تھا، جس کے ذریعہ مسلمانانِ ہند نے اپنے قانونِ شرعی کی حفاظت کا ایک اجتماعی اور مستحکم حلف لیا تھا اور اسی اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے فیصلے کا بالاتفاق اعلان کیا گیا تھا۔ اس فیصلے کے مطابق اورینٹل پیالس، حیدرآباد میں 7/اپریل 1973ء کو باقاعدہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی اور اس کا ایک دستور منظور کیا گیا تھا۔ اس طرح مذکورہ دونوں بزرگ (اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ اور حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کو علی الترتیب صدر اور جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بنگلور (1975ء)، رانچی (1977ء)، پونے (1978ء)، حیدرآباد (1981ء)، چنئی (1983ء)، کلکتہ (1985ء)، ممبئی (1986ء)، کانپور (1988ء)، دہلی (1991ء)، جے پور (1993ء)، احمد آباد (1995ء)، ممبئی (1991ء)، لکھنؤ (2000)، بنگلور (2000ء)، حیدرآباد (2002ء)، مونگیر (2003ء) اور بنگلور (2005ء) میں اجلاس منعقد ہوئے اور اب یہ حج ہاؤس چنئی میں 10، 11، 12 جنوری، 2007ء کو منعقد ہونے والا انیسواں اجلاس ہے جو ابھی چار دن قبل اختتام پذیر ہوا ہے۔ جس میں ہونے والے مباحث اور فیصلوں کی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو دوبارہ تین سال کی میعاد کے لیے صدر منتخب کیا گیا ہے اور اس کے ممبران کی تعداد 201 سے بڑھا کر 250 کردی گئی ہے، تاکہ تمام ریاستوں اور تمام مسلکوں اور تمام مسلم طبقات کی نمائندگی ہو سکے۔

اب اصل بات جو دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بورڈ اپنے مقاصد میں کامیابی یا ناکامی کا سفر کس طرح طے کیا ہے اور اب صورتحال کیا ہے۔ اپنے مقاصد میں جیسے ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ آف انڈیا'' یا مسلم پرسنل کی حفاظت اور اس کے نفاذ کو یقینی بنانا، ملک میں جاری ہونے والے یا ہو چکے ایسے عائلی قوانین جن سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا احتمال ہو یا

ملک کے مختلف کورٹوں میں قوانین کی خلاف شریعت راست یا بلا واسطہ تعبیر اور فیصلوں پر نہ صرف نظر رکھنا، بلکہ ان کے اثرات سے مسلمانوں کو مستثناء رکھنے کی سعی کرنا، مسلم عوام کو اس سلسلے میں باشعور بنانا، تاکہ وہ اس کی حفاظت اور اسے اپنی زندگیوں میں جاری وساری رکھنے کی کوشش کرے، اور اس مقصد کے لیے ضروری لٹریچر کی اشاعت، ایسی کمیٹیوں کی تشکیل جن کے ذمہ یہ کام ہو کہ وہ وقتاً فوقتاً پرسنل لا کی حفاظت کرنے اور بورڈ کے فیصلوں کی ملک گیر سطح پر نفاذ کی جد وجہد کریں، ایسے علماء اور قانون کے ماہرین پر مشتمل مستقل اسٹینڈنگ کمیٹیوں کی تشکیل جن پر یہ ذمہ داری ہو کہ وہ نافذ قوانین، اصول وضوابط، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ نیم حکومتی اداروں کے جاری کردہ سرکولرس، پارلیمنٹ یا اسمبلیوں میں پیش کیے جانے والے قوانین کے مسودوں کا مطالعہ، اس نقطۂ نگاہ سے کہ کہیں کوئی مداخلت کا شائبہ نہ پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے یہ مقاصد اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ اس کا فطری نتیجہ یہ سامنے آنے لگا ہے کہ بورڈ کے ذمہ دار فی الواقع سنجیدہ، بردبار اور قائدانہ صفات کے حامل نظر آنے لگے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بورڈ متنوع دباؤ کے درمیان اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ عالمگیر سطح پر طاغوت اپنی تیغِ جارحیت کو سان چڑھا کر میدان میں اترا ہے اور مسلمانوں کو بانٹ کر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے میں ہندوستانی مسلمانوں کی بے چینی بے معنی نہیں۔ مولانا رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے صدارتی خطبے میں اس کی طرف براہ راست اشارے نہ سہی، اضطراب کی کیفیت ضرور نظر آتی ہے۔ تاہم یہ بات خوش آئند ہے اور خدا نظر بد سے بچائے، کہ بورڈ اپنے ہم سفروں کو ساتھ لے کر چلنے میں بڑی مستعدی دکھائی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس موقع پر ایک اور نقطۂ نظر سے ارباب بورڈ کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کی جائیں:

سب جانتے ہیں کہ آزادئ ہند کے ساتھ ملک کو ایک دستور کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تحریری دستور کی تیاری کا کام شروع ہوا۔ انگریز جب ہندوستان سے چلا گیا تو اپنی جگہ

کانگریسی قیادت کوسونپ دی۔لیکن ملک میں تقریباً تمام چیزوں کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا،سوائے ایک دستور کے، جیسے نظامِ تعلیم، نظامِ عدلیہ، انتظامیہ وغیرہ وغیرہ۔عجیب بات ہے کہ انگلستان کا کوئی تحریری Written دستور نہیں ہے، پھر بھی ہندوستان کا تحریری دستور بنا جو دنیا کا سب سے بڑا دستور کہلایا۔اسٹیٹ کے رہنما اصولوں کے تحت دفعہ 44 میں یہ بھی درج کیا گیا کہ ریاست State یکساں سول کوڈ کے لیے کوشاں رہے گا۔اس پر مسلمانوں کی جانب سے بڑا ہنگامہ ہوا تو دستور ساز اسمبلی Constituent Assembly کے ذمہ دار کی جانب سے یہ جواب دیا گیا کہ ترمیم وتنسیخ کا عمل مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہوگا۔اس کے الفاظ تھے:''حکومت پاگل ہوگی اگر وہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف یہ کام کرے گی''۔مسلمانوں کا موقف یہ تھا اور ہے کہ اسلامی قانون کا یہ حصہ بھی ''مـنـزَّل مِـنَ اللّٰه'' ہے اور کوئی اس کو بدلنے کا مجاز نہیں۔حتیٰ کہ رسولِ برحق کو بھی قانونِ الٰہی کو بدلنے کا یہ اختیار نہیں تھا، کجا کہ کوئی اور اس کا مجاز ہو سکے۔غیر مسلم قانون داں اس بات کو دقیانوسی اور اندھی تقلید سمجھتے ہیں۔کیونکہ ان کی یہ کج فکری ہے کہ کوئی قانون ہمیشہ کے لیے ہو نہیں سکتا۔شریعت الٰہی کو سمجھنے سے ان کا ذہن عاجز ہے۔انہیں معلوم نہیں کہ اسلامی قانون میں کچھ احکام صراحتاً بیان ہوئے ہیں، کچھ اصول واضح طور پر عطا کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی کچھ حدود بھی متعین کر دیے گئے ہیں۔جیسے امتدادِ زمانہ اور اختلافِ تمدّن سے پیدا ہونے والے مختلف حالات کے لیے ایک سنہری قاعدہ ہمیشہ کے لیے یہ رکھا گیا ہے کہ: 'اجتہاد' کیا جائے، جس سے قانون کا ارتقاء صحت مند خطوط پر ہو۔اسلام کی اس غیر معمولی خصوصیت سے غیر مسلم قانون داں بے خبر و ناواقف ہیں۔اس لیے ان کو مسلمانوں کے اضطراب کا صحیح اندازہ ہو نہیں پاتا۔اس بے مائیگی اور بے بضاعتی کے باوجود ماڈرن لا کے ماہرین ہر مسئلہ کے حل IPC اور CrPC میں تلاش کرتے ہیں۔اس کی واضح مثال جسٹس چندر چوڑ کا وہ فیصلہ ہے جو انہوں نے شاہ بانو کیس میں دیا تھا جس پر احتجاجات ہوئے اور

بہار میں نوجوانوں کی ایک ریلی پر فائرنگ بھی ہوئی اور بالآخر رات دن ایک کر کے آنجہانی راجیو گاندھی کو قانون ہی میں ترمیم کرنی پڑی۔

واضح رہے کہ جمہوری ماحول میں صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ قانون کے ماہرین اور صاحب فہم حضرات ہمارے اس موقف کو سمجھ جائیں۔بلکہ ہمارے موقف کے پیچھے ایک مضبوط رائے عامہ کی ضرورت ہے۔ایسی رائے عامہ جو باشعور ہو اور وقت کے اقتدار سے اپنی بات منوا سکتی ہو۔اس معاملہ میں درج ذیل تجاویز اور مشورے غور وخوض کے قابل ہو سکتے ہیں:

1۔ملک میں جتنے بھی پرسنل لا ہیں، ہمارے پاس ان کا مستند ریکارڈ ہونا چاہیے اور اس کو ہم اس طرح ترتیب دیں کہ تقابلی مطالعہ کے لیے آسانی ہو جائے۔یہ بات یقینی ہے کہ اس تقابلی مطالعہ کے نتیجہ میں مسلم پرسنل لا کی معقولیت، فوقیت اور انفرادیت، اظہر من الشّمس ہو جائے گی۔اس رخ کو نمایاں طور پر پیش کیا جائے اور اس سے مسلم وغیر مسلم اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

3۔حضرات علماء باقاعدہ مسلم پرسنل لا کی حمایت میں اگرچہ کہ مستعد و متحرک ہیں، تاہم مندرجہ بالا بیان کردہ باتیں بھی ان کے مطالعہ میں لائی جانی چاہیے، تاکہ وہ Update ہوں اور ایک موثر رول ادا کر سکیں۔

4۔حضرات علماء علمی وفکری مواد فراہم کریں اور مسلم ایڈوکیٹ حضرات جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر زبان و بیان Approach and Terminology کے مطابق تشہیر ونشر واشاعت کا فریضہ انجام دیں۔

5۔ ملک کے تناظر میں اس کام کے لیے چونکہ انسانی وسائل Human Resources کی ضرورت ہے، چنانچہ اس کی خاطر علماء کی وہ تنظیمیں جن میں ملک گیر سطح پر علماء اپنی گرانقدر ملی و دینی خدمات میں مصروف ہیں، ملک کے دیگر علمائے کرام اور

مسلم اڈوکیٹ فورم (کرناٹک کی طرز پر) جیسے اداروں، جن کی خدمات خاص طور پر فسادات کے مواقع پر، محبوس مسلم نوجوانوں کو قانونی سہارا دینے اور ان کی رہائی کے سلسلے میں بڑی موثر ثابت ہوتی رہی ہیں، اور دیگر دلچسپی رکھنے والے ایڈوکیٹس کی خدمات سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

امید کی جانی چاہیے کہ پرسنل لا کے چنئی اجلاس کی کامیابیوں کے چرچوں کے درمیان یہ باتیں نہ صرف پڑھی جائیں گی، بلکہ انہیں غور وخوص کے قابل سمجھا جائے گا۔

☆☆

مسلم پرسنل لاء بورڈ کی کاوش: چند جھلکیاں

لازمی نکاح رجسٹریشن

ایک بحث

نکاح رجسٹریشن اور اس کو لازمی کرنے کا مسئلہ کافی دنوں سے زیر بحث ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ اس پر شروع سے غور کرتا رہا ہے۔ پیش ہے اس سلسلے کی کارروائی رپورٹ۔

تجویز کارروائی مجلس عاملہ بورڈ منعقدہ ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء

بمقام: ۲۸ ویسٹرن کورٹ، نئی دہلی

ایجنڈا (۴) کے موضوع یعنی نکاح رجسٹریشن کے سلسلہ میں جنرل سکریٹری صاحب کی جانب سے سوال نامہ کو مولانا نیاز احمد رحمانی نے پڑھ کر سنایا جسے علماء اور مفتیان کرام کو بھیجا گیا ہے اجلاس میں متعدد علماء کرام کے جوابات کی کاپیاں بھی تقسیم کی گئیں۔

جناب ظفریاب جیلانی نے بتایا کہ رجسٹریشن کا ایک قانون مہاراشٹر میں نافذ ہے جس میں اس کی خلاف ورزی پر جرمانہ کی سزا دی جاسکتی ہے، اس مسئلہ پر جناب معروف خاں صاحب، جناب مقصود علی خاں صاحب، مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی، مولانا سید احمد ہاشمی صاحب، جناب فضل الرحمٰن صاحب گنوری، مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ (ایم پی)، جسٹس بشیر احمد سعید اور جناب ذوالفقاراللہ صاحب نے اظہار خیال کیا جس کے بعد طے پایا کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ

لینے، علماء کرام کی آراء پر غور کرنے اور بعض ریاستوں میں نافذ قوانین کا جائزہ لے کر سفارشات پیش کرنے کے لیے حسب ذیل اصحاب پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے جو اپنی سفارشات مجلس عاملہ کے آئندہ اجلاس میں پیش کرے گی۔

۱۔ مولانا مجاہدالاسلام قاضی صاحب کنوینر
۲۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھل صاحب
۳۔ مولانا عروج احمد قادری صاحب
۴۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب گنوری
۵۔ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب
۶۔ جناب عبدالرحیم قریشی صاحب
۷۔ مولانا سید احمد ہاشمی صاحب
۸۔ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب

تجویز کارروائی مجلس عاملہ بورڈ منعقدہ ۶ رنومبر ۱۹۸۲ء

بمقام: بچوں کا گھر دریا گنج، دہلی

۵۔ نکاح کے رجسٹریشن سے متعلق مختلف ریاستوں میں نافذ قوانین اور مجوزہ قوانین کے مسئلہ پر اجلاس میں غور نہیں کیا جاسکا، کیونکہ متعلقہ کمیٹی کے کنوینر نے جو ابھی حج سے واپس تشریف نہیں لائے ہیں کوئی رپورٹ پیش نہیں کی اور اس کمیٹی کی تا حال کوئی میٹنگ نہ ہوسکی، ایجنڈا کے اس موضوع کو آئندہ اجلاس کے لیے ملتوی کیا گیا۔

سنٹرل وقف ایکٹ (جدید) کے سلسلہ میں تشکیل شدہ کمیٹی کی جانب سے جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم پی نے بتایا کہ کمیٹی کی کوئی میٹنگ نہیں ہوسکی، تاہم مرکزی حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ جلد از جلد بل پیش کرے، وزیر قانون مسٹر جگن ناتھ کوشل نے اس سیشن میں

اس بل کو پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب حکومت کہتی ہے کہ یہ بل ابھی زیر ترتیب ہے بجٹ سیشن میں پیش کیا جائے گا۔ وقف انکوائری کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ سرکاری عہدیدار کو وقف کمشنر مقرر کیا جائے جو بااختیار ہو اور بورڈ کو صرف مشاورتی نوعیت کا ادارہ بنایا جائے۔ ہم نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ وقف بورڈ کو بااختیار بنایا جائے، انھوں نے کہا کہ وقف بورڈ کا محض مشاورتی کمیٹی بن جانا کسی طرح برداشت کے قابل نہیں ہے، اجلاس نے کنوینر صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کمیٹی کا اجلاس طلب کریں، یہ بھی طے کیا گیا کہ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب بحیثیت کنوینر کمیٹی ایک مکتوب کے ذریعہ وزیر اعظم اور وزیر قانون کو بورڈ کے نقطۂ نظر سے واقف کروائیں۔ اس مکتوب کے ساتھ سفارشات پر مشتمل ایک نوٹ بھی منسلک کیا جائے جو جناب سیٹھ صاحب اور جناب سید شہاب الدین صاحب باہمی مشورہ سے تیار کریں۔

تجویز کارروائی اجلاس عام ششم بورڈ

بتاریخ ۲۸/۲۹ر دسمبر ۸۳ء بمقام: نیو کالج مدراس

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس نکاح رجسٹریشن سے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ قبول کرتا ہے، اور مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت پر یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ رجسٹریشن کا نکاح کے سلسلہ میں لزوم مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے بنیادی حق میں مداخلت کی ہی ایک شکل ہے، یہ اجلاس ملک کے تمام دینی اداروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ نکاح کے رجسٹریشن کا خود انتظام اور اس کا ایک قابل اعتماد ریکارڈ رکھیں، تاکہ نکاح کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حقوق کا تحفظ ہوسکے۔

اس اجلاس نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ عورتوں کو اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے ممکن سہولتیں ملنی چاہئیں، اور بورڈ اس سلسلہ میں ایجنڈا (۱۰) کی منظور شدہ تجویز کو دہرانا ضروری سمجھتا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ امینیہ دہلی اور مفتی عبدالوہاب

صاحب مدرسہ باقیات الصالحات ویلور کی تجویز جس کا تعلق وقف بورڈ کے ذریعہ غیر اوقافی آمدنی سے ٹیکس وصول کرنے سے ہے، اس تجویز کو اوقاف سے متعلق تشکیل شدہ سب کمیٹی کے حوالہ کیا گیا، مولانا شاہ محمد انوار اللہ صاحب قادری لطیفی شہر قاضی اہل سنت والجماعت شمالی آرکاٹ ویلور کی پیش کردہ مندرجہ ذیل تجویزیں منظور کی گئیں۔

۱- مسلم پرسنل لا اور یونیفارم سول کوڈ کے اہم نکات کا تقابلی جائزہ لے کر بورڈ مختلف زبانوں میں کتابیں طبع کرا کر تقسیم کرے۔

۲- بورڈ کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ کیا ہے؟ اس کے ضروری احکام ومسائل کیا ہیں؟ ان کی شرعی بنیادیں کیا ہیں؟ یونیفارم سول کوڈ کی کیا حقیقت ہے؟ اس طرح کے مسائل پر ایک مختصر نصاب بورڈ کی نگرانی میں مرتب کرایا جائے اور کوشش کی جائے کہ ہندوستان کے تمام مدارس اسلامیہ میں ہفتہ میں ایک کلاس مسلم پرسنل لا کے مسائل پر رکھا جائے، تاکہ ہمارے طلبہ ان مسائل پر حاوی ہو کر آئندہ تحفظ دین کے فرائض پورے شعور کے ساتھ انجام دے سکیں، اخیر میں منجانب صدر اجلاس مندرجہ ذیل تجویز بشکریہ پیش ہو کر منظور ہوئی۔

تجویز کارروائی مجلس عاملہ بورڈ منعقدہ

۱۹/اگست ۱۹۸۳ء بمقام: ویسٹرن کورٹ، دہلی

''نکاح کے رجسٹریشن کا مسئلہ'' مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء کے سامنے پیش ہوا مجلس عاملہ نے اس سلسلہ میں ایک سب کمیٹی بنائی تھی جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی۔

۱۔ مولانا محمد برہان الدین صاحب
۲۔ مولانا احمد عروج صاحب قادری

۳۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری
۴۔ عبدالرحیم قریشی صاحب
۵۔ مولانا سید احمد ہاشمی صاحب
۶۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب
۷۔ قاضی مجاہدالاسلام القاسمی صاحب

سب کمیٹی کی کوئی نشست منعقد نہیں ہوسکی لیکن، جناب جنرل سکریٹری صاحب بورڈ نے ہندوستان کے مختلف علماء کے نام مراسلے بھیج کر اس مسئلہ کے بارے میں استفسار کیا پھر مختلف علماء نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ بھی ارکان بورڈ کے نام ارسال کیا گیا جواب دینے والے علماء کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دیوبند
۲۔ مولانا محمد حنیف صاحب مدرسہ اسلامیہ ہلدیہ پورنیہ
۳۔ مولانا محمد ظہور صاحب مفتی ندوۃ العلماء لکھنؤ
۴۔ مولانا عبدالقدوس رومی مفتی آگرہ شہر
۵۔ مفتی حسین احمد صاحب مدرسہ رحیمیہ گاڑھا سہرسہ
۶۔ مولانا شمس الحق سلفی مرکزی دارالعلوم بنارس
۷۔ مولانا عبدالجلیل صاحب مدرسہ اسلامیہ بتیا
۸۔ مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب فیاض المسلمین بائسی پورنیہ
۹۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
۱۰۔ مولانا محمد سعید بزرگ صاحب
۱۱۔ مولانا محمود احمد صاحب قاسمی
۱۲۔ مولانا جمال الدین صاحب

۱۳۔ مولانا محمد ہاشم صاحب
۱۴۔ مولانا عبدالرزاق صاحب قاضی شریعت کٹیہار
۱۵۔ مولانا محمد مصلح الدین صاحب قاضی شریعت کشن گنج (پورنیہ)
۱۶۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب جامعہ رحمانی مونگیر
۱۷۔ مولانا محمد ظاہر صاحب جامعہ رحمانی مونگیر
۱۸۔ مولانا محمد نورالہدیٰ صاحب کٹیہار
۱۹۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامعہ قاسمیہ مرادآباد
۲۰۔ مولانا مفتی سید احمد علی سعید صاحب دیوبند
۲۱۔ مفتی عبدالعزیز صاحب مظاہر علوم سہارنپور
۲۲۔ مفتی برہان الحق صاحب جبل پور
۲۳۔ علامہ مولانا اکرام علی صاحب مفتاح العلوم مئو
۲۴۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب
۲۵۔ مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی صاحب
۲۶۔ مولانا شاہ فیاض عالم صاحب ولی اللہی

مسئلہ دو ہے ایک تو یہ ہے کہ رجسٹریشن کو نکاح کے انعقاد یا اس کے ثبوت کے لئے ایسی ضروری شرط مانی جائے کہ اس شرط کے فقدان کی صورت میں نکاح کو قانونی جواز حاصل نہ ہو یا تنازع کی صورت میں نکاح کو غیر ثابت تسلیم کیا جائے، یہ صورت بہر حال غلط ہے، اس لیے کہ شرعاً انعقاد نکاح کے لیے ایجاب وقبول دو گواہوں کی موجودگی کے ساتھ کافی ہے، لہٰذا ایسی کسی بھی شرط کا اضافہ اپنے جی سے ہوگا، اور جسے شرع نے منعقد مان لیا ہو اس کو اپنی لگائی ہوئی شرط کے ذریعہ غیر منعقد قرار دینا پڑے گا، اسی طرح قرآنی تصریحات کی روشنی میں نکاح ان امور میں سے ہے جس کے ثبوت کے لیے دو گواہوں کی شہادتیں کافی

ہیں، اگر دو شہادتوں کی موجودگی کو کافی نہ سمجھ کر رجسٹریشن کو ضروری قرار دیا جائے تو یہ بھی قانون شرع میں ترمیم ہوگی جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ رجسٹریشن کو نہ انعقاد کے لیے ضروری قرار دیا جائے، نہ ثبوت نکاح کے لئے، لیکن ریکارڈ کے انضباط اور دوسری مصالح کے پیش نظر قانونی طور پر رجسٹریشن کو لازم قرار دیدیا جائے، تو یہ صورت درست ہوگی یا نہیں، اس بارے میں علماء نے جو جوابات دیے ہیں تقریباً سب کا رجحان یہی ہے کہ یہ صورت درست نہیں ہے، مختلف حضرات نے مختلف وجوہ بتائے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اگرچہ رجسٹریشن کا قانون اثر انعقاد نکاح یا ثبوت نکاح پر نہیں پڑتا ہو، پھر بھی ایسے عمل کا مکلّف کرنا ہے جس کی تکلیف شرع نے نہیں دی ہے۔ دوسرے اس کے قانونی لزوم کو مستحکم کرنے کے لیے اگر بصورت خلاف ورزی مستوجب تعزیر قرار دیا جائے تو ان حضرات کے خیال میں ایک ظلم ہوگا، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر نکاح جیسے عمل کو سرکاری دفاتر میں رجسٹریشن کا پابند کردیا گیا تو عام رواج کے مطابق رشوت ستانی اور عدالتوں کی دوڑ بھاگ جیسی دس طرح کی کلفتوں میں نکاح جیسی سادہ تقریب مبتلا ہوکر رہ جائے گی، اور پھر رجسٹریشن کے سلسلہ میں جو اخراجات ہونگے وہ ایک مزید اضافہ ہوگا، بعض کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس طرح کے معاملات میں سرکار کی قانون سازی کا دخل شروع ہوگیا تو آئندہ بڑے مفاسد پیدا ہوسکتے ہیں، عام طور پر علماء کے رجحانات یہی ہیں، اس کے برخلاف دو تین علماء ایسے ہیں کہ وہ بعض حالات میں چند شرائط کے ساتھ رجسٹریشن سے متعلق قانون سازی کے جواز کی طرف گئے ہیں، مولانا زبیر احمد صاحب جامعہ رحمانی مونگیر نے ضرر عام کی صورت میں تسعیر (ریٹ کنٹرول) سے متعلق قانون سازی پر قیاس کرتے ہوئے بعض ایسے علاقوں کے لیے نکاح کے رجسٹریشن کو لازم قرار دینے کی رائے دی ہے، جہاں عام طور پر غیر ملکی لوگ آکر نکاح کرتے ہیں اکثر اس نکاح میں دھوکہ ہوتا ہے، اور نکاح کے رجسٹرڈ نہیں ہونے کی وجہ سے بیرون ملک چارہ

جوئی کی شکل نہیں رہتی تو ایسے حالات میں غیر ملکی افراد سے نکاح کے رجسٹریشن کو لازمی قانون قرار دینا ان کے نزدیک درست ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے رجسٹریشن نہ کرنے پر معمولی قسم کی تعزیر کا حق دینے کی بات کہی ہے، ان کے نزدیک لین دین کے سلسلے میں نزاع کی صورت میں رجسٹریشن ایک واضح ثبوت کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے، اگر چہ ان کی بھی رائے یہی ہے کہ بجائے قانونی سزا کے اس کی افادیت کی اشاعت زیادہ بہتر ہے، تاکہ لوگ خود بخود اس کے پابند ہوجائیں۔

معاملات، لین دین کو بشکل تحریر لانے کے سلسلے میں بنیادی طور پر جو آیت زیر بحث آتی ہے وہ سورۂ بقرہ کے اخیر سے پہلے (۳۹) انتالیسواں رکوع ہے۔

"یاأیها الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمیً فاکتبوهُ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یأب کاتب أن یکتب کما علمه الله فلیکتب ولیملل الذی علیه الحق ولیتق الله ربه ولا یبخس منه شیاً فان کان الذی علیه الحق سفیهاً أو ضعیفاً أولا یستطیع أن یمل هو فلیملل ولیه بالعدل، واستشهدوا شهیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهدآء أن تضل إحدٰهما فتذکر احداهما الأخریٰ الخ"

ان آیات میں چند باتیں کہی گئیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ جب آپس میں کوئی معاملہ قرض کے لین دین کا کرو تو اسے لکھ لیا کرو، جن کو لکھنا آتا ہے، وہ ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ لکھیں، مضمون کا املاء اس کی طرف سے ہونا چاہئے جس پر حق عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ شخص خود لکھانے کے لائق نہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی اس فرض کو ادا کرے۔ صرف لکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ دو معتبر گواہ بھی بنالئے جائیں۔ گواہ اظہار حق سے ہرگز گریز نہ کریں، معاملہ چھوٹا یا بڑا لکھنے میں ہرگز سستی سے کام نہ لیا جائے، اس لئے کہ لکھ کر رکھ لینا ہی عنداللہ انصاف کو قائم رکھنے والا اور شہادت کو پختگی اور استحکام دینے والا عمل ہے۔ مزید

برآں یہ کہ اس سے کسی شبہ کا اندیشہ بھی ختم ہوتا ہے۔ ہاں اگر یہ معاملہ دست بدست ہو اور فوری طور پر لین دین ہوگیا ہو تو نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

ان آیات قرآنی سے یہ امر واضح طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ وہ معاملات باہمی جو دور اور دیر تک اثر رکھنے والے ہیں ان میں شریعت کا رجحان یہ ہے کہ شہادت کے ساتھ ساتھ معاملات کی تحریر بھی ہوجائے، تاکہ آئندہ چل کر قیام عدل استحکام شہادت سے شک وشبہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے باہمی نزاعات کا خاتمہ ہوسکے۔ ان آیات کے سیاق وسباق پر غور کرتے ہوئے فقہائے امت کی رائے یہ ہے کہ معاملات کو لکھ لینا شرعاً مندوب ومطلوب اور مستحب ہے۔ واجب نہیں۔ امام طبری اور ابن جریج اس کے واجب ہونے کے قائل ہیں، لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ محض مستحب ہے۔ اس لئے کہ اگلی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ "**فإن أمن بعضکم بعضاً الخ**" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر باہمی اعتماد ہو تو کوئی چیز رہن لئے ہوئے بغیر بھی باہمی اعتماد پر معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ امام احمد ابن عبداللہ القرطبی انصاری نے لکھا ہے: "**وقال الجمهور الأمر بالکتب ندب علی حفظ أموال وإزالة الریب وإن کان الغریم بقیاً فما یضرهُ الکتاب وإن کان غیر ذلک فالکتاب ثقاف منی دینه وحاجة صاحب الحق**" (**الجامعة الأحکام القرآن ۳۸۳/۳**)۔

اور امام جصاص رازی نے "احکام القرآن" میں لکھا ہے:

"**(فان أمن بعضکم بعضاً) فثبت بذلک أن الأمر بالکتابة والشهادة والاشهاد ندب غیر واجب .... ولا خلاف بین فقهاء الأمصار إن الأمر بالکتابة والإشهاد والرهن المذکور جمیعه فی هذهِ الآیة وإرشاد إلی بالنافیة الخط والصلاح والاحتیاط للدین والدنیا وإن شیاً منه غیر واجبٍ**". (**۲۸۴/۱**)۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ معاملات کو لکھ لینا، گواہ بنالینا شرعاً پسندیدہ امر ہے، اور اس طرح اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن شرعاً واجب نہیں، لہذا اس کا تارک گنہگار نہیں ہوگا۔

نکاح ایک ایسا معاملہ ہے جس کے نتیجے میں متعدد احکام پیدا ہوتے ہیں عورت پر مختلف حقوق عائد ہوتے ہیں، مرد پر مہر اور نفقہ کی شکل میں مالی حقوق عائد ہوتے ہیں۔ بچوں کے نسب کا ثبوت اور وراثت میں ترکے کا استحقاق بھی نکاح پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اثرات بہت دوررس اور دیر تک رہنے والے ہیں، شریعت نے ثبوت نکاح کے لئے شہادت بالتسامع کو بھی قابل قبول قرار دیا ہے، پس اگر رجسٹریشن اور کسی دستاویزی ثبوت کے ذریعہ نکاح کے معاملہ کو پختہ اور مستحکم ریکارڈ کی شکل دیجائے تو بلاشبہ شرعاً یہ چیز پسندیدہ اور مناسب قرار دی جانی چاہئے۔ لیکن شرعاً کسی مباح و مستحب کو اس کی اباحت اور استحباب سے ہٹا کر واجب یا ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ الّا یہ کہ وہ مصالح جن کا حاصل ہونا شرعاً ضروری ہے یا وہ مفاسد جن کا دور کرنا شرعاً واجب ہے ان مصالح کا حصول یا ان مفاسد کا ازالہ اس امر مندوب و مستحب یا مباح کے حصول پر موقوف ہوجائے تو ایسی صورت میں وہ مستحب اور مباح خود واجب اور ضروری ہوجاتا ہے، لہذا اس کے قانونی لزوم کا حکم دیا جاسکتا ہے، اور ایسی صورت میں اس حکم کی خلاف ورزی پر تعزیر بھی کی جاسکتی ہے۔ سیدنا عمرؓ کے احکام میں بہت سے فقہی جزئیات میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔

لہٰذا رجسٹریشن کے مفید اور بہتر تسلیم کئے جانے کے باوجود یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا رجسٹریشن نہیں کرانا کسی واجب مصلحت شرعی کے ترک یا کسی واجب الدفع مفسدہ کے پیدا ہونے کا موجب ہے۔ ..... ہمارے نزدیک باوجودیکہ موجودہ حالات میں رجسٹریشن نہ صرف یہ کہ مناسب اور مفید ہے، بلکہ ایک حد تک اسے ضرورت بھی قرار دیا جاسکتا ہے، پھر بھی رجسٹریشن نہیں کرانے میں اتنا بڑا مفسدہ ہے یا نہیں ہے جس کی بنیاد پر اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا جاسکے، قابل غور ہے۔ علاوہ ازیں اس ضرورت کی تکمیل کے لیے

سرکاری دفاتر کے ذریعہ رجسٹریشن ضروری ہوگا، یا یہ کام مسلمان اپنے قائم کردہ داخلی نظام کے ذریعہ بھی کرسکتے ہیں، نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ سرکاری نظام کے تحت رجسٹریشن بلاشبہ عام لوگوں کو جو دور دراز دیہاتوں میں رہتے ہیں سخت دشواریوں میں مبتلا کرے گا۔ دوسری طرف اس کی افادیت اور ضرورت کے پیش نظر اور اس نقطۂ نظر سے کہ آج عام طور پر لوگ قانون کی پابندی کو چاہے وہ ان کے مفاد میں کیوں نہ ہو بار محسوس کرتے ہیں، کوئی ایسی صورت تجویز کیا جانا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے لوگ رجسٹریشن کے پابند ہوجائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ رجسٹریشن کے متعلق ایسا کوئی بھی ایکٹ جن کی رو سے نکاح کا انعقاد رجسٹریشن پر موقوف رکھا گیا ہو قطعاً شرع اسلام سے متصادم ہے۔

۲۔ رجسٹریشن کو ثبوت نکاح کیلئے لازم قرار دینا بھی شرع اسلام کے خلاف ہے۔

۳۔ البتہ ریکارڈ کے تحفظ اور نکاح کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کے لئے ایسا نظام قائم کرنا جس میں کم سے کم دشواریاں ہوں نہ صرف یہ کہ جائز ہوگا، بلکہ اسے مستحسن قرار دیا جانا چاہئے۔ لیکن یہ مسئلہ قابل غور رہے گا کہ رجسٹریشن کو اس طرح لازم قرار دینا کہ اس کے نہ کرانے پر تعزیر کی جاسکے، درست ہوگا یا نہیں؟

تجویز کارروائی مجلس عاملہ بورڈ منعقدہ ۲۰/اگست ۱۹۹۰ء

بمقام: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو

۱۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کرتا ہے کہ حکومت مغربی بنگال کے وزیر قانون کا ''کمپلسری میرج رجسٹریشن'' کی قانون سازی کے متعلق مبینہ بیان مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہے، مجلس عاملہ کا یہ اجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ کی جنرل باڈی واجلاس مدراس منعقدہ ۲۹/دسمبر ۱۹۸۳ء کی اس تجویز کا اعادہ کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن کو لازمی قرار دینا قانون شریعت میں مداخلت ہے۔

اجلاس مدراس کی مفصل تجویز کے مطابق مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت مغربی بنگال کے نکاح رجسٹریشن سے متعلق مجوزہ قانون سازی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس طرح کی قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کی راہ ہموار ہوگی جسے مسلمان قبول نہیں کرسکتا۔

۲۔ یہ اجلاس محترم جنرل سکریٹری بورڈ کی اس سلسلہ میں کئے گئے اقدامات کی تائید وتحسین کرتا ہے اور ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ابھی حکومت مغربی بنگال کے نام ٹیلیگرام اور خطوط بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے ساتھ ہی ٹیلیگرام اور خطوط کے معتد بہ تعداد میں پہنچنے کے بعد بورڈ کا ایک وفد وزیر اعلیٰ ووزیر قانون حکومت مغربی بنگال سے مل کر اس موضوع پر گفتگو کرے اور ان پر ملت اسلامیہ کا موقف واضح کرے۔

۳۔ مجلس عاملہ صدر محترم اور جنرل سکریٹری صاحب کو اختیار دیتی ہے کہ قانون دانوں پر مشتمل ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل فرمائیں جو مختلف صوبائی حکومتوں کے نکاح رجسٹریشن ایکٹ کا جائزہ لیں اور بورڈ کے دفتر کو آگاہ کریں کہ نکاح رجسٹریشن کے قوانین سے کس حد تک مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہے۔

سولہواں اجلاس منعقدہ ۲۱، ۲۲، ۲۳/ جون ۲۰۰۲ء

بمقام دارالعلوم حیدرآباد

دیگر امور باجازت صدر سکریٹری بورڈ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب نے شادیوں کے لازمی رجسٹریشن کے بل کی آندھراپردیش اسمبلی میں منظوری کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تفصیلات سے اجلاس کو آگاہ کرایا۔ طے کیا گیا کہ یہ اجلاس آندھراپردیش میں شادیوں کے لازمی رجسٹریشن بل کو شریعت میں مداخلت کی سمت پہلا قدم قرار دیتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں کی شادیوں کے رجسٹریشن کا وقف بورڈ کے تحت اس ریاست میں منظم اور باقاعدہ

نظام تقریباً دوصدی سے رائج ہے، اس لئے یہ اجلاس گورنر آندھراپردیش سے گذارش کرتا ہے کہ وہ اس مسودۂ قانون پر اپنی رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ اور حکومت آندھراپردیش سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس میں ترمیم کے ذریعہ مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار دے۔

کارروائی مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (لازمی نکاح رجسٹریشن)

منعقدہ ۸/ مارچ ۲۰۰۶ء، بمقام دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور

ڈاکٹر قاسم رسول الیاس صاحب نے نکاح کا لازمی رجسٹریشن کے لئے قانون سازی کے سپریم کورٹ کے حکم کے مسئلہ کو پیش کیا۔ جناب مولانا سید نظام الدین صاحب نے فرمایا کہ اس سے قبل مغربی بنگال میں اس طرح کا قانون بنایا جارہا تھا تو اس وقت بورڈ کے بانی جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی کہ شریعت میں اس کا لزوم نہیں ہے اور رجسٹریشن کو لازم کرنا قابل عمل نہیں ہے، اس لئے رجسٹریشن کے قانون میں سب پر لزوم عائد نہ کیا جائے، رجسٹریشن کے لئے بلالحاظ مذہب سب کے لئے ایک ہی فارم ہوگا، جب کہ مسلمانوں کے پاس نکاح کے شرائط وضوابط دوسروں سے مختلف ہیں یہ لازمی رجسٹریشن ایک طرح سے یکساں سول کوڈ کی تدوین کی جانب ایک قدم محسوس ہوتا ہے، جناب ڈاکٹر الیاس اور مولانا سجاد نعمانی صاحب نے کہا کہ لازمی رجسٹریشن کی مخالفت کے بجائے کوئی متبادل شکل پیش کی جائے، لازمی رجسٹریشن کی بالکلیہ مخالفت مناسب نہیں ہے، اس کے بجائے کچھ عملی تجاویز پیش کی جائیں اور ہمارے پاس جو نکاح خواں ہیں ان کو قانون کے تحت نکاح کا رجسٹریشن قرار دینے کی کوشش کی جائے۔ جناب سید شہاب الدین صاحب نے کہا کہ بل کی کاپی ان کو ملی تھی اور ان کا احساس یہ ہے کہ اس بل میں ایسی گنجائش موجود ہے جس سے ہمارے مطالبات کی تکمیل ہوسکتی ہیں، یا پھر ہم اس بل میں ہمارے مطالبات کو شامل کرنے کے لئے نمائندگی کرسکتے ہیں۔ مولانا

خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے کہا کہ رجسٹریشن کے سلسلہ میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن رجسٹریشن کے لزوم سے آئندہ دشواریاں پیش ہوسکتی ہیں۔ اس کا جائزہ لیا جائے۔

جناب ظفریاب جیلانی صاحب ایڈوکیٹ نے کہا کہ نکاح کا رجسٹریشن لازمی قرار نہ دیا جائے ہمارا یہ موقف برقرار رہنا چاہئے، ورنہ دیہاتوں میں ہونے والی شادیاں کالعدم قرار پاسکتی ہیں۔ اسلامی نکاح کو اس قانون کے تحت درست قرار دینے اور جو رجسٹریشن ہمارے پاس ہوتا ہے اس کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرنا چاہئے اگر یہ ہوتا ہے تو درست ہے، رجسٹریشن کے لزوم سے شادی کے مصارف میں اضافہ ہوگا۔ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب نے کہا کہ ایک بات کا یقین حاصل کرنا پڑے گا کہ رجسٹریشن کروانے کی صورت میں شادی کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں آئے اور دوسرے یہ کہ رجسٹریشن کو مشکل اور مالی طور پر بوجھ نہ بنایا جائے ریاست مہاراشٹر میں یہ قانون موجود ہے۔ لیکن انہیں نقائص کی وجہ سے یہ قانون اب تک صرف کاغذ کی زینت بنا ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ نیشنل کمیشن وومن سے بل منگوا کر اس پر غور کیا جائے، پھر اس کے بعد بورڈ کی جانب سے واضح ردعمل کا اظہار کیا جائے، اجلاس نے اس کے لئے درج ذیل ارکان بورڈ پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی۔

۱- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب حیدرآباد
۲- مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی صاحب لکھنؤ
۳- جناب سید شہاب الدین صاحب دہلی
۴- جناب ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس صاحب (کنوینر) دہلی

انیسواں اجلاس عام بمقام مدراس (چنئی) ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر قاسم رسول الیاس نے نکاح کے لازمی رجسٹریشن کے تعلق سے رپورٹ پیش کی، جس میں National Women Commission کی مجوزہ مسودہ قانون کا جائزہ لیا اور اس کے صدر نشیں سے نمائندگی کا تذکرہ کیا۔

اس اظہار خیال کے دوران یہ بات بھی پیش کی گئی کہ مسلمانوں میں نکاح کا ریکارڈ کسی نہ کسی انداز پر مساجد کمیٹیوں، مسلم جماعتوں، قاضیوں اور نکاح خوانوں کے پاس محفوظ رہتا ہے، جب کہ برادران وطن اور خصوصاً ہندوؤں میں ایسا کوئی رواج نہیں پایا جاتا۔

اجلاس نے طے کیا کہ نکاح کے رجسٹریشن کو لازمی کرنے کے قانون سازی کی مخالفت کی جائے اور نکاح کے رجسٹریشن کے تعلق سے جو لازمی نہ ہو یہ دفعہ شامل کروائی جائے کہ مسلمانوں کے پاس نکاح کا جو ریکارڈ تیار اور محفوظ ہوتا ہے اس کو اس مجوزہ قانون کی تکمیل سمجھا جائے۔

مدراس اجلاس ۲۰۰۷ء نکاح کے لازمی رجسٹریشن سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ

نکاح کے لازمی رجسٹریشن سے متعلق سپریم کورٹ کی ہدایت پر نیشنل وومن کمیشن کی جانب سے قانون کا مسودہ تیار کرنے کا مسئلہ بنگلور کی مجلس عاملہ کی میٹنگ منعقدہ ۸ مارچ ۲۰۰۶ء میں زیر بحث آیا۔ اس سلسلے میں مسئلہ کا جائزہ لینے اور بورڈ کی جانب سے ممکنہ ردعمل طے کرنے کی غرض سے درج ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب
۲- مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی صاحب
۳- جناب سید شہاب الدین صاحب
۴- ڈاکٹر قاسم رسول الیاس (کنوینر)

نکاح کے لازمی رجسٹریشن سے متعلق بنگلور کے اجلاس میں درج ذیل اشکالات سامنے آئے تھے:

۱- اس سے قبل مغربی بنگال میں جب اس قسم کا قانون بنایا جارہا تھا تو اس وقت کے بانی جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اس کی مخالفت کی تھی کہ شریعت میں

اس کا لزوم نہیں ہے۔

۲- رجسٹریشن کو لازمی کرنا قابل عمل نہیں ہے۔

۳- رجسٹریشن کے لئے ایک ہی فارم بلا لحاظ مذہب سب کے لیے ہوگا۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس نکاح کی شرائط وضوابط دوسروں سے مختلف ہیں۔

۴- یہ لازمی رجسٹریشن یکساں سول کوڈ کی تدوین کی جانب ایک قدم ہوگا۔

۵- دیہاتوں میں مقیم ناخواندہ مسلمانوں کے لیے اس سے مسئلہ پیدا ہوگا۔

۶- رجسٹریشن کے لزوم سے شادی کے مصارف میں اضافہ ہوگا۔

تاہم یہ رائے بھی سامنے آئی کہ لازمی رجسٹریشن کی مخالفت کے بجائے متبادل شکلیں پیش کی جائیں۔

۱- ہمارے نکاح خواں حضرات کے ذریعہ پڑھائے جانے والے نکاح کو قانونی جواز (سند) فراہم کرانے کی کوشش کی جائے۔

۲- اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ رجسٹریشن کروانے کی صورت میں شادی کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں ان سوالوں کے ممکنہ جواب فراہم کرنے کی کوشش کی گئی اور نیشنل وومن کمیشن کی جانب سے بل کا مسودہ حاصل کیا گیا۔ اس پر پہلے دہلی میں مقیم ارکان بورڈ کے ساتھ محترم جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی۔ بعد ازاں 26 نومبر کو مجلس عاملہ کے اجلاس سے ایک دن قبل 25 نومبر 2005 کو ارکان کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ کمیٹی کے ایک معزز رکن سید شہاب الدین صاحب اس بل پر اپنی رائے صدر بورڈ اور جنرل سکریٹری کو لکھ چکے تھے اور اپنے موقف سے نیشنل وومن کمیشن کی چیر پرسن محترمہ گرجا دیاس کو واقف کرا چکے تھے، اس لیے موصوف نے کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ سید شہاب الدین صاحب

نے اصولی طور پر بل کے مندرجات سے اتفاق کیا، البتہ وومن کمیشن کو یہ بھی رائے دی کہ ایسے جوڑے جو بنا شادی کے میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں ان کو بھی رجسٹریشن کے تحت لانے کی کوشش کی جائے۔ شہاب الدین صاحب نے لڑکی کے لیے ۱۸ سال اور لڑکے کے لیے ۲۱ سال کی عمر کی شرط سے بھی اتفاق کیا۔ تاہم مذکورہ بالا دونوں میٹنگوں میں مسودہ کے تفصیلی مطالعہ کے بعد درج ذیل امور متفقہ طور پر طے کیے گئے۔

۱۔ مسودہ سے لازمی (Compulsory) کا لفظ ہٹایا جائے۔ حالانکہ مسودہ کی دفعہ 20 میں کہا گیا ہے کہ کسی شادی کو محض اس بنا غیر قانونی نہیں مانا جائے گا کہ وہ اس قانون کے تحت رجسٹرڈ نہیں کی گئی ہے۔ (تاہم دفعہ ۲۰ اور دفعہ ۱۲ ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں) رجسٹریشن ایک Voluntary عمل ہونا چاہیے۔ رجسٹریشن کو لازمی نہ کروانے کی متعدد وجہیں ہوسکتی ہیں۔ تاہم اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی کثیر آبادی بالخصوص مسلمانوں کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ ناخواندہ اور ان پڑھ افراد کا Procedural معاملات میں اکثر استحصال ہوتا ہے۔

۲۔ مسودہ میں رجسٹریشن سے متعلق بیان کردہ درج ذیل مقاصد سے شدید اختلاف ہے:

۱۔ بچوں کی شادی کو روکنا اور اس بات کو یقینی بنانا کہ شادی کے لیے کم سے کم عمر کے قانون (18 اور 21) کا احترام ہو۔ ۲۔ تعدد ازدواج کو روکنا۔ ۳- پہلی بیوی کو دوسری شادی کی اطلاع کا ہونا۔ تعدد ازدواج کے دائرے سے ان شادیوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا، جہاں مذہب نے یا روایات نے اس کی اجازت دے رکھی ہے، لہٰذا ہمارا مسئلہ اس وضاحت سے حل ہوجاتا ہے۔ البتہ اسلام دوسری شادی کے لیے مرد پر صرف دونوں بیویوں کے درمیان انصاف کی شرط لگاتا ہے۔ جہاں تک اطلاع کا تعلق اسلام کی نگاہ میں شادی کا اعلان خود اطلاع ہے۔ پہلی بیوی کو علیحدہ سے اطلاع دینے یا اس کی مرضی حاصل

کرنے کی کوئی شرط اسلام نہیں لگاتا ہے۔لہذا اس شق کو اس مسودہ سے خارج کیا جائے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مقاصد کا تعلق ہے اس سے اتفاق ہے، یعنی یہ کہ عورت کو استحصال سے بچانا، عورت کے لیے مکان اور نفقہ کو یقینی بنانا، غیر ممالک میں شادی کرنے والی خواتین کے حقوق کا تحفظ، لڑکیوں کی خرید وفروخت پر پابندی لگانا، مرد کے لیے عورت کو معلق چھوڑ دئے جانے کے معاملات پر روک لگانا وغیرہ۔

۴۔ دفعہ ۱۲: میں رجسٹریشن کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے، بلکہ نکاح خواں پر یہ ذمہ داری عائد کی جائے کہ وہ نکاح کو رجسٹرڈ کروائے۔اگر نکاح کا رجسٹریشن لازمی نہ ہو تو پھر قانونی طور پر یہ ذمہ داری کسی پر بھی عائد نہیں ہوتی۔

۵۔ دفعہ ۱۳: میں نکاح کے بعد ۳۰ دن کے اندر رجسٹریشن کی قید مناسب نہیں ہے۔ ۳۰ دن کی مدت کم ہے، لہذا اس پر جرمانہ عائد کرنا صحیح نہیں ہے۔ گو کہ یہ بہت Nominal ہے، تاہم غریب اور پس ماندہ افراد کے لیے یہ بھی بہت ہے۔

۶۔ رجسٹریشن کے لیے دونوں کی عمر کے سرٹیفیکٹ کو لازم قرار نہ دیا جائے، بلکہ نکاح خواں نے اپنے نکاح نامہ میں جو عمر درج کی ہے اسی کو مان لیا جائے۔

۷۔ دفعہ ۱۴ غیر ضروری ہے۔(Exemption from Personal Appearance)

۸۔ دفعہ ۱۵ میں رجسٹرار کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ رجسٹر میں اندراج سے قبل فریقین سے یہ وضاحت حاصل کرے کہ یہ نکاح ان کی مرضی سے ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کمیٹی کا خیال ہے کہ نکاح کے وقت کی رضامندی ہی اصل رضامندی ہے، لہذا اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔ عبارت میں اسی کی رعایت ہونی چاہیے۔

۹۔ دفعہ ۱۷ کی شق (b) مسلمانوں کی حد تک غیر ضروری ہے، لہذا مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔(۱۸ سال اور ۲۱ سال کی قید)

۱۰۔ دفعہ ۱۷ کی شق (d) بھی صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک جبر کا تعلق ہے اگر نکاح کے وقت کسی جبر کی کوئی شکایت نہیں کی گئی اور دونوں نے برضا و رغبت ایجاب وقبول کا مرحلہ انجام دیا تو اب جبر کی شکایت صحیح نہیں ہے۔ جبر کو ثابت کرنے کے لیے بھی پرسنل لا کے مطابق ہی معاملہ ہوگا۔

۱۱۔ دفعہ ۳۱ کی عبارت کو مسلمانوں کے اعتبار سے تبدیل کیا جائے (Child Marriage سے متعلق معاملہ)

۱۲۔ رجسٹریشن سے متعلق فارم میں گواہوں کے نام بھی درج ہونے چاہییں اور یہ وضاحت بھی کہ یہ نکاح میرے سامنے انجام پایا۔

۱۳۔ رجسٹریشن فارم میں مہر کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔

۱۴۔ قانونی لحاظ سے الفاظ لگے بندھے ہونے چاہییں۔

اگر لازمی رجسٹریشن قانون سے لازمی کا لفظ ہٹا دیا جائے اور مسلمانوں کی رعایت کرتے ہوئے متذکرہ بالا تجاویز کو منظور کر لیا جائے تو ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں کنوینر کمیٹی سے ایک ملاقات میں وومن کمیشن کی چیر پرسن نے بورڈ کے تعاون سے ان امور کو انجام دینے سے اتفاق کیا تھا۔ اگر بورڈ اس سلسلے میں اپنا موقف طے کر لیتا ہے تو اسی صورت میں کمیشن کی چیر پرسن سے ملاقات کر کے اس مسودہ میں ضروری ترامیم کروائی جاسکتی ہیں۔

☆☆

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
چند ذاتی تاثرات

● پروفیسر طاہر محمود
سابق چیئرمین قومی اقلیتی کمیشن

۱۴؍مارچ ۱۹۷۲ء کی شام کو دارالعلوم دیوبند کے وسیع وعریض مرکزی ہال میں ایک عظیم اجتماع منعقد ہوا تھا جس میں شرکت کے لئے ملک بھر کے منتخب علمائے کرام اور فقہائے عظام کو دعوت دی گئی تھی۔ اس اجلاس کا اہتمام دارالعلوم کے اس وقت کے ناظم اعلیٰ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ایما پر کیا گیا تھا۔ موصوف نے ازراہِ شفقت اور غالباً بغرض تربیت، علماء کے حلقوں کے باہر سے چند دنیادار نفوس کو بھی مدعو کیا تھا۔ مؤخر الذکر مدعوئین خصوصی کی محدود فہرست میں خوش قسمتی سے یہ خاکسار بھی شامل تھا کہ یہ سعادتِ عظمیٰ خالقِ ازل کی طرف سے میرے لئے مقدر ہوچکی تھی۔ چند روز قبل ہی مجھے بالکل بے متوقع طور پر قاری محمد طیب صاحب مرحوم ومغفور کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا جس میں اس اجتماع میں حاضری کا حکم دیا گیا تھا۔ میں تعمیل ارشاد میں دارالعلوم میں حاضر ہوا اور الحمدللہ بزرگان ملت کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا۔ میرے ذہن ودل میں اس اجتماع کا روح پرور منظر آج تک محفوظ ہے۔ جلیل القدر داعی محترم کی معیت میں لکھنؤ کے صاحب 'الفرقان' مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم اور دیگر چنندہ علماء کے علاوہ اس وقت مرکزی حکومت میں وزیر کی حیثیت سے شامل جناب محمد یونس سلیم صاحب مدظلہ العالی بھی جلسے میں

پیش پیش تھے۔ تبحر علمی اور غیرت دینی سے بھرپور تقاریر کا سلسلہ ختم ہوا تو چند منتخب حضرات ایک علیحدہ کمرے میں تجاویز مرتب کرنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نسبتاً جواں سال عالمِ دین نے مرتب کردہ تجاویز بڑے سلیقے سے اجتماع میں پیش کیں جو کہ بالاتفاق منظور کرلی گئیں۔

قارئین کرام! یہ وہ لمحہ مسعود تھا جس میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی اس نمائندہ تنظیم کی داغ بیل پڑی جسے آج دنیا ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے نام سے جانتی ہے۔ صوبہ بہار کے وہ عالم دین جنہوں نے دارالعلوم کے جلسے میں تجاویز پڑھ کر سنائی تھیں۔ آج کے فقیہ مقتدر قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب تھے جو کہ اب ماشاءاللہ اس سرکردہ ملی تنظیم کی کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ خداوند کریم انہیں صحت کلی اور درازی عمر سے نوازے اور ملت پر ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

بورڈ کا باقاعدہ قیام اسی سال ۱۹۷۲ء کے اواخر میں عروس البلاد ممبئی کی سرزمین پر ایک عظیم الشان اجتماع کے دوران عمل میں آیا تھا۔ بزرگان ملت کے فیصلے کے مطابق اس نمائندہ تنظیم میں مسلمانانِ ہند کے تمام مسلکی طبقات، سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، اثنا عشریٰ، اسماعیلی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث سب ہی شریک تھے۔ ملی اتحاد کا یہ زبردست مظاہرہ ملکی حالات کے اس پس منظر میں کیا گیا تھا جس میں شریعتِ مطہرہ کے تحفظ وبقا کے لئے منظّم اقدامات کے ناگزیر ہوجانے کو ملت کے سب ہی طبقوں نے یکساں طور سے محسوس کیا تھا۔ حکیم الاسلامؒ کے بعد بورڈ کے مفکر ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کی عاطفت کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے موجودہ صدر قاضی مجاہدالاسلام دیوبند کی عظیم درسگاہ قاسمی کے ایک نامور فرزند ہیں جنہوں نے بین الاقوامی شہرت یافتہ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بانی صدر کی حیثیت سے شریعت مقدسہ کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ بورڈ کے ارکان میں ملک کے چیدہ علماء اور فقہا شامل رہے ہیں اور اس ایک شعبہ خواتین پر

مشتمل ہے۔ میں اس تنظیم عالیہ کا رکن تو نہیں تاہم کبھی کبھی جب بھی حکم ملا اس کے اجلاسوں میں خصوصی حاضری کی سعادت حاصل کرتا رہا ہوں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ انشاء اللہ العزیز جلد ہی اپنی خدمات عالیہ کی تین دہائیاں مکمل کرلے گا۔ ملک میں تحفظ شریعت کے لئے بورڈ کی جدوجہد بے شک قابل قدر رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ملک وملت کو اس تنظیم عالی کی آج کل کے حالات میں ماضی سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں میں بورڈ نے اپنی حدودِ کارکردگی میں اضافہ کیا ہے، تاہم ملت آج جن حالات سے دوچار ہے ان کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے اس میں اور وسعت کی ضرورت ہے۔ مزید برآں میری ناقص رائے میں اس ملک میں شریعت مطہرہ کے تحفظ کے لئے اس کو اغیار کی مداخلت بیجا کے ساتھ ساتھ اپنوں کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ غلط استعمال سے بھی محفوظ رکھنے کا اہتمام ناگزیر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان امور پر بورڈ کے موجودہ ارباب حل وعقد اور ارکان کی دوررس نظریں بھی ضرور ہوں گی۔

☆☆

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
ماضی سے حال کی طرف

● محمد فہیم اختر ندوی

آج سے اٹھائیس برس (اب ۳۰ برس) پیچھے کی طرف پلٹئے، سرد دسمبر کی آخری راتیں ہیں، ایک وسیع میدان میں پوری ملت اسلامیہ کے اکابرین جمع ہیں، نہ مسلکوں کا فرق ہے نہ علاقوں کا، اس مجمع میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، دیوبندی بھی ہیں بریلوی بھی، حنفی بھی ہے شافعی اور اہل حدیث بھی، جنوب کے رہنے والے بھی ہیں اور شمال کے بھی، ان میں مسند نشینان خانقاہ بھی ہیں اور یہ شینان مدرسہ بھی، علوم نبوت کے حاملین بھی ہیں اور دانشور زمانہ بھی.....اور ان سب کی زبان پر ایک ہی صدا ہے.....تحفظ شریعت اسلامیہ.....

۱۹۳۷ء کے شریعت اپلیکیشن ایکٹ کو دستور ہند کے ذریعہ ملے تحفظ کے باوجود جب متوازی اور بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ منسوخ کرنے کی کوششیں تیز ہونے لگیں تو نور اسلام سے منور ہر سینہ اس کے لئے تڑپ اٹھا اور اس تڑپ نے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی شکل اختیار کی.....ملت کا یہ اتحاد بڑا قابل قدر تھا اور عظیم طاقتور بھی، اس طاقت نے خطرناک حالات کے تیور بدل ڈالے، ناپاک عزائم کو نکیل پہنادی اور ملت اسلامیہ کو ولولہ وحوصلہ عطا کیا۔

متبنّیٰ بل کی واپسی، ایمرجنسی کی جبری نس بندی کے خلاف موقف، لازمی نکاح

رجسٹریشن کا خاتمہ، یکساں سول کوڈ کی مخالفت، تحفظ حقوق مسلم مطلقہ ایکٹ کی منظوری، قانون وقف میں اصلاحات، بابری مسجد کی شرعی حیثیت کا دوٹوک اعلان اور اس کی بازیابی کی مسلسل جدوجہد، اراضی مساجد وقبرستان کا تحفظ، اوقافی جائدادوں پر انکم ٹیکس کا خاتمہ، قانون شریعت کے خلاف دائر مقدمات میں جدوجہد، اصلاح معاشرہ کی کوششیں اور قانون اسلامی کے ایک مستند ومرتب مجموعہ کی تیاری وغیرہ وغیرہ بورڈ کی راہ کے روشن نقوش ہیں۔

۱۹۸۳ء میں اس متحدہ کارواں کے اوّلین سالار رخصت ہوئے اور ۱۹۹۱ء میں اس کے محرک اور روح رواں بھی چلے گئے اور ۱۹۹۹ء کے آخری دن دوسرے میر کارواں بھی ہم سے چھن گئے۔ اس کے بعد ملت نے ۲۳؍اپریل ۲۰۰۰ء کو اس کی قیادت ایسے شخص کے سپرد کی جس کے مضبوط عزائم کے بوجھ نے جسم کو کمزور کر دیا تھا، جو قانون شریعت کے بحر کا شناور تدبیر وتدبر کا نمونہ تھا، جو اتحاد ملت کا نہ صرف داعی وعلمبردار تھا بلکہ اس راہ میں اس نے کتنی راتوں کا آرام قربان کیا تھا اور کتنے دنوں کی سختیاں جھیلی تھیں۔

فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی مدظلہ العالی کی سربراہی وقیادت میں بورڈ اپنی راہ پر گامزن ہے۔ آیئے دیکھیں بورڈ اس وقت کن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

قانونی میدان:

یوپی میں مذہبی عبادت گاہ بل کے پاس ہونے سے درپیش خطرات کا اندازہ کرتے ہوئے بورڈ نے اس بل کی سخت مخالفت کی، جن ریاست میں ایسا قانون پہلے سے نافذ ہے وہاں بھی انہیں ختم کرانے کی کوشش کی، نیز اس مسئلہ پر مذہبی آزادی کے علمبردار غیر مسلموں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے صدر بورڈ نے مختلف مذاہب کے نامور رہنماؤں کو ہندی میں خط لکھا۔

۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ سے پاس کئے گئے تحفظ حقوق مسلم مطلقہ ایکٹ کے دستوری جواز کو متعدد غیر مسلم ونام نہاد مسلم افراد واداروں نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر رکھا تھا۔ ۲۹ تا

۳۱؍اگست ۲۰۰۰ء میں ایسے اٹھارہ مقدمات کی سماعت سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے کی۔ بورڈ کے نامور وکلاء صاحبان نے پوری تیاری کے ساتھ بحث میں حصہ لیا اور مؤثر انداز میں اپنا موقف واضح کیا، اس سلسلہ میں فیصلہ آنا ابھی باقی ہے۔

بابری مسجد سے متعلق حق ملکیت کے مقدمات الٰہ آباد ہائی کورٹ میں چل رہے ہیں، بورڈ مسلسل اس میں مصروف ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کی تحقیقات کرنے والی لبراہن کمیشن کی کارکردگی میں بھی بورڈ پوری دلچسپی لے رہا ہے۔

دستور پر نظر ثانی کا مسئلہ بہت اہم ہے، اس نام کے پردہ میں دستور کے بنیادی ڈھانچہ کو بدلنے اور اقلیتوں کو حاصل متنوع آزادی کو ختم کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ بورڈ ان خطرات کو محسوس کر رہا ہے، چنانچہ بورڈ نے اس مسئلہ کو بھی بڑی سنجیدگی سے لیا ہے، اس نے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو اس بابت ہونے والی ہر پیش رفت پر نظر رکھ رہی ہے اور اس کا جائزہ لے رہی ہے۔

سماجی میدان:

اصلاح معاشرہ بورڈ کی خدمات کا ایک اہم عنوان رہا ہے اور اس کی ضرورت مزید بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کوشش کو زیادہ دوررس اور منظم وہمہ گیر کرنے کی غرض سے سردست کئی قدم اٹھائے گئے ہیں، چنانچہ اول ملک کے بڑے بڑے شہروں جیسے دہلی، ممبئی، لکھنؤ، پٹنہ وغیرہ میں سماجی موضوعات پر لکچرز کا سلسلہ شروع کرایا گیا ہے، مہینہ میں ایک دن کسی ایک موضوع پر پوری تیاری کے ساتھ کسی ایک عالم، دانشور سے لکچر دلوایا جاتا ہے تاکہ سامعین کو اسلامی قانون ونظام کی پوری واقفیت حاصل ہو جائے اور آخر میں سوالات کے ذریعہ اپنے ذہنوں کے شکوک وشبہات دور کر سکیں، یہ سلسلہ بڑا مفید ثابت ہو رہا ہے، اندازہ ہے کہ اسے مزید عام کیا جائے گا۔

دوسرے مساجد میں خطبات جمعہ سے کام لینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، جن مساجد میں

غیرعربی میں خطبہ ہوتا ہے وہاں خطبہ میں اور جہاں عربی خطبہ کا رواج ہے وہاں خطبہ سے پہلے، صرف دس منٹ سماجی موضوع پر تقریر کی جائے یا تحریر پڑھ کر سنائی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان کے علماء کرام مختلف علاقائی زبانوں میں مختلف موضوعات پر مختصر خطبات مرتب کررہے ہیں، کئی خطبات بورڈ کے مرکزی آفس کو موصول ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف مساجد کے ائمہ کرام کے پتے حاصل کئے جارہے ہیں، تاکہ جن مساجد میں خطبہ دینے والے حضرات نہ ہوں ان میں تیار خطبات بھیجے جائیں اور ائمہ مساجد انہیں پڑھ کر سنائیں، امید کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ بھی نافع ثابت ہوگا۔

موجودہ سماج میں جہالت اور اسلامی تعلیمات پر عمل سے دوری کے نتیجہ میں بعض مواقع پر خواتین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، طلاق جو بہت سوچ سمجھ کر دیا جانے والا ایک حق ہے کبھی تو جہالت میں محض معمولی باتوں پر مرد طلاق دے ڈالتا ہے اور کبھی اپنی زوجہ کو وہ لٹکائے رکھتا ہے۔ نہ منکوحہ کے ساتھ خوشگوار طریقہ پر گزر بسر کرتا ہے اور نہ ہی اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق علاحدگی اختیار کرتا ہے، ایسی مظلوم خواتین کے مسائل کا جو حل اسلام نے نظام قضاء کے ذریعہ رکھا تھا، ہندوستان میں وہ بھی علی العموم مفقود ہے، ایسی صورت میں شریعت کا بتایا ہوا ایک طریقہ تفویض طلاق کا ملتا ہے، بورڈ نے اس شرعی طریقہ اور سہولت کو نکاح نامہ اور اقرار نامہ کی شکل میں مرتب کیا ہے تاکہ حسب ضرورت اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے، توقع ہے کہ یہ نکاح نامہ بورڈ کی جانب سے جلد جاری کی جائے گی۔

انتظامی میدان:

بورڈ کے بانی اراکین کے اخلاص وحسن نیت کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے تیس کروڑ مسلمانوں کا اعتماد بورڈ کو حاصل ہے اور اس ایک آواز پر پورا ملک کھڑا ہوجاتا ہے۔ موجودہ دور کے رسل ورسائل کی ترقی اور مواصلات کی آسانی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے بورڈ کے مرکزی دفتر واقع اوکھلا گاؤں نئی دہلی کو جدید سہولیات سے آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ چنانچہ آفس میں کمپیوٹر مع لوازمات فراہم کیا گیا ہے، انٹرنیٹ پور بورڈ کا تعارف اور کارکردگی ڈالی جارہی ہے، ایک ریفرنس لائبریری قائم کرنے کی کوشش جاری ہے، لیگل سیل کا شعبہ بھی بڑے اہتمام سے کام کررہا ہے۔

اشاعتی میدان:

بورڈ نے مسلم پرسنل لا سے متعلق مختلف مسائل وموضوعات پر چھوٹے چھوٹے قیمتی کتابچے وپمفلٹ تیار اور شائع کئے تھے، ابھی بورڈ کے موجودہ صدر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نے ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ'' نامی ایک رسالہ بہت آسان زبان واسلوب میں مدلل طریقہ پر تیار کیا ہے، جسے پہلے اردو میں شائع کیا گیا، اس کتابچہ کا تمل ترجمہ کرلیا گیا ہے اور شائع ہوگیا ہے، کنڑ زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوجانے کی توقع ہے، انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کیا جارہا ہے، توقع ہے کہ جلد ہی وہ بھی شائع ہوجائے گا۔ بورڈ کے دیگر لٹریچر کو از سر نو کمپوزنگ کے بعد خوبصورت طریقہ پر دوبارہ شائع کیا جانا بھی متوقع ہے۔

یہ بورڈ کی جاری سرگرمیوں کی ایک جھلک ہے، ممکن ہے بعض اہم کاموں کا ذکر رہ گیا ہو، واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ ہندیہ کے سامنے اس وقت بڑے سخت خطرات ہیں اور ان خطرات کی لو تیز ہوتی جارہی ہے، ضرورت ہے کہ بورڈ کی قیادت ایسے حالات میں دوررس اثرات کے حامل دانشمندانہ فیصلے کرے، ملت اسلامیہ کی نگاہیں بورڈ کی جانب لگی ہیں اور بدلے حالات میں پیغام عمل کی منتظر ہیں۔

☆☆

کلیدی خطاب

ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء
اور
ہمارا اسلامی تشخص قرآن وحدیث کی روشنی میں!!!

فقیہ العصر حضرت اقدس مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

بمقام:
مسجد زرعونی دیرہ، دبئی متحدہ عرب امارات
تاریخ: 29رمئی 1986ء

حرف چند

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی
بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

الحمد للّٰہ رب العلمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد، و علی آلہ و صحبہ و علی من تبعھم باحسان و دعا بدعوتھم الی یوم الدین، و قال اللّٰہ تعالیٰ: ”لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ“ أما بعد:

ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی نشانی مغلیہ سلطنت (1526ء سے 1857ء) کے زوال کے بعد سے ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اپنی عیاری اور مکاری کے سبب ہندوستان کے اقتدار پر قابض ہونے والے انگریز کو اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس ہورہا تھا وہ مسلمانوں سے تھا، کیونکہ دیگر مذاہب کے لوگ تو اس وقت اقلیت میں تھے اور انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے بزرگوں کی بات زیادہ مانتے ہیں اور ان کے ایک حکم پر اپنی جان نچھاور کردیتے ہیں۔اس لئے مسلمان ہمیشہ گوروں کی نگاہ میں کھٹکتے رہے اور بعد میں یہ دیکھا بھی گیا کہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور جہاد کرنے کا فتویٰ دینے والے علماء کرام کوانہوں نے کس قدر اذیتیں دیں، ان پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا اس کے باوجود علماء کرام اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے

نہیں ہٹے، ان کے مظالم اور باطل نظام کے خلاف سینہ سپر رہے۔ بالآخران کی انتھک جہد مسلسل کے نتیجے میں انگریزوں کو شکست ہوئی اوران کی قربانیوں کے صدقے پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سامراجی پنجوں سے آزاد ہوا۔ مگر یہ آزادی بھی مسلمانوں کے لئے خوشیوں کا پیغام لے کرنہیں آئی، برادران وطن کی تعصب پرستی کے سبب مابعد آزادی کی تاریخ بھی انتہائی تکلیف دہ ہے۔ اس کرب اور تلخ حقیقت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام الہند مولانا ابوکلام آزاد جیسی عبقری شخصیت کو یہ کہنا پڑا تھا کہ:

کتنی بربادی مقدر میں تھی آزادی کے بعد
کیا بتائیں ہم پہ کیا گزری ہے آزادی کے بعد

آزاد ہندوستان سے قبل ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت برطانیہ کو للکارتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو وہ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب وروز اس کا درس دیتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہیں یا نہیں! اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کردے کہ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ''ان کے مذہب میں مداخلت نہیں ہوگی'' اس کے بعد مسلمانوں کے لئے نہایت آسانی ہوجائے گی کہ وہ اپنا وقت بے سود شور وفغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کرلیں۔ (مسئلہ خلافت وجزیرۂ عرب، ص:۲۰۴)

حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر اظہار خیال فرماتے

ہوئے مذہبی آزادی کے مسئلہ کی نزاکت کو دوٹوک لفظوں میں واضح فرمادیا تھا:

''میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور ضروری سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کیلئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کررہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے برخلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ کیلئے ناممکن بنادے گی اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملاکر تینوں اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔

ہاں میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشیں کرلیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں ہوسکتی کہ صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادانیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دینوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو''۔ (ج (جمعیۃ علماء کیا ہے، ص۱۳۲)

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور اس ملک کا ہر شہری اپنے اپنے مذہب پر بلا کسی مزاحمت کے عمل کرسکتا ہے۔ کسی کو کسی کی آزادی چھیننے کا حق نہیں، جیسا کہ آئین کی دفعہ ۲۵/ میں ہے کہ تمام لوگوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے، آزادی سے کسی مذہب کو قبول کرنے اور اس کی اتباع اور ترویج واشاعت کا مساوی حق آئین ہند کے مطابق حاصل ہے، لیکن سوء قسمت کہ ہندوستان میں بننے والی حکومتیں مرکزی ہو یا صوبائی چاہے وہ کانگریس کی ہو کہ بی جے پی یا دیگر علاقائی پارٹیوں کی سب مسلمانوں کے شرعی حقوق پر

شب خوں مارتی رہی ہیں۔حکومت اورانتظامیہ میں شامل انتہا پسندانہ فکر کے حامل افراداس وفاقی جمہوریت کے ڈھانچے اور دستور ودفعات کوختم کرکے ہندوراشٹر کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔اپنی اس بھگواسوچ کوعملی شکل دینے کے لئے ان کی منصوبہ بندی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔حالیہ طلاق ثلاثہ، تعدد ازدواج، حلالہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی مہم انہیں طاقتوں کی سازش کا حصہ ہے جس کیلئے موجودہ بی جے پی کی سرکار بہت جلدی میں ہے اس لئے حکومت نے کلیدی ملکی مسائل کوحل کرنے کے بجائے اپنی پوری طاقت کو مسلمانوں کے خلاف جھونک دیا ہے۔

اگرغورکریں تو پچھلے دوڈھائی برسوں کے دوران مسٹر دامودرداس نریندرمودی حکومت ایک کے بعدایک بحران سے گذررہی ہے۔دہشت گردی، سرحد پرفوجیوں کی ہلاکت، کشمیر میں بدامنی، دلتوں پرمظالم، اقلیتوں پرحملے، ہوش ربا گرانی ومہنگائی، ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اورصحت کے میدان میں ناکامی اورمعاشی اتارچڑھاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل حکومت نے اپنی ان ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اور ہندوستان میں بسنے والوں کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کی غرض سے میڈیا کے توسط سے 'طلاق ثلاثہ' کا ایشوا چھال دیا ہے اور یہ بیان دینے میں انہیں ذرہ برابرشرم وعارمحسوس نہیں ہوئی کہ وہ مسلمان خواتین کے حقوق اورسماجی انصاف کی لڑائی لڑرہے ہیں، جبکہ بھارت میں عورتوں کی جو حالت ہے اس سے متعلق آئے دن ایک سے ایک چونکادینے والے انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں۔ابھی چند دنوں قبل یہ رپورٹ آئی تھی کہ ملک کی 90 فیصدخواتین اورلڑکیاں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی طور پرجنسی ہراسانی اور چھیڑ چھاڑ کا شکار ہوتی ہیں، لیکن وہ اس کی شکایت پولیس سے نہیں کرتی ہیں اوراس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت بھی نہیں جٹاپاتی ہیں۔خواتین کے تحفظ کے بارے میں 'کیئر انڈیا' نامی ایک غیرسرکاری تنظیم کے سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ 37 فیصد شادی شدہ

خواتین اپنے شوہروں کی طرف سے جسمانی یا جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں، مگراس طرف حکومت کی توجہ قطعی نہیں ہے اسے فکر ہے تو بس مسلم عورتوں کی۔

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

اس تعلق سے مثبت بات یہ ہے کہ پوری ملت یک جٹ اور یک زباں ہوکر بلاکسی تفریق مسلک ومشرب اپنے ملک کے آئین وقوانین کا احترام کرتے ہوئے خاموش احتجاج ومظاہرے کررہی ہے۔مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ دستور ہند میں انہیں جوحقوق دیئے گئے ہیں ان سے وہ آزادی نہ چھینی جائے کیوں کہ شریعت میں مداخلت جمہوریت کے خلاف ہے، اورشریعت اسلامیہ میں کسی قسم کی مداخلت کوہم مسلمان ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔

فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کا یہ خطاب سن ۱۱؍رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۹؍مئی ۱۹۸۶ء کوزرعونی مسجد دیرہ دبئی متحدہ عرب امارات میں ہوا تھا۔حسن اتفاق کہ اس وقت بھی مشہورشاہ بانوکیس موضوع بحث بنا ہوا تھا، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا اورمسلمانوں کے اسلامی تشخص کا مسئلہ ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔حضرت قاضی صاحبؒ کا یہ خطاب دراصل اسی چیلنج کا قرآن وحدیث اورآئین ہند کی روشنی میں مکمل جواب ہے۔اللہ پاک کا احسان وشکر ہے کہ یہ کلیدی خطبہ ہمیں ایک ویڈیو کی شکل میں بروقت دستیاب ہوا۔ اللہ بہت جزاء خیر دے جمعیت تربیت اسلامی دبئی متحدہ عرب امارات کو، جنہوں نے اس تاریخی خطبہ کومحفوظ رکھا اورآج انہی کی توسط سے امت تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکا، یقیناً ان کا یہ جذبہ امت محمدیہؐ کے لئے عنداللہ وعندالناس خیر کا باعث ثابت ہوگا۔جدید حالات کے تناظر میں آپؒ کا یہ خطاب ملک کے مسلمانوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔موضوع اورحالات کی مناسبت سے اس کی جلد اشاعت ناگزیر تھی سو میں نے دوستوں سے مشورہ کے بعدفوراً ہی اس کی اشاعت کا فیصلہ کرلیا تاکہ ملت اسلامیہ کے جیالے اوربہی خواہان،

مفکرین، علماء اور دینی شعور رکھنے والے دینی بھائی زیادہ سے زیادہ افادہ واستفادہ کرسکیں۔

جزاکم اللّٰہ خیراً و خیراً کثیراً

آخری بات

الحمد اللہ ہندونیپال کی سرحد پر ملت اسلامیہ کا کارگذار ادارہ اور رشد وہدایت تعلیم و تبلیغ و دیگر باطل تحریکوں اور حق کا ترجمان جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار اپنے قیام کے اول دن سے ہی اسلام مخالف فتنوں اور شرانگیزیوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ چاہے وہ قادیانی فتنہ کا رد ہو یا مسلمانوں کے شرعی امور میں حکومت وقت کی دخل اندازی یا دیگر اصلاحی تحریکیں مثلاً تعلیمی بیداری، انسداد نشہ خوری اور سماجی ناہمواری جیسی مہمات جامعۃ کی یہ کوشش رہی ہے کہ حق کے مقابلے میں باطل قوتوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

جلد بازی کی کوشش میں یقیناً بہت سی کمی وکوتاہی کتاب میں راہ پا گئیں ہوں گی۔ اس اعتراف کے ساتھ ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ ہمارے مخلصین ومحبین ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ہماری اس مہم میں شریک ہوں گے اور اس حقیر کی کاوش کو قبول فرمائیں گے نیز بارگاہ ایزدی میں دعا فرمائیں گے کہ اللہ پاک اسے شرف قبولیت سے نوازے اور خیر امت کا ذریعہ بنائے۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں یہاں پر اپنے عزیزوں برادر گرامی مفتی محمد انصار قاسمی، مولانا محمد عقیل قاسمی، مفتی نبی حسن مظاہری، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی اور مولانا محمد آفاق قاسمی کا ذکر نہ کروں جنہوں نے املا سے لیکر کمپوزنگ اور طباعت تک میری ہر طرح سے مدد کی۔ باری تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ (آمین)

محتاج دعاء

۲۴ر محرم الحرام ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۶ر اکتوبر ۲۰۱۶ء

☆☆

مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اوّل کا مختصر تعارف

ہندوستان میں سرمائے ملت کے نگہبان، کاروان ملت کے امین و پاسبان

شیخ العرب والعجم حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیبؒ

بانی وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و مہتمم دارالعلوم دیوبند

ولدیت: شیخ الاسلام حضرت اقدس مولانا حافظ محمد احمد
بن حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند

تاریخ پیدائش: ۱۸ر رجب المرجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۷ء

تعلیم: دارالعلوم دیوبند

مدت صدارت: ۵ر ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ۷ر اپریل ۱۹۷۳ء تا
۶ر شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء

مجاز بیعت: حکیم الامت حضرت اقدس مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

مسلم پرسنل لاء بورڈ کی داغ بیل کی تاریخ:
۲۷/۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء اتحاد ملت کنونشن عروس البلاد بمبئی

تاریخ وفات: ۶ر شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء

مدفن: مزار قاسمی دیوبند

یہ قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی

بزرگان محترم! ہمیں ملانے والی چیز صرف اللہ کا نام اور اس کا مستند کلام ہے اور ہمارے دین کی واحد اساس کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللّٰہ'' ہی ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمارے اس ملی اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہم اللہ کے نام سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور اسی کے کلام کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتے ہیں، اور اللہ کے سچے رسول خاتم النبین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات کو کمالات خداوندی کا نمونہ اور اپنی دنیا وآخرت کا کامل ومکمل رہنما اور مربی یقین کرتے ہوئے انہی اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد سمجھتے ہیں۔ اسی پاک اسوہ سے ہمارے زندگی بنی ہے اور اسی سے آئندہ بنے گی اور اسی پر خاتمہ سے ہماری آخرت کی فلاح وبہبود وابستہ ہے۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں:

''لایصلح آخر ھذہ الأمة إلا بما صلح به أوله'' یعنی اس امت کا آخری حصہ بھی اسی سے صلاح وفلاح پاسکتا ہے جس سے امت کے اول حصہ نے صلاح وفلاح پائی۔

یہی وہ روشنی اور رہنمائی ہے جس نے صدیوں کے خلاء کو پر کرکے ہمیں ایمانی عزیمت عطاء کی ہے اور ہم لوگوں کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے، آج کے دن ایک جسم واحد کی طرح ایک جگہ جمع کردیا اور ایک بار پھر اپنی شریعت اور اس کے مسائل کی حفاظت کے لئے اس مقام پر کھڑے ہونے کی ہمت بخشی۔

بلاشبہ جس طرح آج کا یہ اجتماع عظیم ہے اس طرح یہ دن بھی ایک عظیم، بلکہ عظیم تر دن ہے جس میں بظاہر ایک ناممکن سی بات نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بن کر سامنے آگئی ہے اور ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا'' کا پاکیزہ منظر آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔

حضرات گرامی! ہر دور میں تاریخ کا ظہور کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے لیکن اس دور کا تاریخی ظہور یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء دانشور اور رہنما وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک نقطہ وحدت پر جمع ہیں۔ اس کی روشنی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق توحید ورسالت اور جذبہ وحدت کی جو امانت امت کو سپرد کی گئی تھی ہم اس کی حفاظت کے فریضہ کو فرض کی طرح ادا کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ بلاشبہ یہ امانت ہمیں جان ومال اور آبرو سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنے جانوں سے دستبردار ہوسکتے ہیں مگر اس ازلی اور ابدی امانت سے دست بردار نہیں ہوسکتے۔

چنانچہ 1857 کے بعد جب انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوگیا، تو ان ورثاء انبیاء نے سب سے پہلے مسلم پرسنل لا ہی کے تحفظ کی فکر کی۔

1866 میں جب دارالعلوم، دیوبند کی بنیاد پڑی، تو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ نے سب سے پہلے، ان ہی عائلی قوانین کے اجرا کی فکر کی۔ ان مقدسین سے یہ تو بعید تھا کہ وہ اسلام کے عائلی قوانین کی برقراری، اور اجراء کے لئے انگریز سے التجا کرتے، اس لئے اسی ابتدائی دور میں حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم ہی میں غیر رسمی انداز سے عہدۂ قضاء قائم کیا اور دارالعلوم کے اولین صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کو قاضی مقرر فرمایا، جس کے تحت پرسنل لا کے عائلی مسائل اور الجھے ہوئے معاملات، شرعی اصول پر طے ہونے لگے۔ انگریزوں کی طرف سے رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ مسلمان نامی لوگوں ہی کو، اس سلسلہ کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھایا گیا، بالآخر تغیر احوال سے ان کے دور کے ساتھ، اس نظام کا دور بھی ختم ہوگیا، لیکن مسلم پرسنل لا کے

تحفظ کی جو داغ بیل، ان بزرگوں نے ڈالی تھی، وہ دلوں کی زمین میں قائم ہوگئی، گواس کے خلاف کی داغ بیل بھی اسی وقت سے مسلم صورت افراد کی طرف سے پڑ چکی تھی، اس لئے مسلم پرسنل لا کے بارے میں مرضی اور علاج دونوں ہی سو برس پرانے ہیں۔

انگریزوں کے اقتدار پر نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ہندوستانیوں میں سیاسی حقوق طلبی کا داعیہ پیدا ہوا، عامۃً سیاسی جماعتوں نے سیاسی مطالبات پیش کئے، لیکن مذہبی مطالبات کو نظر انداز کر دیا، جس سے ان دینی حقوق اور بالفاظ دیگر پرسنل لا کے کالعدم ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان بدلتے ہوئے حالات میں علمائے دیوبند نے اپنے اسلاف کے نقش قدم کو سامنے رکھ کر خود اسی مسئلہ پر میمورنڈم تیار کیا، جو دس دفعات پر مشتمل تھا۔ نومبر 1917 میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند، کی سربراہی میں ایک مؤقر وفد دہلی پہنچ کر وزیر ہند سے ملا اور میمورنڈم پیش کیا، جس میں صفائی سے پہلے ہی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے جو شرعی قوانین سے متصادم ہو، وہ ہمارے لئے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

(اقتباس)

☆☆

مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر دوم کا مختصر تعارف

مفکر اسلام الامام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ولدیت: حضرت اقدس علامہ حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ

تاریخ پیدائش: ۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۵ ردسمبر ۱۹۱۳ء

تعلیم: ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند

مدت صدارت: ۲۴ رربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۸ ردسمبر ۱۹۸۳ء تا
۲۴ ررمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ ردسمبر ۱۹۹۹ء

مجاز بیعت: برکت العصر شیخ المشائخ حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

تاریخ وفات: ۲۴ ررمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ ردسمبر ۱۹۹۹ء

مدفن: دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی

”ہماری تہذیب ابراہیمیؑ ہے“

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبین و صحبہ الاجمعین و من تبعھم باحسان و دعا یدعوتھم الیٰ یوم الدین.

ہم سب مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے اس فیصلے کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ ہمارا یہ فیصلہ کسی کی کم ہمتی، مجبوری یا بیچارگی پر مبنی نہیں۔ ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم وغیر اہم نہیں ہے۔) ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانونِ شریعت اور اپنی پوری مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے۔ ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ اِس ملک کی جمہوریت اور دستور وآئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات قانونِ شریعت، احکام دین، اپنے عقائد وشعائر، اپنی زبان وتہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں، اس ملک میں رہیں۔ اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں، جیل خانہ اور قفص بن جاتا ہے۔ جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی

ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی۔ ہم یہاں زندہ وباعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ ہم اس ملک میں آزاد ہیں۔ اس کی تعمیر وترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

ماخوذ: آخری خطبہ صدارت اجلاس عام مسلم پرسنل لا بورڈ ممبئی

بتاریخ: 28/29/30/ اکتوبر 1999ء

☆☆

مسلم پرسنل لابورڈ کے صدر سوم کا مختصر تعارف

فقیہ العصر حضرت اقدس مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

قاضی القضاۃ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

ولدیت: حضرت اقدس مولانا عبدالاحد قاسمیؒ شاگرد رشید شیخ الہند حضرت اقدس مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

تاریخ پیدائش: ۲۴؍رجب المرجب ۱۳۵۵ھ مطابق ۹؍اکتوبر ۱۹۳۶ء

تعلیم: دارالعلوم دیوبند

مدت صدارت: ۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۳؍اپریل ۲۰۰۰ء تا ۲۰؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ مطابق ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء

مربی وشیخ: شیخ الاسلام حضرت اقدس مولانا سید حسین مدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

تاریخ وفات: ۲۰؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ مطابق ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء

مدفن: مہدولی، جالے، دربھنگہ

پھولوں کی سیج پر چلنے کی نہیں پھانسی کے تختے پر جانے کی ہیں!

آج ملت اسلامیہ کے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے جو نازک گھڑی آ پہنچی ہے اس میں ہندوستان کے تمام علماء ومفکرین کا اجتماع تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے واضح نقوش ان شاء اللہ مستقبل پر پڑیں گے یہ باتیں پھولوں کی سیج پر چلنے کی نہیں پھانسی کے تختے پر جانے کی ہیں، سولی پر چڑھ جانے کی ہے، مگر تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ انتشار اور نعرہ بازی کے ساتھ نہیں، منظّم اور مجتمع رہ کر ہندوستان میں یہ امت اسی طرح اپنے ملی وجود کو قائم رکھ سکتی ہے، ہندوستان کی اس سرزمین پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اسلام کی تعلیم لائے تھے۔ جلال الدین اکبر نے جب دین الٰہی لاکر شمع شریعت کو بجھانا چاہا تو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اس کی حفاظت کی۔ روس کے انقلاب کے وقت یورپ سے آئی ہوئی بادِ سموم نے مکہ کی روشنی اور چراغ کو بجھانا چاہا تو وقت کے علماء ومجتہدین نے اپنی قوت وعزیمت کے ساتھ امت اسلامیہ کے چراغ کو محفوظ رکھا آج پھر ہمارے علماء اور مجتہدین اسی جگہ پر لوٹ آئے ہیں۔ اور انشاء اللہ ملت اسلامیہ کو آئندہ بھی اللہ محفوظ رکھے گا۔

ماخوذ: اتحاد ملت کانفرنس بمبئی ۲۷/۲۸؍دسمبر ۱۹۷۲ء مطابق ۲۲/۲۳؍ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

☆☆

مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر چہارم کا مختصر تعارف

مدبر اسلام مرشد الامہ حضرت اقدس

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت الطافکم

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ولدیت: حضرت اقدس سید رشید احمد حسنیؒ

تاریخ پیدائش: ۲۶ر جمادی الاول ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

تعلیم: ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار العلوم دیوبند، حجاز مقدس

مربی واجازت حدیث:

برکت العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

مہاجر مدنی، شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

مجاز بیعت: مفکر اسلام الامام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صدارت: ۱۳ر ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۳ر جون ۲۰۰۲ء تا حال

شریعت اسلامی الٰہی قانون حیات

شریعت اسلامی الٰہی قانون حیات ہے، جو انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے اس کے آخری نبی کے ذریعہ ہم کو عطا کیا گیا ہے، اس میں فرق کرنے یا ردوبدل کرنے کا حق کسی انسان کو نہیں دیا گیا، شریعت اسلامی کے معاملہ میں حجت صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت صحیحہ اور استنباط مسائل کے مآخذ سرچشمہ ہیں، ان پر کسی ملک یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے، اور جہاں تک ہمارے اس ملک ہندوستان کا تعلق ہے جس کے تعلق سے سابق صدر بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک صدارتی خطبے میں تحریر فرمایا تھا، کہ ہمارا ملک ہندوستان شریعت کے معاملے میں اپنی پوری طرح معتبر ومنفرد علمی ودینی حیثیت بھی رکھتا ہے، عالم اسلام کی دینی وعلمی تاریخ میں اس کا اپنا ایک مقام رہا ہے، جب سارے عالم اسلام پر فکری اضمحلال وعلمی انحطاط کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، اور کوئی ایسی شخصیت وہاں نہیں پیدا ہو رہی تھی، جو متوسط علمی سطح سے بلند ہو اور کوئی مجتہدانہ فکر یا نئی علمی تحقیق پیش کر سکے، تو ہندوستان نے ایسے باکمال اور مجتہد الفکر علماء ومصنف پیدا کیے، جن کے علمی تفرد اور مجتہدانہ قابلیت کا سکہ عرب وعجم نے مان لیا، اور علمی وتدریسی حلقے عرصہ تک ان کی کتابوں اور ان کے متون کی شروح سے گونجتے رہے، ملا محمود جونپوریؒ، ملا محبّ اللہ بہاریؒ، مولانا عبد العلی بحر العلومؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبد العزیزؒ، مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نام خاص

طور پر لیے جاسکتے ہیں، پھر مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے فقیہ النفس عالم پیدا ہوئے، جو اس کام کی تکمیل کے لیے نہایت موزوں تھے، پھر اس سب کے ماسوا ہندوستان نے دینی استقامت، فکری توازن اور رسوخ فی العلم کا ایسا ثبوت دیا کہ وہ دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن گیا، اور آج بھی عرب اور قدیم اسلامی ممالک کے اہل علم واہل فکر ہندوستان کی طرف عظمت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور بہت سے مسائل میں اس سے دینی وعلمی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایسے مسئلے میں جس میں غلط تجدد، مغربی افکار واقدار سے مرعوبیت، قانون سازی میں سطحیت وعجلت صاف جھلکتی ہو، اور شرعی اصول اس کی تائید نہ کرتے ہوں، ہمارے لیے کسی بڑے سے بڑے مسلمان یا عرب ملک کا کوئی فعل یا قانون حجت نہیں بن سکتا، اگر سارا عالم اسلام کسی غلط چیز پر اتفاق کرے، اور سارے مسلمان ممالک اور وہاں کے علماء کوئی غلط فیصلہ کریں یا اپنے حدود سے تجاوز کریں، تو بھی ہم ہندوستانی مسلمان، شریعت اسلامی کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے اور خدا کے قانون کو آخری قانون سمجھتے رہنے کا پورا حق رکھتے ہیں، اور ان کو اس کی صلاحیت ان کی قرآن وحدیث میں اعلیٰ قابلیت کی بنا پر یہ حق حاصل ہے۔

حضرات! بورڈ کے ذمہ داروں نے اپنے اختیار کردہ دائرہ عمل میں متعدد مشکل مسائل کے حل کی کوشش کی، اور کامیابی حاصل کی، ان کامیاب کوششوں سے بورڈ کا وقار بڑھا، اور آئندہ بھی ایسے مسائل آئیں گے، کیوں کہ حالات میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، حالات یکساں نہیں رہتے، اور نئے مسائل بھی ابھرتے ہیں، اس لیے بورڈ کو برابر فکر میں رہنا ہے، اخلاص اور حق پسندی کے ساتھ کام کئے جاتے رہنے سے انشاء اللہ کامیابی حاصل ہوتی رہے گی، ہمارا یہ اجلاس حالات حاضرہ کے تناظر میں اپنا پروگرام طے کرے گا، اور انشاء اللہ

اس پر بخوبی عمل کیا جائے گا، تمام ارکان بورڈ سے ملت کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے پورے تعاون کے ملنے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ کی جانے والی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ ہی ہماری اصل طاقت ہے، اروو ہی ہماری کامیابی کی کلید ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

☆☆

کلیدی خطاب

الحمدلله ، الحمد لله نحمده و نستعينه و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرورانفسنا و من سيّات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا الٰه الا الله وحده لا شريک له و نشهد ان سيدنا و نبينا و مولانا محمدا عبده و رسوله صلى الله عليه وسلم تسليما كثيرا كثيرا.

اما بعد. فاعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم. بسم الله الرحمٰن الرحيم. فلا و ربک لايؤمنون حتىٰ يحكموک فيما شجر بينهم ثم لايجدوا فى انفسهم حرجاً مما قضيت و يسلموا تسليما. (القرآن الكريم، سورة النساء .پ.5 ، آیت: 65)

ايها الاخوان امن لم يشكر الناس لم يشكر الله، اولا اشكر شكرا جزيلا لهذه للدولة الاسلامية ولوزارة الاوقاف والشّون الاسلامية لهذه المملكة التى منحت لنا ان نجتمع على الخير علىٰ الدعوة والاسلامية على ان نبلغ ما امرنا البنى صله الله عليه وسلم وما امرنا الله تعالىٰ فى كنابه المجيد و حذه حفلة سعيدة و حذه لجنة مباركة فى شهر مبارک و نحن فى رمضان شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن فان شاء الله نتكلم و نخاطبكم بلغة الاردويه التى تفهمنا فان كانت حاجة و بعد اخوننا

يترجمها الى اللغة الاخرى التى تفهمنا و لكن قبل ان نبدا فى خطابنا علينا ان نشكر هذه الدولة و هذه الوزارة شكرا جزيلا جزاهم الله تعالىٰ عنا و عن جميع المسلمين.

برادران اسلام!

اس وقت جو مسئلہ خاص کر ہندوستان میں بہت زبردست طریقے پر زیر بحث رہا ہے اور جس نے ایک انٹرنیشنل مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے، وہ ہے ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ The Problem of Muslim Prasonal law in India مسلمانوں کے لئے فکر (Anxiety) اور تشویش کا باعث بنا رہا، اس مسئلے کا تعلق ہندوستان میں اسلام کی بقاء اور وجود سے ہے مسلمانوں کے Excitant سے ہے، مسلم امہ کے Identity سے ہے، مسلم امہ کی تشخص سے ہے، اس کی پہچان سے ہے۔ بزرگان محترم! مسلم پرسنل لاء کیا ہے؟ اور مسلم پرسنل لاء کی اسلامی نقطۂ نظر سے کیا اہمیت ہے؟ اور مسلم پرسنل لاء کو بدلنے کی کیا کوششیں ہندوستان میں کی گئی اور اس کے مقابلے میں ملت اسلامیہ نے کیا کیا؟ اور آج جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اس کے بعد ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ یہ چند مسائل ہیں جن کو ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں رہے پورے شعور کے ساتھ جاننا چاہئے، اگر امت اسلامیہ کا ملی شعور بیدار نہیں ہوتا، اگر ان کا احساس نہیں جاگتا، اگر وہ زندگی کے ان مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں اگر وہ اپنی روزی روٹی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں تو لوگو! سن لو۔

"فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيْمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰه غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْن." (آیت .97 پارہ.4 .آل عمران)

(اس میں نشانیاں ہیں ظاہر جیسے مقام ابراہیم اور جو اس کے اندر آیا اس کو امن ملا اور

اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی اور نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔)

اللہ کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر صرف روٹی کھانے میں خوش ہو، اچھا کپڑا پہن کر خوش ہو، عمدہ بلڈنگیں بنا کر خوش ہو تو ہوا کرو۔

"یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ مَن یَرْتَدَّ مِنکُمْ عَن دِیْنِهِ فَسَوْفَ یَأْتِیْ اللّهُ بِقَوْمٍ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ أَعِزَّةٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاهِدُونَ فِیْ سَبِیْلِ اللّهِ وَلاَ یَخَافُونَ لَوْمَةَ لآئِمٍ ذَلِکَ فَضْلُ اللّهِ یُؤْتِیْهِ مَن یَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِیْم." (پارہ .6. سورہ مائدہ. آیت .54.

(اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اسکو چاہتے ہیں نرم دل ہیں مسلمانوں پر زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے اور اللہ کشایش والا ہے خبردار۔)

اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا، جو اللہ سے محبت کرے گا۔ اللہ اس سے محبت کرے گا، جو اللہ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کرے گا۔ بس مسئلہ اسلام کی حفاظت کا نہیں ہے، مسئلہ تمہاری حفاظت کا ہے، تم ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ جانور کی حیثیت سے اگر جینا چاہتے ہو کہ ہمارے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے تو جیو! لیکن اگر تم غلامانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہرست میں اپنا نام لکھا کر مدنی آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ مضبوط کر کے زندہ رہنا چاہتے ہو تو تم کو اپنی شریعت کے ساتھ جینا ہوگا، اپنے دین کے ساتھ جینا ہوگا، ان خصوصیات کے ساتھ جینا ہوگا جو خصوصیات عنایت فرمائی ہیں حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

سوتے رہے تھے تو اب جاگو۔ نیند آرہی تھی تو آنکھیں کھولو، غفلت تھی تو اس کو دور کرو،

آؤ اور فیصلہ کرو کہ آج جو ہمارے دین پر خطرہ ہے وہ خطرہ دین کی وجہ سے نہیں ہماری وجہ سے ہے، ہماری غفلت کی وجہ سے ہے، ہماری بے حسی کی وجہ سے ہے، ہمارے اللہ کے دین سے فرار کی وجہ سے ہے۔

یاد رکھو دوستو!

لفظ سنت سنا ہوگا تم نے، سنت کیا ہے؟ "الطریقة المسلوکة فی الدین" وہ راستہ جس پر چلے ہیں حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہی تو سنت ہے اور لوگو یاد رکھو اچھی طرح! دنیا میں کہنے والوں نے بڑے خوبصورت نعرے لگائے ہیں اور آج بھی وہ خوبصورت نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ تم سے یہ کہہ سکتے ہیں "کفانا کتاب اللہ" اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ بیشک اللہ کی کتاب کافی ہے، لیکن کتاب الٰہی نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ تمہاری نجات کا اور کتاب الٰہی پر عمل کا راستہ وہی صحیح ہے جو راستہ حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

بزرگو! قرآن کہتا ہے:

"یَا أَهْلَ الْکِتَابِ قَدْ جَاءکُمْ رَسُولُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْراً مِّمَّا کُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْکِتَابِ وَیَعْفُو عَن کَثِیْرٍ قَدْ جَاءکُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَکِتَابٌ مُّبِیْن" (پارہ.6.سورہ مائدہ. آیت .15)

(اے کتاب والو تحقیق آیا ہے تمہارے پاس ہمارا ظاہر کرتا ہے تو پر بہت سی چیزیں جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے اور درگذر کرتا ہے بہت چیزوں سے بیشک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔)

یہ نور کیا ہے؟ اور یہ کتاب مبین کیا ہے؟ لوگ کہیں یہ آپ سے اللہ کی کتاب میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، ہمیں کسی اور کو دیکھنے اور سننے کی ضرورت نہیں ہے، آپ ان سے یہ کہئے کہ ہماری آنکھیں دیکھنے کے لئے بنی ہیں، آنکھیں دیکھتی ہیں کسی چیز کو، کوئی یہ پوچھے کہ آنکھیں

کیوں ہیں؟ کہو گے دیکھنے کے لئے ہے، لیکن اگر کوئی تمام روشنیاں بجھادے، چھوٹے سے چھوٹا بلب بجھادے، کوئی قمقمہ روشن نہ رہے، کوئی جگنو بھی چمک نہ دکھائے، اندھیری رات کے اندھیرے کمرے میں بغیر کسی روشنی کے دو کتاب اس آنکھ سے پڑھ کر سناؤ، میں کہوں گا کہ میں اندھیرے میں کیسے پڑھوں، آپ کہئے گا کہ آنکھ موجود ہے کیوں نہیں پڑھ سکتے ہو، اس کو سمجھانا ہوگا کہ میاں یہ آنکھیں جس نے بنائی ہیں اس نے ان آنکھوں کے ساتھ ایک شرط بھی لگادی ہے، یہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں بیشک، لیکن اندر کی آنکھ باہر کی روشنی کے ساتھ دیکھتی ہے، اندر کی آنکھ کی روشنی جب باہر کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے تب دیکھتی ہیں۔

میرے بزرگو!

وہ سورج کی چمک ہو، وہ چاند کی روشنی ہو، وہ بلب کی روشنی ہو، وہ لالٹین اور چراغ اور بڑھیا کا ایک دیا کیوں نہ ہو؟ لیکن کوئی باہر کی روشنی چاہئے تب یہ اندر کی آنکھ دیکھ پاتی ہے، اسی طرح دوستو! اللہ کی کتاب کھلی ہوئی اور واضح کتاب ہے، ہدایت کی آنکھ ہے یہ، لیکن اس کو ہدایت کا سورج بھی چاہئے اور وہ ہے حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پس اگر اللہ کی کتاب سے راستہ دیکھنا چاہتے ہو تو کسب نور کرنا پڑے گا سراج منیر سے اور وہ ہیں حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

”یَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ“(پارہ.6.سورہ مائدہ. آیت .15)

(اے کتاب والو تحقیق آیا ہے تمہارے پاس ہمارا ظاہر کرتا ہے تو پر بہت سی چیزیں جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے اور درگذر کرتا ہے بہت چیزوں سے بیشک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔)

اللہ کی طرف سے تمہیں نور بھی ملا ہے، روشنی بھی ملی ہے اور کتاب مبین بھی ملی۔

”یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً (45)وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُّنِيراً.(پارہ.22.سورہ احزاب .“(پارہ.22. سورہ احزاب. آیت.46-45)

ترجمہ: (اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اسکے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ۔)

وہ روشن سورج اور روشن چراغ کون ہے؟ حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اے میرے بزرگو!

اسی لئے کہہ دیا گیا کہ لوگو! اللہ کی محبت چاہتے ہو، اے لوگو! اللہ کی محبت چاہنے والو! ہر عاشق یہ چاہتا ہے کہ محبوب مجھ سے محبت کرنے لگے، بس اے اللہ سے محبت رکھنے والو! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے اور اگر یہ چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو پھر اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ پیروی کرو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، بس اے اللہ سے محبت کرنے والو! اگر اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اتباع کرو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی:

”قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“(پارہ.3.سورہ آل عمران. آیت.31)

(تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

کہہ دیجئے لوگوں سے اگر یہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، تو یہ پیروی کریں میری یعنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، کیا ہوگا اس سے؟ یحببکم اللہ۔ تم سے اللہ بھی محبت کرنے لگے گا۔ پس لوگو! اللہ کی محبوبیت کا راستہ اتباع ہے۔ حضور اقدس جناب محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سنو! فرمایا گیا: **اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول**. کہنا مانو اللہ کا اور کہنا مانو رسول کا اور یہ بھی کہہ دیا گیا۔ **من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ**. جو رسول کا کہنا مانے گا، اس کو اللہ کا مطیع وفرمانبردار مانا جائے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور حضور کی اتباع اور پیروی میں دراصل اطاعت ہے اللہ کی۔ اے لوگو! اتباع کے معنی کیا ہیں؟ اتباع کے معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا، دبئی کے اس نئے شہر میں، میں پہلی بار آیا ہوں، راستے نہیں جانتا، گلیاں نہیں جانتا، اندھیری رات ہے، بارش ہو رہی ہے چاروں طرف پھسلن ہے اگر میں من مانی کروں گا تو کسی نہ کسی گڑھے میں گروں گا اور اگر آگے چلنے والے کسی جانکار کے قدم بقدم چلوں گا تو منزل تک پہنچوں گا۔

لوگو! ہدایت کی دنیا کے ہر پیچ وخم کو جاننے والے ہیں آقا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، بس ان کے نقش قدم پر چلنا یہی دراصل ہمارے لئے نجات کا راستہ ہے اور ہمارے لئے سلامتی کا راستہ ہے۔

میرے بزرگو!

پس ضروری بات یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کا بہترین راستہ یہ ہے کہ تم اتباع کرو۔ حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب نہیں بھیج دی ہے، کتاب کے ساتھ کتاب کا معلم اور استاذ بھی بھیجا ہے۔ پس لوگو! اللہ کتاب پڑھو اور کتاب پڑھو معلم کی اور استاذ کی، ہدایتوں کی روشنی میں پڑھو، ان شاء اللہ راہ پا جاؤ گے۔

بزرگان محترم! آج جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا کون سا ترجمہ مانا جائے گا؟ قرآن کی کس آیت کا کیا مطلب مانا جائے گا؟ قرآن کی کس آیت کا کیا مفہوم مانا جائے گا؟ ہم یہ جانتے ہیں کہ جو مفہوم جناب محمد رسول اللہ صلیہ اللہ علیہ وسلم نے بتایا، ہمارے آقا نے بتایا بس وہی مفہوم صحیح مانا جائے گا، اگر آج دنیا کے لوگ اپنے عقلی گدّے

دوڑا کر اس معنیٰ کو پلٹ دینا چاہتے ہیں جو معنیٰ اقدس جناب رسول اللہ صلیہ اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں، ان کے صحابہ نے ان سے پڑھ کر سمجھے ہیں، تابعین نے ان سے سند حاصل کیا ہے، تو یہ راستہ گمراہی کا ہوگا، معلم ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات مانی جائے گی۔ اب سنو! اس دور کا ایک نیا مجتہد پیدا ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ قرآن میں ہے: **اقیموا الصلوٰۃ**. نماز قائم کرو اور **الصلوٰۃ الوسطیٰ**. اور بیچ والی نماز کو قائم کرو، آج کا نیا مجتہد اٹھ کر ہم سے کہتا ہے کہ بیچ والی نماز سے مراد سینٹرل گورنمنٹ ہے اور صلوٰۃ سے مراد اسٹیٹ گورنمنٹ ہے، بس قائم کرو، ریاستوں میں تم حکومت اور قائم کرو تم سینٹرل گورنمنٹ۔ اب بتائیے کہ قرآن کی یہ تعبیر ہم تسلیم کریں یا صلوٰۃ کا وہ معنی قبول کریں، جو اس مسجد میں پڑھا جاتا ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا: **صلوا کما رأیتمونی اصلی**. جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھو، بس نماز کی تفسیر وہ معتبر ہوگی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھادی، وہ معتبر نہیں ہوگی جو آج کا بزعم خود مجتہد پڑھ کر بتادے، اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ باقی رہیں گے اور قرآن کی حقیقت ہم گم کردیں گے۔

اے لوگو!

یہ ہے خطرے کی بات، آج مسئلہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء یہ آخری پونجی ہے جو ہندوستان میں ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد جو عہد مغلیہ سے اسلامی قانون ہندوستان میں رائج تھے ان کو آہستہ آہستہ انگریزوں نے ختم کردیا (Contrect law) معاہدات کا قانون، لین دین کا قانون، گواہی کا قانون، جرائم پر سزا اور تعزیرات کا قانون، جتنے قانون تھے سب بدل ڈالے، چھوڑ دیا بس ایک چھوٹی سی چیز یعنی ہماری معاشرت یعنی ہمارے میاں بیوی کے رشتے، ہمارے باپ بیٹے کے رشتے، ہمارے ترکے کا بٹوارہ، نکاح کس عورت سے حلال ہوگا کس سے حلال نہیں ہوگا، وراثت

کس طرح تقسیم ہوگی، وصیت کونسی مانی جائے گی، نہیں مانی جائے گی، ہبہ کونسا مانا جائے گا، نہیں مانا جائے گا، حق شفعہ کس کو اور کب حاصل ہوگا، کس بچے کا کون گارجین ہوگا، نہیں ہوگا، کس بچے کی پرورش کس کے پاس ہوگی اور کس کے پاس نہیں ہوگی۔

لوگو! یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی آپسی زندگی سے ہے، انگریزوں کے زمانے میں اس قانون کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ چار بار رائل کمیشن بیٹھی، حکومت برطانیہ نے رائل کمیشن بیٹھائی، انھوں نے کافی تحقیق کے بعد جو فیصلہ دیا وہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ پرسنل لاء میں مداخلت نہیں کرسکتی۔ پرسنل لاء نہیں بدلا جاسکتا، اس لئے کہ پرسنل لاء کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے اتنا گہرا ہے کہ اگر اس کو بدل دیا گیا تو ان کے مذہب میں Interfere ہوگا، مداخلت ہوگی، اس لئے اس میں تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ اصولی طور پر آج تک یہ بات قائم اور موجود ہے کہ مسلمانوں پر ان معاملات میں شریعت اسلامی جاری ہوتی ہے۔ آج یہ مسئلہ وہاں درپیش ہے کہ ہندوستان میں یونیفارم سول کوڈ نہ جاری ہو، یعنی وہاں کے بسنے والے مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں، بدھوں اور جینیوں، ہر مذہب کے ماننے والوں کو شادی، بیاہ، طلاق، وراثت، وصیت، ہبہ، شفعہ وغیرہ ان معاملات میں ایک ہی طرح کا قانون ان پر بنا کر جاری کردیا جائے، یا ان کا جو الگ الگ مذہبی قانون ہیں وہ باقی رہے ایک بڑی قوت یہ چاہتی ہے کہ منظم طاقت ملک میں کہ ہر قیمت پر مسلمانوں کا پرسنل لاء ان کا خصوصی قانون، ان کا اسپیشل لاء ختم ہونا چاہئے اور ہندستان کے مسلمانوں پر بجائے قرآنی قانون کے قرآن کی آیت: یوصیکم اللہ کے بجائے، دوسری آیات کے بجائے مسلمانوں پر بھی پارلیمنٹ ایک ایسا عام قانون بنا کر جاری کردے جو ہندوؤں پر ہے اور دوسروں پر ہے یہ عام قانون کیسا ہوگا؟ جس کا ڈھانچہ مُتبنیٰ بِل سے معلوم ہوتا ہے۔ Adoption مُتبنیٰ، آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں کے یہاں معتبر ہے، ہندو عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر اولاد کے مرجاتا ہے تو وہ نرک میں جاتا

ہے، جہنم میں جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنی زندگی میں کسی نہ کسی لڑکے کو گود لے لینا ہے، جو مرنے کے بعد اس کے منہ میں آگ ڈالے گا۔ اپنے اس مذہبی عقیدے یا Costume اور رواج کے مطابق وہ بچوں کو گود لیتے ہیں اور وہ بچہ ان کا اصلی بیٹا شمار کیا جاتا ہے اور وہ Adoption Legal effect. رہتا ہے، قانونی اثر رکھتا ہے، کیا کیا اثر پڑتا ہے۔

دوستو سنئے! اصلی بیٹا شمار ہوا، لہٰذا جو بیٹے کو ترکہ میں حصہ ملتا وہ اس کو ملے گا، جس نے گود لیا ہے اور اس کی بیوی اس کی اصلی ماں شمار ہوگی، محرم ہوگئی، اس کی بیٹی اس کی اصلی بہن شمار ہوگئی، محرم ہوگی، نکاح اس کی بیٹی سے حرام ہوگا، چونکہ اس کی اصلی بہن مانی گئی۔

اب آؤ اسلام میں! اسلام میں اس واقعہ کا ایک تاریخی پس منظر ہے، مکہ کے کفار کا بھی یہی قانون تھا، اگر کوئی کسی کو گود لے لے تو اس کا اصلی بیٹا، ہر بات میں وہ بیٹا ہی شمار ہوتا تھا، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حضرت زید ابن حارثہؓ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اب وہ زید ابن محمد کہلاتے تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا سورہ احزاب اٹھا کہ دیکھو کہ وہ تمہارے بیٹے نہیں ہیں:

”ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً.“ (پارہ.21. سورہ احزاب. آیت.5)

(پکارو لے پالکوں کو انکے باپ کی طرف نسبت کرکے یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں پھر اگر نہ جانتے ہو انکے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ پر وہ جو دل سے ارادہ کرو اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔)

جن کے بیٹے ہیں ان ہی کے نام سے ان کو پکارو، اس لئے زید ابن محمد نہیں زید ابن حارثہ کہنا چاہئے اور جب وہ اصلی بیٹا نہیں ہوا تو اس کی بیوی کے لئے تم، اس کی بیوی سے تمہارے درمیان محرومیت کا رشتہ بھی نہیں رہا، لہٰذا زید ابن حارثہ کی شادی حضور نے اپنی

پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کرایا تھا اور جب حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نہیں نبھی اور انھوں نے طلاق دیدی تو اللہ تعالیٰ نے کہا: زوجنٰکھا. اے رسول ہم نے آپ کا نکاح زینب سے کر دیا، کیوں کر دیا؟ تاکہ دنیا جان لے کہ Adoption اور مُتبنّیٰ بنا لینے سے کوئی اصلی بیٹا نہیں ہوتا اور اس کی بیوی حرام نہیں ہوتی، اب قرآن کریم کی ان صریح تعلیمات کے خلاف اگر ہم مسلمانوں پر بھی ایسا قانون جاری کیا جائے تو ہمارے لئے دو راستے رہ جاتے ہیں اپنی ذاتی زندگی میں، ہم ذاتی زندگی میں، ہم اپنے ذاتی معاملات میں اللہ کی، اللہ کے فیصلے اور ان کے قانون سے بغاوت کر کے ہم پارلیمنٹ کے حکم کی پابندی کریں، یہ ہے وہ ڈھانچہ جو ہمارے وزیر قانون گوکھرے صاحب نے کہا ہم یونیفارم سول کوڈ کی طرف پہلا قدم اٹھا رہے ہیں۔

میرے بزرگو! اسی طرح کئی قوانین INDIRECT بالواسطہ مداخلت کی کوششیں کی گئی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس کا مقابلہ کیا ابھی جو قانون ہمارے پاس ہے وہ قانون شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب اگر ان کو بدل کر پارلیمنٹ ایک نیا قانون بناتی ہے تو وہ قانون قرآن کے خلاف ہوگا۔ دیکھو جہاں پر قانون وراثت ہے قرآن شریف میں:

''یُوصِیکُمُ اللّهُ فِیْ أَوْلاَدِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنثَیَیْنِ فَإِن کُنَّ نِسَاء فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَإِن کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلأَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ إِن کَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ یَکُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن کَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُوصِی بِهَا أَوْ دَیْنٍ آبَآؤُکُمْ وَأَبناؤُکُمْ لاَ تَدْرُونَ أَیُّهُمْ أَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعاً فَرِیضَةً مِّنَ اللّهِ إِنَّ اللّهَ کَانَ عَلِیْما حَکِیْما .''(پارہ.4. سورہ نساء. آیت.11)

(حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں

کے پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کے لئے ہے دو تہائی اس مال سے جو چھوڑ مرا، اور اگر ایک ہی ہو تو اسکے لئے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کے لئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اسکے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی پھر اگر میت کے لئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ بعد وصیت کے جو کر مرا یا بعد ادائے قرض کے تمہارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے بیشک اللہ خبردار ہے حکمت والا۔)

جب اللہ تعالیٰ نے سارا قانون بتادیا لڑکی کا اتنا حصہ، لڑکے کا اتنا حصہ، شوہر کا اتنا، بیوی کا اتنا اور بہن کا اتنا، ماں کا اتنا، باپ کا اتنا، سارا قانون جب بیان کر دیا چوتھے پارہ میں اللہ تعالیٰ نے تو آخر میں کہا:

''تِلْکَ حُدُودُ اللّهِ وَمَن یُطِعِ اللّهَ وَرَسُولَهُ یُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِیْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا وَذَلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (13)وَمَن یَعْصِ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَیَتَعَدَّ حُدُودَهُ یُدْخِلْهُ نَاراً خَالِداً فِیْهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِیْن .''(پارہ.4. سورہ نساء. آیت.14-13)

(یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اسکو داخل کریگا جنتیوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی ہے بڑی مراد ملنی اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جاوے اس کی حدوں سے ڈالیگا اس کو آگ میں ہمیشہ رہیگا اس میں اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔)

یہ ہیں اللہ کی سرحدیں یہ باڑ رہیں: فلاتعتدوھا. اس کو کراس مت کرنا اور آگے کہا گیا: ومن یطع اللہ. جو اللہ، رسول کی بات مانے گا، ٹھیک: ومن یعص اللہ و رسولہ و یتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیھا. اے لوگو یاد کرلو! جس نے اللہ کی بات اور

رسول کی بات نہیں مانی اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان سرحدوں کو پار کرلیا، اللہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اب سوچو! اس بات کو اگر وراثت کی تقسیم، اگر ترکہ کا بٹوارہ خدائی قانون کے مطابق ہم نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لئے جہنم کا دروازہ کھلا ہوا پاتے ہیں۔

بزرگان محترم! مسلم پرسنل لاء دراصل ہمارے اسلامی تشخص کی بنیاد ہے، مسلم پرسنل لاء کے قانون کو بدلنے کا مطلب دراصل مسلمانوں کو قرآن سے منحرف کرنا ہے۔ اسلام کے لئے ایک بحیثیت مسلمان ہمارے لئے یہ صورت حال کسی قیمت پر گوارہ نہیں، ہم نے بہت کچھ کھویا ہے، ہم جانتے ہیں کچھ مجبوریاں ہماری ہیں، لیکن جواب ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اسے کھونے کو تیار نہیں ہیں، یہی وہ بات تھی لوگو! جو شاہ بانو کیس میں جسٹس وائی بی چندر چو کے فیصلے میں کہی گئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر یونیفارم سول کوڈ جاری ہونا چاہئے۔ اس فیصلے میں یہ بات کہی گئی کہ اسلام نے عورتوں کا درجہ گرادیا ہے، کتنے بڑے مضحکہ کی بات ہے، ساری دنیا میں جب عورت ذلیل تھی، ساری دنیا میں عورت کو انسان نہیں مانا جاتا تھا، ساری دنیا میں عورت کو کھیل اور تماشہ جانا جاتا تھا اور آج کا یورپ بھی عورت کو اپنی لذت نفس کی تکمیل کے لئے، عورت کی آزادی کے جھوٹے نعرے کے ساتھ اس کو سڑک پر ننگا نچوا کر خوش ہے۔ عورت بہت خوش ہے کہ مجھے آزادی ملی، لیکن آزادی کے اس نعرے کے ساتھ عورت کی آنکھوں کی حیا اتری، عورت کی عصمت کا لباس اترا، عورت کی عزت وآبرو نکلی، عورت خواہش نفس کی تکمیل کا ایک سامان، ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ یوروپ کی سڑکوں پر ناچتی پھر رہی ہے، اسلام نے کہا تھا کہ کما کر کھلانا مردوں کی ذمہ داری ہے، تم نے آج ان سڑکوں پر ٹریفک پولس بنا کر کھڑا کردیا، تم نے آج ان کو فیکٹریز میں چھلسا دینے والی آگ کے بیچ کھڑا کردیا، اللہ کے اس نازک مخلوق کو تم نے کمانے کا پورا بوجھ عورتوں پر ڈال دیا، تم نے کہا کہ عورت کو ہم نے آزادی دی ہے؟ یہ آزادی ہے دوستو؟

عورت کی شرم وحیا چھین کر، عورت کی عزت وآبرو برباد کر کے، عورت کا قیمتی موتی توڑ کر، تم نے عورت کو بے عزت کر کے سڑکوں پر گھمادیا اور کہا کہ ہم نے عورت کو آزادی دی ہے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **انھن قواریرا**. عورتیں شیشوں کی طرح نازک ہیں، آپ نے فرمایا تھا، قرآن نے کہا: **عاشروھن بالمعروف** . تم نے عورت کو صرف بیوی جانا، تم فرائڈ کے امتی ہو نہ؟ تم نے عورت کے ہر رشتے کو جنسی رشتہ سمجھا مگر (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) ہمارے رسول نے فرمایا عورت ماں بھی ہے، جس کے پیروں تلے جنت ہے، عورت بہن ہے اور عورت بیوی ہے، عورت کی عزت دسیوں طرح قائم کی گئی ہیں، اس کو وراثت میں حصہ دار بنایا گیا، اعمال میں اس کو آزادی دی گئی اس کو Property Rights دیا گیا اس کو جملہ انسانی حقوق دیئے گئے، اس کو بعد کہتا ہے۔ Bitter Point of Islam is Degradation of Women یعنی عورت کا درجہ گرانا اسلام کا تلخ پہلو ہے، ایسا کہنا انتہائی بدقسمتی کی بات ہے، جن لوگوں نے اسلام کو پڑھا نہیں، اسلام کو سمجھا نہیں، یا تو ناسمجھی سے یہ بات کہہ رہے ہیں یا بددیانتی سے یہ بات کہہ رہے ہیں، ایک Judgment میں یہ بات کہی گئی کہ قرآن کی آیت کی تعبیر جج صاحب کریں گے، قرآن کی آیت کا معنی جج صاحب بتائیں گے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ حضور اقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہیں قرآن کے چندر چو صاحب آپ معلم نہیں ہیں، بھگوتی صاحب آپ استاد نہیں ہیں آپ کی تفسیر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، آپ قرآن میں تحریف کرنا چاہتے ہیں، ہندوستان کا مسلمان جب تک زندہ ہے اپنے آخری قطرہ خون تک وہ قرآن کی تحریف کو گوارہ نہیں کرسکتا۔

لوگو! اس طرح ایک بہت بڑا اس مسئلہ ملک میں کھڑا ہوگیا ہے، بلاشبہ ابھی 125 کے تعلق سے نفقہ مطلقہ کا قانون پاس ہوگیا، یہ خوشی کی بات ہے اس کے پیچھے یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے یہ بات آج بھی ظاہر ہوئی کہ عورتوں کے حقوق کی صحیح حفاظت کا راستہ وہ نہیں ہے

جوسرکار نے ایک سوپچیس میں اختیار کیا تھا، بلکہ وہ ہے جو اس بل میں پیش کیا گیا ہے، وہ عوررت جس کا شوہر اسے طلاق دے چکا ہے اور اس کی کیفیت اور پوزیشن یہ ہے کہ وہ غریب ہے تمہارا ایک سوپچیس اس کی کوئی مدد نہیں کرتا، تم اس مطلقہ عورت کو واقعی Foot Path پر پھینک دیتے ہو، اسلام یہ کہتا ہے، آقائے دوعالم حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، لوگو! کوئی اگر مرجائے، جائیداد، اور ترکہ اور مال اور دولت چھوڑ کر، اسے اس کے وارثوں میں بانٹ دو اور اگر کوئی ایسی اولاد چھوڑ کر مرجائے جس کو کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو میرے پاس لے آؤ جس کا کوئی ولی اور گارجین نہیں ہے۔ اس کا ولی میں ہوں (صلی اللہ علی سیدنا) اس طرح ہر وہ شخص جس کا کوئی قانونی ولی موجود نہ ہو، جس کی کوئی کفالت کرنے والا موجود نہ ہو، جس کا کوئی سرپرست موجود نہ ہو اس کے سرپرست ہیں حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضور کے پردہ فرما جانے کے بعد اس امت پر ذمہ داری آتی ہے۔ کوئی بھی بے سہارا عورت ہو یا مرد، بچے ہوں یا بڑے، مجبور کی کفالت کرنا، اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر لڑکا نابالغ ہے یا لڑکی نابالغ ہے اس کے باپ پر ذمہ داری ہے۔ لڑکا بالغ ہوجائے تو لڑکا بالغ ہونے کے بعد ہی باپ کی ذمہ داری سے نکل جاتا ہے، باپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن بیٹی اگر چہ کمانے کے لائق ہو پھر بھی بیٹی کی ذمہ داری باپ پر رہتی ہے۔ یہ ہے اسلامی قانون، بیٹا اگر معذور ہے، مفلوج ہے، کام کرنے کے لائق نہیں ہے تب تو اس کی ذمہ داری باپ پر آئے گی، لیکن بیٹی کی ذمہ داری چاہے وہ کمانے کے لائق کیوں نہ ہو، جب بھی باپ پر اس کی ذمہ داری آئے گی۔ شادی ہونے کے بعد شوہر پر اس کی ذمہ داری ہے:

"الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاء بِمَا فَضَّلَ اللّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّهُ وَاللاَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلاَ تَبْغُواْ عَلَيْهِنَّ سَبِيلاً إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيّاً كَبِيراً ."
(پارہ.5.سورہ نساء . آیت.34)

(مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے خرچ کئے انہوں نے اپنے مال پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بیشک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا۔)

اور اگر خدانخواستہ یہ عورت بیوہ ہو جاتی ہے یا اسے طلاق ہوجاتی ہے تو اگر اس کا جوان بیٹا موجود ہے کمانے والا، جیسے شاہ بانو کے بیٹے موجود ہیں، ان کے اوپر ذمہ داری آتی ہے۔ تم نے اپنی ذمہ داری کو پھینکنے کے لئے مقدمہ کیا تھا۔ اپنے باپ سے اپنے ذاتی جھگڑوں کا بدلہ لینے کے لئے یہ مقدمہ کیا تھا اور اگر بیٹا موجود نہ ہو، باپ ہو تو باپ کی طرف لوٹائی جائے گی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا بہترین، تمہارے ماں کا خرچ: ابنتک المرأة الیک. اس کا بہترین مصرف وہ لڑکی ہے جو نکاح کے بعد اپنے شوہر کے گھر سے بوجہ بیوہ ہونے کے یا بوجہ طلاق کے تمہاری طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم دی ہے ہمیں۔ دوسرے قانون میں مجبوری ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کے قانون میں کنیا دان ہوتا ہے، ان کے یہاں لڑکی شادی کے بعد اپنے ماں باپ سے، اس کا کوئی رشتہ نہیں رہتا ہے، لیکن اسلام میں سو فیصد رشتہ باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شوہر اپنی بیوی کو اپنے باپ کے گھر جانے سے روک نہیں سکتا، اس لئے کہ صلہ رحمی واجب ہے اگر آپ کی بیوی اپنے باپ سے ملنے جانا چاہے مہینے میں ایک دو بار تو آپ اس کو روک نہیں سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صلہ رحمی واجب ہے، اپنے باپ کی خدمت کے لئے اسے جانا ہوگا۔ باپ کو دیکھنے کے لئے، باپ سے ملنے کے لئے جانا ہوگا، آپ اس کو روک نہیں سکتے۔ اسلام نے

بہت بڑا حق دیا ہے۔

بس دوستو! اسلام میں عورت کا رشتہ شادی کے بعد بھی اپنے سابق فیملی سے برقرار رہتا ہے، عورت اگر مالدار ہو، دولت مند ہو تو آپ اس کے حصے میں وارث ہوں گے، باپ بھائی وارث ہوں گے، چچا وارث ہوسکتا ہے، چچازاد بھائی وارث ہوسکتا ہے۔ ہر وہ شخص جو وارث ہوسکتا ہے اس کا اور اگر عورت دولت مند ہو غریب ہو اور اس کی وجہ سے محتاج ہو تو اس کا Maintenance اور اس کی کفالت واجب ہوگی۔ دولت کی شکل میں اگر آپ حصہ لینے جاسکتے ہیں تو محتاجی کی شکل میں اس کی ذمہ داری بھی آپ کو نبھانی ہوگی یہ ہے اسلام کا قانون دوستو!۔ **وعلی الوارث مثل ذٰلک**. یہ اسلام کا اصول ہے، بس اس طرح عورتوں کو کسی حال میں بے سہارا نہیں چھوڑا ہے، یہ جو ایکٹ ابھی بنا ہے دوستو! پارلیمنٹ میں پاس ہوا ہے اسلام کی انہی تعلیمات کی بنیاد پر پاس ہوا ہے اور اسلام کا معجزہ ہے کہ ہمارے وزیر اعظم کو اقرار کرنا پڑا کہ 125 عورتوں کے حق میں اتنا مفید نہیں ہے جتنا یہ قانون مفید ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک مجھے خود اللہ کی مہربانی سے ہندوستان کے تقریبات جنوب وشمال ہر حصے میں اس سلسلے میں دورہ کرنے کا موقع ملا، شاید کیرالہ کے لوگ یہاں بہت سارے موجود ہیں۔ کیرالہ کے بھی مختلف حصوں میں مجھے خود جانے کا موقع ملا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہر جگہ ایک ہی آواز تھی، چاہے وہ کوئی ہو، وہ کشمیر بولنے والا ہو، وہ اردو بولنے والا ہو، وہ مگھئی بولنے والا ہو، وہ میتھلی بولنے والا ہو، وہ بنگالی بولنے والا ہو، وہ ملیالم بولنے والا ہو، وہ تمل بولنے والا ہو، وہ تیلگو بولنے والا ہو، وہ اُڑیا بولنے والا ہو، خدا کی قسم ہندوستان کے ہر کونے سے، **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پڑھنے والے شخص کی ایک ہی آواز تھی کہ ہم سب کچھ کھوئیں گے لیکن اپنا اسلام کھونے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ کے اسی متحدہ آواز کا یہ اثر تھا کہ ساری منظم مخالفانہ کوششوں کے باوجود اور دسیوں طرح کے پریشر اور دباؤ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامرانی عطا فرمائی اور

آزادی کے بعد پہلی بار یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ان کی شریعت جاری رہے گی، لیکن میرے دوستو! منزل پر آپ نہیں پہنچے ہیں، اگر آپ نے چاہا کہ ایک بل پاس ہوگیا، خوابِ خرگوش کے مزے لو، سوجاؤ، تو یہ غفلت آپ کو بہت نقصان پہنچائے گی، وہ مخالف قوتیں بہت منظّم، بہت متحرک اور بہت سرگرم عمل ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہندوستان کے کونے کونے کا ہر مسلمان اپنے طور پر لمحہ باشعور رہے اور ہر آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہے، دوسری ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگو! دین یا کوئی راستہ آپ کے یہاں سَروے میپ چھپتا ہوگا، اگر کبھی سو برس پرانا، سروے میپ آپ نے دیکھا ہو، بہت سے روڈ، بہت سی سڑکیں اس میں دیکھیں گے، آج تلاش کریں گے وہ سڑک نہیں ملے گی وہ Death Road ہوگئی کیوں؟ لوگوں نے اس پر چلنا چھوڑ دیا، جس راستے پر اس کا بالکل ثبوت موجود ہے کہ روڈ تھا لیکن لوگوں نے چلنا چھوڑ دیا، وہ راستہ نہیں رہا اور جہاں راستہ نہیں تھا لوگ چلنے لگے تو لوگوں کے چلنے سے راستہ بن جاتا ہے۔

اے میرے دوستو! اگر تم ہندوستان میں اسلام کی بقا چاہتے ہو تو سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کو اور اپنے آقا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو Death Road مت بننے دو یعنی اس پر اگر تم چلنا چھوڑ دوگے تو کسی سرکار کو ضرورت نہیں ہے اسکو بند کرنے کی وہ خود بخود بند ہوجائے گی اگر مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا شریعت کو ہم اپنی زندگی پر جاری اور نافذ کریں گے اور اللہ کی شریعت کو ہم اپنے اوپر لاگو کریں گے، اگر ہم سرکار کے دباؤ کے بغیر، کسی گورنمنٹ کی طاقت کے بغیر، کسی پولس کی لاٹھی کے بغیر، کیونکہ ہم مومن ہیں اسلئے ہم اللہ کے حکم پر چلیں گے، ہم نکاح میں وہ طریقہ اختیار کریں گے جو اللہ نے بتایا ہے، ہم وراثت بانٹیں گے، یہ نہیں ہوگا کہ بہن کا حق مارا جائیگا، کوئی تھوڑی بہت معمولی کھیت کی زمین ہے تو بٹ جائیگی، لیکن باپ کی دوکان دبئ میں تھی تو یہ نہیں بیٹے اور شہر میں مکان تھا، مدراس میں، اور پٹنہ میں اور دہلی میں، تو وہ نہیں

بڑے گا، اس میں بہن کو حق نہیں ملے گا، غلط بات ہے اگر تم نے اپنے ہاتھوں سے خود شریعت کو چھوڑا تو کوئی تمہاری شریعت کی حفاظت نہیں کرسکتا اگر شریعت تمہاری زندگی میں چالو رہی، تم شریعت پر عمل کرتے رہے تو شریعت کو ان شاء اللہ کوئی نہیں مٹا سکتا اس کا بھی عہد کیا جا سکتا ہے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی بس پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ، لوگو! جس طرح نماز کو ضروری جانتے ہو، لوگو! جس طرح روزے کو ضروری سمجھتے ہو، زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے، حج کرنا ضروری ہے اسی طرح لوگو! اللہ کی شریعت کو جہاں تک ممکن ہو اپنی زندگی میں جاری کرنا ضروری ہے، ٹھیک ہے ہندوستان کے حالات میں ہم حدود وقصاص جاری نہیں کرسکتے، ہمارے اندر اس کی استطاعت وطاقت نہیں ہے لیکن ہم قانون نکاح، قانون طلاق، قانون فسخ، قانون وصیت، قانون ولایت، قانون وراثت وغیرہ دوسرے معاملات میں اللہ کی شریعت کو ہم اپنے اوپر جاری کرنے کی طاقت رکھتے ہیں وہاں پر ہم کو جاری کرنا ہوگا، سنو لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہم کو اُتنے کا مکلّف بنایا ہے جتنے کی ہمارے اندر طاقت ہے اس میں کوتاہی کریں گے تو پکڑے جائیں گے۔

سیدنا امام سیوطیؒ بہت بڑے عالم گزرے ہیں، فقہ شافعی کے بہت بڑے امام ہیں جب خلافت عباسیہ کا زمانہ تھا، مسئلہ خلق قرآن پر ان کو قید کر دیا گیا جیل خانہ میں، ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں، جب جمعہ کا دن آتا، جمعہ کی اذان کے وقت اپنے جیل خانہ کی کوٹھری سے گھسٹتے گھسٹتے زمین پر چلتے اور جیل کے مین گیٹ تک پہنچتے سارا بدن لہولہان ہو جاتا، خون سے بھر جاتا، جب جمعہ کی نماز پڑھ کر لوگ واپس آتے تو یہ اسی طرح گھسٹتے گھسٹتے اپنی کوٹھری تک جاتے، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ قید میں ہیں آپ جمعہ کو جا نہیں سکتے؛ پھر کیوں آپ گیٹ تک آنے کی اتنی تکلیف فرماتے ہیں؟ کہا کہ اور کچھ نہیں اللہ تعالیٰ نے کہا:

”یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا إِذَا نُودِیَ لِلصَّلَاةِ مِن یَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ

اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذَلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ.“(پارہ. 28. سورہ. جمعہ. آیت. 9)

(اے ایمان والو جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید وفروخت یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔)

اے لوگو! جب جمعہ کی اذان پڑھے تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف، میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ جہاں تک میں جا سکتا ہوں اگر وہاں تک نہیں گیا تو کہیں اللہ مجھ سے یہ پوچھ نہ لے کہ سیوطی تجھ کو میں نے گیٹ تک جانے کی طاقت دی تھی تو وہاں تک تو جاتا، آگے لے جانا نہ لے جانا میرا کام تھا، تو میں اللہ کو کیا جواب دونگا؟ سیدنا امام سیوطی کے اس واقعہ سے جو نجی اور شخصی واقعہ ہے، ملی زندگی میں ہمارے لئے اور آپ کے لئے عبرت کا ایک سامان موجود ہے۔ ملت اسلامیہ ہندیہ اگر سوچ کر کہ سب کچھ ہم نہیں کر سکتے، جو تھوڑا کر سکتے ہیں اسکو بھی چھوڑ دینے کو تیار ہوگی تو یاد رکھو پورا دین تمہارے ہاتھ سے نکل جائیگا لیکن جب جتنا کچھ کرنے کی استطاعت تمہارے اندر ہے، جتنا بھی عمل کرنے کی طاقت تمہیں، ان موجودہ حالات میں اللہ نے دی ہے، اُتنا ہی احکام پر عمل کرنے کا فیصلہ کرو، ان شاء اللہ خدا تعالیٰ حالات کو بدلنے والا ہے آگے کا نتیجہ ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

میرے بزرگو! اور دوستو! ہندوستان میں جدوجہد جو شریعت اسلامیہ کے تحفظ کی چل رہی ہے اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کیلئے آپ کو ہر کونے میں چاہے آپ جہاں بھی رہتے ہوں اپنے حالات سے بے خبر نہیں رہنا چاہئے، مسائل کا صحیح شعور پیدا کرنا چاہئے، شرعی احکام لوگوں تک پہنچانا چاہئے اور اپنے سماج کو صحیح اسلامی خطوط پر جاری کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اگر ہم نے یہ سب کچھ کیا، تو ان شاء اللہ ہندوستان میں ہمارا اسلامی وجود باقی رہے گا اور کوئی سازش اسے مٹا نہیں سکے گی۔ اللہ ہم کو اور آپ کو حق اور خیر کی توفیق عطا فرمائے۔

آیئے دعا کرلیجئے!

اللھم صلی علی سیدنا مولانا محمد وعلی اٰله و صحبه و بارک وسلم کما تحب و ترضی عدد ماتحب و ترضی، ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخٰسرین، ربنا إننا اٰمنا بک و برسولک فاکتبنا مع الشّٰهدین، ربنا اعزالاسلام والمسلمین و اذل الکفرة والیهود والنصاریٰ والمشرکین ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و في الآخرة حسنة وقنا عذاب النار وادخلنا الجنة مع الابرار برحمتک یا عزیز یا غفار، اللھم انک عفو کریم تحب العفو فاعف عنا، انک عفو کریم تحب العفو فاعف عنا، انکا عفو کریم تحب العفو فاعف عنا، رب صل وسلم و بارک علی سیدنا محمد و علی اٰله و صحبه اجمعین، واٰخردعونا ان الحمد لله رب العالمین.

☆☆

صدارتی خطبات

مدبر اسلام، مرشد الامہ حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

خطبہ صدارت برائے بائیسواں اجلاس
آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ممبئی بتاریخ ۲۷/ ۲۸/ ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۲۰/ ۲۱/ ۲۲/ اپریل ۲۰۱۲ء

الحمد للہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد، وعلیٰ آلہ وصحبہ الغر المیامین، ومن تبعھم بإحسان و دعا بدعوتھم إلی یوم الدین، أما بعد:

حضرات! آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس بائیسویں اجلاس میں ہم آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہیں، اس اجلاس کی اہم خصوصیت یہ ہے، کہ ہندوستان کے عروس البلاد ممبئی میں منعقد ہورہا ہے، جہاں آج سے چالیس سال پہلے ملک کے بعض اکثریتی حلقوں کی طرف سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی لانے کے مطالبہ کے مضرات کو محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کے تمام مسلکوں کے نمائندوں اور ملت کے سرکردہ علماء ودانشوروں کا ایک عظیم الشان نمائندہ کنونشن منعقد ہوا تھا، اور شریعت اسلامی کے قوانین وضوابط کے قطعی اور ناقابل ترمیم ہونے کو مقصد عمل بنانے کے لیے ایک بااثر اور نمائندہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی، اور اس کے مطابق آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، آج اسی شہر میں چالیس سال بعد ہمارا یہ اجتماع منعقد ہورہا ہے، جس میں اپنی سالانہ کارکردگی اور آئندہ کے لائحہ عمل پر غور ہوگا، ہم جب اس وقت سے آج کے وقت تک اس کی تقریباً چالیس سالہ تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو خوشی ہوتی ہے کہ مسلمانان ہند کے مختلف مسلکوں کے اس متحدہ پلیٹ فارم

نے اپنے اتحاد واتفاق کو قائم رکھتے ہوئے شریعت اسلامی کے تحفظ کے مختلف مسائل کو حل کیا، اور قابل قدر خدمات انجام دی، اس کی کارکردگی کا آغاز ہماری ملت کی ان سرکردہ ہستیوں کی فکرمندی اور حکمت عملی اور مؤثر کارگذاری سے ہوا، جو ملت کے اہم رہنمائے دین اور دانشوران ملت سمجھے جاتے تھے، بطور مثال اس کے لیے پہلے صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور بطور سکریٹری جنرل خانقاہ رحمانی کے سربراہ حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے، پھر ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ صدر ہوئے، ان بزرگوں کی سرپرستی میں بورڈ نے اپنی بہتر کارکردگی اور فکرمندی کا ثبوت دیا، کارگذاری جاری رکھنے میں ان کے جانشینوں میں تیسرے صدر فقیہ ملت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور موجودہ سکریٹری جنرل امیر شریعت بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کے نام نمایاں ہیں، ان کے علاوہ بورڈ کے سکریٹری حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اور اسسٹنٹ جنرل سکریٹری عبدالرحیم قریشی صاحب کی فکرمندی اور جذبہ عمل سے بھی بورڈ فائدہ اٹھا رہا ہے، ان کے علاوہ اور دیگر دانشوران ملت اور ذمہ داران شعبہ جات کا مخلصانہ تعاون بورڈ کے لیے تقویت کا ذریعہ ہے۔

حضرات! شریعت اسلامی کے تحفظ کا مسئلہ اس غیر مسلم اکثریت کے ملک میں برابر اہم اور توجہ کا طالب ہے، اور اس کی فکر کو برابر جاری رکھنا ملت اسلامیہ ہند کی اہم ضرورت ہے، آج سے چالیس سال قبل مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی فکر اور اس کے لیے حسب ضرورت بورڈ کا قیام جن حالات واسباب کی بنا پر عمل میں لایا گیا تھا، وہ حالات اور اسباب ختم نہیں ہوئے ہیں، اس طرح کے حالات وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے اور آتے رہیں گے، جن کے سلسلہ میں اگر ضروری توجہ نہ کی جائے گی، تو مسلمانوں کا اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کے اختیار کو نقصان پہنچ سکتا ہے، لہذا ملت کے دینی تحفظ کی فکر رکھنے والوں کا ایسے حالات پر

برابر نگاہ رکھنا ضروری ہے، تاکہ احکام شریعت پر ان کے عمل کرنے کی مذہبی آزادی برابر قائم رہے، اور ان کے مذہبی تشخص وتحفظ کو کوئی خطرہ نہ پیش آئے، کیوں کہ وہ اقلیت میں ہیں، اور اقلیت کو اپنے مسائل کے سلسلہ میں توجہ وفکرمندی برابر قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور جن ذہنوں میں یکساں سول کوڈ کا تقاضہ ابھرا تھا، ان ذہنوں میں اسی طرح کا کوئی خیال پھر ابھر سکتا ہے، ہندوستان کے دستور نے ملک کے ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے اپنے طریقہ کے مطابق عمل کرنے اور اس کے مطابق ادارے چلانے کا حق دے رکھا ہے، اس حق کو برقرار رکھنے کی فکر کرنے کی برابر ضرورت ہے، کیوں کہ ان کے اس حق کو بدلنے یا اس پر حکومت وقت کو اپنے اثر میں لینے کی بات سامنے آسکتی ہے، ابھی حال میں کئی ایکٹ جو حکومت کی طرف سے آئے ہیں، ان کی بعض دفعات اقلیت کی مذہبی خود اختیاری کے لیے ضرر رساں پائے گئے ہیں، بورڈ ان کے اصلاح کے سلسلہ میں کوشش جاری رکھے ہوئے ہے، لیکن ہر ایکٹ کو ایسے اسلوب میں مرتب کیا گیا ہے، کہ خود مسلمانوں کے بعض دانشور اس کے بعض پہلوؤں کی نقصان رسانی کو محسوس نہیں کر سکے ہیں، اسلامی حقوق کی حفاظت کو مؤثر بنانے کے لیے ایسے ذہنوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ اسلامی حقوق کی اہمیت کو سمجھیں، اور اس کا بھی خیال رکھیں کہ حکومت کی طرف سے جو ایکٹ بنائے جائیں، یا کورٹ کی طرف سے جو فیصلے ہوں، وہ دستور میں دیئے ہوئے اختیارات کی روشنی میں کسی مذہب کے لیے ضرر رساں نہ ہوں، ملک کے باشندوں میں سے ہر مذہب والوں کو جو مذہبی تحفظ دستور ہند کی رو سے ملا ہوا ہے، وہ ایکٹ کی کسی دفعہ سے متاثر نہ ہو، اسی بات پر نظر رکھنے اور ضرورت کے مطابق کوشش کرنے کی ذمہ داری مذہبی حقوق کے پاسبانوں پر عائد ہوتی ہے، اسی ذمہ داری کو بورڈ الحمدللہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، اور اسی کے ساتھ اس بات کی فکر بھی رکھتا ہے، کہ ملک کی عدالتوں میں بھی ایسے فیصلے نہ کئے جائیں، جن سے مذہبی آزادی پر روک لگتی ہو، اس طرح کے حالات جب پیش آئیں، تو مسلمانوں کے احساس وغیرت

دینی رکھنے والے حضرات ان کے خطرات کو محسوس کریں، اور اس کے لیے بورڈ کا ساتھ دیں، اور تائید وتعاون کے ذریعہ کوشش میں شریک ہوں، تعاون کے ضمن میں مالی تعاون کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، کیوں کہ کم از کم عدالتی کوششوں میں بے حد صرفہ آتا ہے، خاص طور پر جب کہ سپریم کورٹ تک کوششوں کا سلسلہ پہنچتا ہے، اور بورڈ کے پاس آمدنی کا کوئی باقاعدہ اور متعین ذریعہ نہیں ہے، وہ ملت کے حوصلہ مند افراد کے تعاون سے ہی کام لیتا ہے، اس کی فکر ملت کے افراد رکھیں گے تو بورڈ کے مقصد کار کو مطلوبہ قوت حاصل ہو سکے گی، اور مسلمانوں کو اپنے مذہبی حق کے تحفظ کرنے میں انشاء اللہ کامیابی حاصل ہو سکے گی۔

حضرات! ہماری ملت اسلامیہ ہندیہ کو ملک کی دیگر اقلیتوں کے مقابلہ میں الحمدللہ یہ امتیاز حاصل ہے، کہ وہ ایک تو اپنی شریعت کے معاملہ میں خود کفیل ہے، اور دوسرے یہ کہ اس نے اپنی شریعت اسلامیہ میں خود کفیل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملی تشخص کے بقاء کے لیے بورڈ کی صورت میں اپنا مشترکہ پلیٹ فارم بنا رکھا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی شریعت کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اور شریعت کے تحفظ کو یقینی بنایا ہے۔

ملت اسلامیہ کا یہ بورڈ جس جذبہ اور فکرمندی کے ساتھ ملت کی نصرت اور شریعت کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں آیا تھا، وہ الحمدللہ اس میں اپنے اولین خدمتگاروں کے نقش قدم پر ہی چل رہا ہے، اس سلسلہ میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، وہ حالات کے مطابق ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ خوشی کی بات ہے، کہ اس کے ارکان باوجود اپنے متنوع مسلکوں اور گروپوں کے نمائندے ہونے کے بورڈ کے مقصد اور لائحہ عمل پر متفق اور آپس میں تعاون کے ساتھ عمل پیرا ہیں، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آپسی تعاون کے طریقہ کار پر کاربند ہیں، اور الحمدللہ وسعت قلبی اور تعاون سے کام لیتے ہیں، جس کو ذمہ داران بورڈ تشکر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ملت اسلامیہ ہند کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور دیگر مختلف مسائل کی فکر کرنے کے لیے

اس ملک میں شروع ہی سے مسلمانوں کی متعدد جماعتیں قائم ہیں، اور وہ سب اپنی اپنی جگہ ملت کی خدمت انجام دے رہی ہیں، یہ جماعتیں ملت کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مخصوص طور پر اختیار کرتی ہیں، اور اپنا اپنا مخصوص نطقہ نظر اور بعض بعض اپنا مخصوص مذہبی مسلک بھی رکھتی ہیں، وہ سب ملت کے مسائل ومعاملات کی فکرمندی اور انجام دہی میں اپنے اپنے دائرہ میں حصہ لیتی ہیں، بورڈ کا ان سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بورڈ نے تو ملت کی بنیادی ضرورت جو اس کے مذہبی بقاء سے تعلق رکھتی ہے، یعنی شریعت اسلامی کو کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ سامنے آئے تو اس کو وہ روکے، اور تحفظ شریعت کے سلسلہ میں پیش آمدہ خطرات کو روکنے کی ذمہ داری انجام دے، اور اس خاص مقصد کے سلسلہ میں اس کو ملت کی سب جماعتوں اور اداروں کا ایک طرح سے وفاق ہونے کی حیثیت حاصل ہے، لہذا بورڈ نے قوانین شریعت کے مشترکہ بنیادی معاملات تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا ہے، وہ ملت کے دیگر معاملات میں ان معاملات کی فکر کرنے والی جماعتوں کی کوششوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے، اور ان کو کافی سمجھتا ہے، ان میں بقدر ضرورت تعاون دیتا ہے، خاص طور پر وہ سماجی معاملات جن کا قوانین شریعت سے کچھ تعلق بنتا ہے، ان معاملات میں بورڈ حسب ضرورت شرکت کرنا اور تعاون دینا ان کے کام کرنے والوں کے لیے تقویت کا ذریعہ سمجھتا ہے، مثلاً تفہیم شریعت، اصلاح معاشرہ اور دارالقضاء وغیرہ، بنیادی طور پر ملت کی دیگر جماعتیں اپنی اپنی جگہ جو خدمات انجام دیتی ہیں، بورڈ ان کو ہی کافی سمجھتا ہے۔

حضرات! ملت اسلامیہ جن ملکوں میں اکثریت کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں ملت کے دانشوروں کو عوامی سطح پر کچھ بڑی ذمہ داری انجام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن جہاں ملت اقلیت میں ہوتی ہے، وہاں ان کو اپنے ملی اور مذہبی معاملات میں عوامی تعاون ومشارکت کے ذریعہ ذمہ داری انجام دینا اس کا ملی فریضہ ہوتا ہے، اور اس میں کوتاہی کرنے سے مذہبی تحفظ کو نقصان پہونچتا ہے، چنانچہ اسی ضرورت کے لیے ملت کا یہ مشترکہ پلیٹ فارم قائم ہوا، یہ

ملت کے لیے نیک فال ہے، ایسے کسی بھی مشترکہ پلیٹ فارم میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے افراد اور مختلف جماعتوں کے نمائندے ہوتے ہیں، مشترک پلیٹ فارم کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نقطہ نظر کے آپسی اختلاف کو ٹکراؤ ونقصان دہ اختلاف کی منزل تک نہ پہنچنے دیں، اس بات کے لیے دور اندیشی اور کچھ صبر و برداشت کا مزاج اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے، انسان جیتی جاگتی مخلوق ہے، جمادات کی طرح نہیں ہے، انسان میں احساسات و جذبات کا فرق ہوتا ہے، لیکن انسان کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے اہم اور بلند مقصد کی خاطر اپنے نکتہ ہائے نظر میں فرق کے باوجود آپس میں اشتراک وتعاون کے ساتھ بلند مقصد کے لیے کام کرتا ہے، اور الحمدللہ ہمارے بورڈ کے ارکان بڑی حد تک اسی پر کاربند ہیں۔

حضرات! معاشرتی زندگی کے معاملات میں اہم مسئلہ جو لوگوں کے ذہنوں کو بہت زیادہ متوجہ کرتا ہے، وہ ازدواجی زندگی کے معاملات ہیں، جن کے سلسلہ میں اصول وضوابط اور حقوق وفرائض کی پابندی کے لیے اسلامی شریعت نے بہت محکم اور واضح ہدایات دی ہیں، ان ہدایات کے باجود اگر کچھ معاملات پریشانی کا باعث بنتے ہیں، تو وہ زیادہ تر شریعت کی ہدایات کو نظر انداز کرنے یا ان سے ناواقفیت کی بنا پر ہوتے ہیں، یا ماحول کے بگڑے ہوئے حالات سے بہت متاثر ہوجانے کی وجہ سے پیش آتے ہیں، اگر شریعت کی واضح ہدایات پر عمل کیا جائے تو یہ معاملات پیش نہ آئیں، اللہ تعالیٰ نے بیوی پر شوہر کے حقوق عائد کیے ہیں، اور شوہر پر بیوی کے حقوق عائد کئے ہیں، اور دونوں کے درمیان رواداری اور دلداری کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، شریعت کی ان ہدایات پر عمل نہ کرنے سے بھی یہ مشکلات اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی ذمہ داری شریعت پر نہیں ہے، وہ خود کوتاہی کرنے والوں کی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہیں، لہذا شریعت کے احکام میں نہ تو کسی تغیر کی ضرورت ہے، اور نہ اس کا کوئی جواز ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ شریعت کا حکم معلوم کیا جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، شریعت اسلامی پروردگار عالم کی طرف سے پوری طرح محکم اور ضرورت ومصلحت

انسانی کے مطابق ہے، شریعت کے معاملہ میں شریعت کا حکم معلوم کرکے اسی کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے، تمدن ترقی یا سماج میں پھیلے ہوئے رسوم ورواج کی بنیاد پر شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کو بدلا نہیں جاسکتا۔

شریعت اسلامی الٰہی قانون حیات ہے، جو انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے اس کے آخری نبی کے ذریعہ ہم کو عطا کیا گیا ہے، اس میں فرق کرنے یا ردوبدل کرنے کا حق کسی انسان کو نہیں دیا گیا، شریعت اسلامی کے معاملہ میں حجت صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت صحیحہ اور استنباط مسائل کے مآخذ سرچشمہ ہیں، ان پر کسی ملک یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے، اور جہاں تک ہمارے اس ملک ہندوستان کا تعلق ہے جس کے تعلق سے سابق صدر بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک صدارتی خطبے میں تحریر فرمایا تھا، کہ ہمارا ملک ہندوستان شریعت کے معاملے میں اپنی پوری طرح معتبر ومنفرد علمی ودینی حیثیت بھی رکھتا ہے، عالم اسلام کی دینی وعلمی تاریخ میں اس کا اپنا ایک مقام رہا ہے، جب سارے عالم اسلام پر فکری اضمحلال وعلمی انحطاط کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، اور کوئی ایسی شخصیت وہاں نہیں پیدا ہورہی تھی، جو متوسط علمی سطح سے بلند ہو اور کوئی مجتہدانہ فکر یا نئی علمی تحقیق پیش کرسکے، تو ہندوستان نے ایسے باکمال اور مجتہد الفکر علماء ومصنف پیدا کیے، جن کے علمی تفرد اور مجتہدانہ قابلیت کا سکہ عرب وعجم نے مان لیا، اور علمی وتدریسی حلقے عرصہ تک ان کی کتابوں اور ان کے متون کی شروح سے گونجتے رہے، ملا محمود جونپوریؒ، ملا محبّ اللہ بہاریؒ، مولانا عبدالعلی بحرالعلومؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبد العزیزؒ، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں، پھر مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے فقیہ النفس عالم پیدا ہوئے، جو اس کام کی تکمیل کے لیے نہایت موزوں تھے، پھر اس سب کے ماسوا ہندوستان نے دینی استقامت، فکری توازن اور

رسوخ فی العلم کا ایسا ثبوت دیا کہ وہ دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن گیا، اور آج بھی عرب اور قدیم اسلامی ممالک کے اہل علم واہل فکر ہندوستان کی طرف عظمت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور بہت سے مسائل میں اس سے دینی وعلمی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایسے مسئلے میں جس میں غلط تجدد، مغربی افکار واقدار سے مرعوبیت، قانون سازی میں سطحیت وعجلت صاف جھلکتی ہو، اور شرعی اصول اس کی تائید نہ کرتے ہوں، ہمارے لیے کسی بڑے سے بڑے مسلمان یا عرب ملک کا کوئی فعل یا قانون حجت نہیں بن سکتا، اگر سارا عالم اسلام کسی غلط چیز پر اتفاق کرے، اور سارے مسلمان ممالک اور وہاں کے علماء کوئی غلط فیصلہ کریں یا اپنے حدود سے تجاوز کریں، تو بھی ہم ہندوستانی مسلمان، شریعت اسلامی کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے اور خدا کے قانون کو آخری قانون سمجھتے رہنے کا پورا حق رکھتے ہیں، اور ان کو اس کی صلاحیت ان کی قرآن وحدیث میں اعلیٰ قابلیت کی بنا پر یہ حق حاصل ہے۔

حضرات! بورڈ کے ذمہ داروں نے اپنے اختیار کردہ دائرہ عمل میں متعدد مشکل مسائل کے حل کی کوشش کی، اور کامیابی حاصل کی، ان کامیاب کوششوں سے بورڈ کا وقار بڑھا، اور آئندہ بھی ایسے مسائل آئیں گے، کیوں کہ حالات میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، حالات یکساں نہیں رہتے اور نئے مسائل بھی ابھرتے ہیں، اس لیے بورڈ کو برابر فکر میں رہنا ہے، اخلاص اور حق پسندی کے ساتھ کام کئے جاتے رہنے سے انشاء اللہ کامیابی حاصل ہوتی رہے گی، ہمارا یہ اجلاس حالات حاضرہ کے تناظر میں اپنا پروگرام طے کرے گا، اور انشاء اللہ اس پر بخوبی عمل کیا جائے گا، تمام ارکان بورڈ سے ملت کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے پورے تعاون کے ملنے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ کی جانے والی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ ہی ہماری اصل طاقت ہے، اور وہی ہماری کامیابی کی کلید ہے۔ **وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین.**

☆☆

خطبہ صدارت برائے تینتیسواں اجلاس
آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ اجین بتاریخ ۲/۲/۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۰/۲۱/۲۲ مارچ ۲۰۱۳ء

الحمد للّٰہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد، وعلیٰ آلہ و صحبہ الغر المیامین، ومن تبعھم بإحسان و دعا بدعوتھم إلی یوم الدین، أما بعد :

حضرات! آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس تینتیسویں اجلاس میں ہم آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہیں،

ملت اسلامیہ کا یہ بورڈ جس جذبہ اور فکرمندی کے ساتھ ملت کی نصرت اور شریعت کے تحفظ کے لیے میدان عمل میں آیا تھا، وہ الحمدللہ اس میں اپنے اولین خدمتگاروں کے نقش قدم پر ہی چل رہا ہے، اس سلسلہ میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، وہ حالات کے مطابق ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ خوشی کی بات ہے، کہ اس کے ارکان باوجود اپنے متنوع مسلکوں اور گروپوں کے نمائندے ہونے کے بورڈ کے مقصد اور لائحہ عمل پر متفق اور آپس میں تعاون کے ساتھ عمل پیرا ہیں، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آپسی تعاون کے طریقہ کار پر کاربند ہیں، اور الحمدللہ وسعت قلبی اور تعاون سے کام لیتے ہیں، جس کو ذمہ داران بورڈ تشکر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اس ملک کے دستور میں اقلیت واکثریت اور متعدد مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے

اپنے مذہب پر عمل کرنے کا جو حق دیا گیا ہے، اس کے تحت مسلمانوں کو اپنے مذہبی ضوابط کے مطابق عمل کرنے کا اختیار حاصل ہے، اس اختیار کی بناء پر بھی مسلمان اس ملک کو اپنا ملک سمجھتے ہیں، اور دیگر اہل ملک باشندوں کی طرح اس کی حفاظت اور ترقی کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، لیکن دستور کے دیئے ہوئے اس حق کے قائم رہنے کو خطرہ پیش آنے لگے، یا اس کو بدل دینے کی کوشش کی جانے لگے، تو مسلمانوں پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اس کے بقاء و تحفظ کے لیے جو بھی دستوری طریقے ہیں ان کو اختیار کریں۔

حضرات: ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے مذہبی معاملات سے غیر مسلموں کو واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ خاصی غلط فہمیاں ہیں، اس کی بنا پر ہمارے مذہبی معاملات میں ان کی مخالفانہ رایوں میں ان کی ناواقفیت کا بھی دخل ہوتا ہے، اس کے لیے بورڈ نے تفہیم شریعت کا شعبہ قائم کر رکھا ہے اس شعبہ کے فعال ہونے کی بڑی ضرورت ہے، تاکہ جو معاملات غلط فہمی کی بنا پر سامنے آتے ہیں ان کا تدارک ہوسکے، اور اس سلسلہ میں یہ بات خوشی کی ہے کہ حکومت کی طرف سے گذشتہ مدت میں بنائے گئے قوانین کی درستگی کے لیے حکومت کے ذمہ داروں سے گفتگو کے ذریعہ تفہیم کا کام خاصی فکرمندی سے کیا گیا اور الحمدللہ اس کا ایک حد تک فائدہ حاصل ہوا ہے، اور ابھی کوشش جاری ہے، اس میں ہمارے بورڈ کے سکریٹری جناب مولانا ولی رحمانی صاحب نے خاصی فکر و کوشش کا ثبوت دیا، اور الحمدللہ اس کا ایک حد تک فائدہ حاصل ہوا ہے اور ابھی کوشش جاری ہے، مولانا کے ساتھ دیگر ذمہ داران بورڈ نے بھی حصہ لیا جو قابل قدر ہے۔

شریعت اسلامی کے اپنے اصول وضوابط کے مطابق عمل کرنے کا جو اختیار مسلمانوں کو دستور کی طرف سے حاصل ہے ہماری مقامی اور صوبائی عدالتوں کی طرف سے اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے متعدد مخالف فیصلے آئے ہیں بورڈ ان کے متعلق معلومات حاصل ہونے پر ضرورت کے لحاظ سے فکر کر رہا ہے، لیکن کام خاصہ وسیع ہے اس میں ارکان بورڈ کی

طرف سے ان کی اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق تعاون ملنے کی ضرورت ہے

بورڈ اصلاً ایک فلاحی ادارہ ہے جو اس کے ہمدردوں کے مالی تعاون سے چلتا ہے اور اس کے کاموں میں بڑے اخراجات ہوتے ہیں اور مقدمات پر بڑے مصارف آتے ہیں اس کے لیے بھی ہمارے ارکان کی ذمہ داری ہے کہ اہل خیر کو متوجہ کریں۔

حضرات یہ میری چند گزارشات ہیں جنہیں ارکان بورڈ کو محسوس کرنا ہے امید ہے بورڈ کے مزاج و مصالح کے تناظر میں قابل اعتناء محسوس کریں گے، اللہ ہم کو اور آپ کو اپنی مرضیات پر چلائے اور امت مسلمہ کے شرعی تقاضوں اور مقاصد کی نصرت و حفاظت کی سعادت عطا فرمائے۔

چنانچہ آج سے تقریباً نصف صدی قبل مسلمانوں کے مذہبی قوانین میں ترمیم کی آواز جب اٹھی، اور اس کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہوا، تو ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ اس حق کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی جائے، اور وہ کوشش مشترکہ و متحدہ پلیٹ فارم سے ہو، اسی اہم اور مشترکہ کوشش کے لیے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی تشکیل عمل میں لائی گئی، تاکہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے کے حق کے راستے میں جو رکاوٹ پیدا کی جارہی ہو، اس کا مقابلہ کیا جائے، اس کے لیے کوشش کے تین میدان اختیار کئے گئے، ایک تو عدالت سے رجوع کرنا، دوسرے حکومت کے ذمہ داروں کو توجہ دلانا، تیسرے اس کے سلسلہ میں جمہوری بیداری کے ذرائع اختیار کرنا۔

چنانچہ شریعت اسلامی کے کسی معاملہ میں مداخلت کی آواز جب بھی کسی طرف سے اٹھائی گئی تو ان تین پہلوؤں میں جس پہلو کو مفید سمجھا گیا اختیار کیا گیا، اور حسب موقع جمہوری بیداری کا ذریعہ بھی اختیار کیا گیا، اس کے اثر سے مسلمانوں کی متحدہ آواز سامنے آئی، جس کے ذریعہ حکومت کے ذمہ داروں کو مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کرایا گیا، اور اگر معاملہ کورٹ کا ہوا اور کورٹ کی طرف سے مدد نہیں ملی، تو دستور سازی کے ذمہ داروں کو متوجہ

کیا گیا، چنانچہ اس کا فائدہ ہوا، اور ایک اہم مسئلہ میں حکومت وقت کی طرف سے پارلیمنٹ میں قانون بنوانے کی کوشش میں کامیابی ملی، اور اس سے شریعت اسلامی کے مطلوب حق کا تحفظ ہوا، اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات کا تحفظ ہوا، لیکن کچھ دنوں سے اس متعلقہ قانون کی تشریح نچلی عدالتوں میں ایسی کی جانے لگی ہے، جو مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے خلاف واقع ہورہی ہے، ہمارے بورڈ کے سامنے اس کی مثالیں آرہی ہیں، اور بورڈ اس کے لیے ضروری فکرمندی اور توجہ سے کام لے رہا ہے، بورڈ نے اپنی جدو جہد کا دائرہ کار شریعت اسلامی کے تحفظ کے حد میں رکھا ہے، اور وہ اس کو اسی حد میں رکھنا ضروری سمجھتا ہے، ملت اسلامیہ کے دیگر معاملات دوسری ملی جماعتوں کے دائرہ کار میں انجام پاتے ہیں، بورڈ کے متعلقین اور دیگر حضرات کو بھی اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

بابری مسجد کا مسئلہ استثنائی طور پر بورڈ کے ذمہ آ گیا تھا، جس کو بورڈ کررہا ہے، اس کے سلسلے میں نچلی عدالت نے جو فیصلہ سنایا اس کے تدارک کے لیے مسئلہ کو عدالت علیا میں لے جانا ضروری سمجھا گیا۔

شریعت اسلامی کے تحفظ کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی بہت قابل توجہ ہے کہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے کے اختیار کے تحفظ کی جو بات ہماری طرف سے کہی جاتی ہے، اس کے ساتھ خود ہمارا عمل بھی اس کے مطابق ہونا چاہئے، اس کے لیے بورڈ نے اصلاح معاشرہ کا شعبہ قائم کیا، جو حسب استطاعت کام انجام دے رہا ہے، لیکن ملک میں مسلمانوں کی آبادی وسیع ہے اور پورے ملک کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے، لہذا اس سلسلے میں کام کا میدان بہت پھیلا ہوا اور وسیع ہے، اس کے لیے یہ ذمہ داری تنہا بورڈ کے ذمہ داروں تک محدود رہنا ناکافی ہے، یہ ضروری کام ہے اور زیادہ سے حضرات کی توجہ کا محتاج ہے، یہ صرف کوئی ایک ادارہ پوری طرح انجام نہیں دے سکتا، اس کے لیے سارے اہل حق کی طرف سے توجہ وکارکردگی کی ضرورت ہے، اصلاح معاشرہ کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی پرسنل لاء یعنی شریعت

اسلامی کے احکام اور ہدایات ہماری زندگی میں جاری وساری کرنے کا اہتمام کیا جائے، تاکہ غیروں کی طرف سے یہ کہنے کا موقع نہ ہو، کہ آپ جس حق کا مطالبہ کرتے ہیں، خود اس پر عمل نہیں کرتے۔

شریعت اسلامی الٰہی قانون حیات ہے، جو انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے اس کے آخری نبی کے ذریعہ ہم کو عطا کیا گیا ہے، شریعت اسلامی کے معاملہ میں حجت صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت صحیحہ اور استنباط مسائل کے مآخذ سرچشمہ ہیں، ان پر کسی ملک یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔

یہاں ایک یہ بات نہایت قابل توجہ ہے کہ جب ہم عدالتوں سے کہتے ہیں کہ فلاں فیصلہ شریعت اسلامی کے قانون کے خلاف ہے، تو اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اسلامی شریعت کو معلوم کرکے اوّلاً اس پر خود عمل کریں، اس طرح شریعت کے معاملات میں ہم مفتی یا قاضی سے دریافت کرکے مسئلہ حل کرسکتے ہیں، اس کے لیے بورڈ نے دارالقضاء کا نظام جاری کیا ہے، اس نظام کو زیادہ سے زیادہ عام اور کارگر بنانے کی ضرورت ہے، اور اس فکر و جدو جہد کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، کہ وہ شریعت اسلامی کے تحفظ کا صرف مطالبہ یا تذکرہ کرنے پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ اس کے لیے جدوجہد بھی اختیار کریں۔

حضرات! ہماری ملت اسلامیہ ہندیہ کو ملک کی دیگر اقلیتوں کے مقابلہ میں الحمدللہ یہ امتیاز حاصل ہے، کہ وہ ایک تو اپنی شریعت کے معاملہ میں خودکفیل ہے، اور دوسرے یہ کہ اس نے اپنی شریعت اسلامیہ میں خودکفیل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملی تشخص کے بقاء کے لیے بورڈ کی صورت میں اپنا مشترکہ پلیٹ فارم بنا رکھا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی شریعت کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اور شریعت کے تحفظ کو یقینی بنایا ہے۔

حضرات! بورڈ کے ذمہ داروں نے اپنے اختیار کردہ دائرہ عمل میں متعدد مشکل مسائل

کے حل کی کوشش کی، اور کامیابی حاصل کی، ان کامیاب کوششوں سے بورڈ کا وقار بڑھا، اور آئندہ بھی ایسے مسائل آئیں گے، کیوں کہ حالات میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، حالات یکساں نہیں رہتے، اور نئے مسائل بھی ابھرتے ہیں، اس لیے بورڈ کو برابر فکر میں رہنا ہے، اخلاص اور حق پسندی کے ساتھ کام کئے جاتے رہنے سے انشاء اللہ کامیابی حاصل ہوتی رہے گی، ہمارا یہ اجلاس حالات حاضرہ کے تناظر میں اپنا پروگرام طے کرے گا، اور انشاء اللہ اس پر بخوبی عمل کیا جائے گا، تمام ارکان بورڈ سے ملت کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے پورے تعاون کے ملنے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ کی جانے والی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ ہی ہماری اصل طاقت ہے، اروو ہی ہماری کامیابی کی کلید ہے، **و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین.**

حضرات: اسلام میں دین کی اہمیت دنیا کی اہمیت سے زیادہ اور لازمی حیثیت کی حامل ہے، اگر دینی ضرورت سامنے ہو اور اس کے لیے بھوکا رہنا ہو، تو مسلمان بھوکا رہ سکتا ہے، کوئی دنیاوی مفادات کو قربان کرنا پڑے، تو اس کو قربان کرسکتا ہے لیکن دینی حکم کو قربان نہیں کرسکتا، مذہبی احکام ہم کو ہمارے رب کی طرف سے دیئے ہوتے ہیں، اور ہماری دنیاوی مفادات کے مقابلہ ہماری دنیاوی مصلحت کے تحت ہوتے ہیں، ہم اپنی دنیاوی مصلحت کو اللہ و رسول کی طرف سے مقرر کردہ حکم کے سامنے جھکا دیتے ہیں، لیکن مذہبی مصلحت کو نظر انداز نہیں کرتے، اس ملک کے دستور نے ہم کو مذہبی تقاضوں کے ملے میں اختیار دیا ہے، اور ہم اس کی بنا پر اپنے مذہبی احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنی ضرورت کے مطابق زندگی گذارتے ہیں دستور کے ااس دیئے ہوئے حق کی بقاء کی فکر کا کام یہی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے ذمہ لیا ہے، ار بورڈ کو مسلمانوں کے تمام فرقوں اور ملی جماعتوں کی شرکت و تعاون حاصل ہے، تحفظ شریعت کے علاوہ دیگر ملی معاملات ملت کی دیگر جماعتوں اور اداروں میں تقسیم ہیں، اس ملک میں مسلمان اگر چہ اقلیت میں ہیں لیکن وہ

ایک بڑی امت اور بڑی حیثیت رکھتے ہیں، جس کے مسائل و معاملات مختلف اقسام کے ہیں وہ سیاسی بھی ہیں اقتصادی بھی ہیں ثقافتی ہیں اور صاف ستھری سنزدگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں، ان مسائل کی فکر اور کوشش کے سلسلے میں مسلمانوں کی دیگر جماعتیں ہیں اور وہ اپنا اپنا فریضہ انجام دیتی ہیں، لہٰذا ان معاملات میں بوورڈ کے پلیٹ فارم سے کچھ کہنے اور کرنے ضرورت نہں ہوتی تا کہ بورڈ اپنے کو اخلاقی مسائل سے الگ رکھتے ہوئے اپنی اہم اور مشترکہ مقدصد کے کام کے لیے یکسور ہے، لہٰذا ابورڈ کے اکرکان اس کبات کا لحاظ ضروری ہے، کہ اس پالیسی کا خیال رکھیں۔

حضرات! بورڈ کے لیے یہ اطمینان اور اعتماد کی بات ہے کہ بورڈ امت مسلمہ ہندیہ کے مختلف نقطہائے نظر کی متفقہ نمائندگی کرنے والا ادارہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بورڈ کی اس اجتماعی طاقت کی مقصدیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ امت مسلمہ کے بنیادی معاملات کو جن کا اصل تعلق ان کی شریعت سے ہے اپنا اصل موضوع سمجھے اور اس میں نظریاتی اختلاف اور جماعتی سیاست سے الگ رہتے ہوئے امت کی متفقہ نمائندگی کا فرض انجام دے، اور اپنی جدوجہد کے لیے علمی و قانونی ذرائع تک اپنے وسائل کو محدود رکھے، اور اپنی وحدت اجتماعی کی حفاظت کرے۔

☆☆

خطبہ صدارت برائے چوبیسواں اجلاس
آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ جے پور بتاریخ ۲۱/۲/ جمادی الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۱/۲۲ مارچ ۲۰۱۵ء

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام علىٰ سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، و علىٰ آله وصحبه الغر الميامين، ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد :

حضرات! آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس چوبیسویں اجلاس میں ہم آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہیں، یہ اجلاس راجستھان کے دارالسلطنت جے پور میں منعقد ہو رہا ہے، یہاں کے موقر دینی ادارہ جامعہ ہدایت کی طرف سے اس اجلاس کے منعقد کرنے کی پیشکش کی گئی تھی، یہ ان کی طرف سے بورڈ کی اہمیت اور اس کے کام کی افادیت محسوس کرنے کا اظہار ہے، ہم ان کی پیشکش کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور شکر گذار ہیں، خاص طور سے اس مؤقر دینی ادارہ کے سربراہ مولانا فضل الرحیم مجددی کے، جن کا یہ تقاضا تھا کہ بورڈ کا یہ اجلاس ان کے شہر میں منعقد ہو، ان کی شخصیت اس پورے علاقے کے مسلمانوں کی ایک سربراہ کی شخصیت ہے، ان کے والد مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی رحمۃ اللہ علیہ شیخ طریقت اور بڑی بزرگ شخصیت رہے ہیں، ان کی دینی سرپرستی سے اس علاقہ کو بڑا فائدہ پہنچا، اور یہ شہر دینی، ثقافتی اور ملی حیثیت سے بھی اپنی ایک شہرت رکھتا ہے۔

حضرات! اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فضل وکرم ہے کہ باوجود اس کے کہ یہاں مسلمان

اقلیت میں ہیں، لیکن ان کی تعداد مسلمانوں کے اکثریتی آبادی کے اکثر ملکوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے، ہمارا یہ ملک جائے وقوع کے لحاظ سے مرکز اسلام سے خاصے فاصلہ پر ہے، جس کی وجہ سے اس کو اپنے پیش آمدہ مسائل میں عموماً اپنے یہاں کے علماء اور اہل فکر سے ہی مدد لینا ہوتی ہے، ان کے پیش آمدہ مسائل کا ایک حصہ تو اسی طرح کا ہوتا ہے، جیسا کہ مسلم اکثریتی ممالک میں ہوتا ہے، لیکن ان کے اقلیت میں ہونے کی صورت میں ان کو مزید حالات ومسائل سے سابقہ پڑتا ہے، جن کا تعلق مقامی صورت حال سے ہوتا ہے، یہاں کے مسلمانوں کے اسلاف نے سابق زمانے میں ملی مسائل کے ان دونوں طرح کے پہلوؤں میں ایسی فکر و توجہ رکھی کہ اس کے نتیجہ میں یہاں کے مسلمانوں کے اہل علم افراد میں اپنے مسائل کو صحیح ڈھنگ سے حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، اس صلاحیت کی بناء پر مسلمانوں کا اہل علم ودانش طبقہ حالات پر ضرورت کے مطابق نظر رکھتا ہے، اور ان کے لیے مناسب حل نکالتا ہے۔

ہمارے کچھ ملی مسائل ایسے بھی سامنے آتے ہیں کہ ان کی فکر اگر بروقت نہ کی جائے، اور ان کے لیے ضروری بندوبست نہ کیا جائے تو وقت گذرنے پر ان کے حل میں بہت دشواری پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے ان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اہل بصیرت ان کو بروقت محسوس کریں اور ان کا حل نکالیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقتی حالات سے پیدا ہوتے ہیں، اور وقت کے گذرنے کے ساتھ وہ ختم بھی ہو جاتے ہیں، ان کی اس حیثیت کا اندازہ ہونے پر ان پر ایسی نظر رکھی جائے تاکہ وہ وقت گذرنے پر خود ختم ہو جائیں، اس کے لیے حکمت اور حسن بصیرت سے کام لینا ہوگا، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وقت کے گذرنے پر وہ مسائل اور پیچیدہ ہو جائیں۔

آج اس ملک کو آزاد ہوئے سرسٹھ سال ہو چکے ہیں، ہندوستان اپنی اس سرسٹھ سالہ مدت میں آزادی کے آغاز کے مرحلہ سے گذر کر جوانی کے مرحلہ تک پہنچ چکا ہے، ہندو مسلم تعلقات کے نشیب وفراز کے لحاظ سے یہاں کے مسلمان بھی اکثریت واقلیت کے تعلقات کے لحاظ

سے مختلف مراحل سے گذر چکے ہیں، بلکہ گذر رہے ہیں، جس میں شریعت اسلامی کے تحفظ اور ملت کے بقاء وحفاظت کے مراحل شامل ہیں، اس دوران ان کو مختلف معاملات کا سامنا رہا ہے، الحمدللہ ملت کے قیادی سطح کے افراد نے اس سلسلہ میں پیش آمدہ تقاضوں کو خوبی کے ساتھ انجام دیا، جس کے اثر سے یہاں ملت اسلامیہ اپنی ملی زندگی میں خودداری کے ساتھ قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو دین عطا ہوا ہے، وہ دین نہایت جامع اور زندگی کے مختلف مراحل میں رہنمائی کرنے والا اور دائمی حیثیت کا حامل ہے، اس کو وقت کے بدلنے سے دین وملت کے بقاء وتحفظ کے تقاضوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی، اس دین میں ایسی جامعیت ہے کہ وہ وقت کے بدلنے پر بھی پوری رہنمائی کرتا ہے، اس دین میں جامعیت کے ساتھ عالمیت کی بھی صفت ہے، وہ ملکوں اور علاقوں کے فرق سے بھی تبدیلی کا محتاج نہیں ہوتا، اسلام کی اس پختہ اور جامع خصوصیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے ملی مسائل میں حسب ضرورت پوری مدد پہونچائی، پروردگار عالم نے ایک طرف تو اس دین کو دائمی اور جامع بنایا، دوسری طرف وہ برابر اس امت کے پیش آمدہ حالات پر نظر رکھتا ہے، اور مدد کرتا ہے، لیکن اس کے لیے وہ مسلمانوں کو اپنے دین کی رہنمائی میں اپنی عقل ودانش کو استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس کی مدد اس کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے، اس کی مدد کے حصول کے لیے مسلمانوں کو زندگی کے تین پہلوؤں کا اہتمام رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے رب کی ناپسندیدگی سے بچاتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے تغیرات اور ملکی حالات پر بصیرت کی نگاہ رکھیں، اور اس کے لیے شریعت اسلامی نے جو رہنمائی دی ہے، اس سے کام لیں۔ تیسرے یہ کہ اپنی اس خصوصیت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے قائدانہ امت کا مقام عطا کیا ہے، لہٰذا ان کا عمل ان کے اس مقام کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس کے لیے خاص طور پر دو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوسروں کو خیر وصلاح کی دعوت دینا، اور ان کو انسانیت کے اعلیٰ معیار کی طرف لانے کی کوشش کرنا ہے اور اس ملک میں اس

بات کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے کہ یہاں کی اکثریت اسلام کی اعلیٰ خصوصیات سے ناواقف ہے، اس کو کم از کم اسلام کی جو مفید انسانیت خصوصیات ہیں، ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، اس ضرورت کو اگر مسلمان پورا کرتے ہیں، تو اس امت کو اکثریت کی طرف سے جو منافرت کا سامنا ہے، وہ خود بخود دور ہو جائے گی۔

ملت اسلامیہ کو اس ملک میں اپنے بقاو تحفظ کی جو ضرورت فی الوقت محسوس ہوتی ہے، وہ دراصل ان کے اپنے مذکورہ فریضہ میں کوتاہی کرنے کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے اس کو اپنے بقا اور تحفظ کے مسائل سے وقتاً فوقتاً سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اپنی اس ضرورت کے لیے وحدت اور حکمت عملی کی جو صورت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی شکل میں اپنائی ہے، وہ الحمدللہ شریعت اسلامی کے تحفظ کے سلسلہ میں خطرہ بننے والے رجحانات کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے، اس ادارہ کو تقریباً پینتالیس ۴۵ سال کی مدت ہو رہی ہے، جو نصف صدی کے قریب پہنچ گئی ہے، اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے فال نیک ہے کہ وہ اس کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے افراد کو پابند شریعت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ملک آزادی کے بعد پیش آنے والے کئی مرحلوں سے گذر کر اس وقت جس مرحلہ میں داخل ہوا ہے، اور اس کے اصحاب اقتدار ملک کو کچھ مختلف رخ پر لے جانے کا عزم رکھتے ہیں، ملت اسلامیہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اصحاب اقتدار کے اس رخ کو خصوصی طور پر سمجھنا اور اس کے لیے مناسب حل طے کرنا ہے، اس کے لیے ہمارے قائدین کو اظہار عزم اور جوش عمل جمہوری اور دستوری طریقہ کار کے مطابق عمل میں لانا ہے، اور تا حال انہوں نے اس طریقہ سے متعدد مسائل حل کئے ہیں، اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہی طریقہ فائدہ مند ہوگا۔

ہم کو یہ بھی پیش نظر رکھنا ہے کہ ملک کی پالیسی میں کوئی بڑی تبدیلی لانے کے سلسلہ میں کسی بھی اصحاب اقتدار کے پیش نظر منصوبے جو بھی ہوں، ملک کے متفرق مذاہب اور کلچر کو

مشترک دائرہ میں رکھتے ہوئے ہی حل کیا جاسکتا ہے،اورمزید یہ کہ وہ بین الاقوامی حالات کے اثرات سے پوری طرح باہرنہیں ہوسکتے ،اس صورتحال کوسامنے رکھتے ہوئے بھی ہم کو حالات پرنظررکھنا ہے،اورکسی قابل توجہ مسئلہ کے پیش آنے پرجس اقدام کی ضرورت محسوس ہو،اس کوحکمت عملی اور دوراندیشی کے ساتھ اختیارکرنا ہے،اقتدار کی باگ دوڑ جن ہاتھوں میں ہو،ان کے سامنے یہ بات واضح کرنا ہے کہ دستوری بنیاد پرمسلمانوں کا جوشہری حق ہے،ان کو جمہوری اور دستوری بنیاد پراس کی ادائیگی کرنا ہے، دستور کے لحاظ سے سارے شہریوں کے مذہبی وشہری زندگی کے حقوق کی ادائیگی اصحاب اقتدار پر لازم ہے،مسلمان بحیثیت اس ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے اپنے مذہبی حقوق حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے،اصحاب اقتدار کی طرف سے منصفانہ اور برادرانہ طریقہ سے ان حقوق کی ادائیگی انجام پاجائے ،تو آپس کی محبت اور رواداری بڑھے گی، اور ملک کی یکجہتی کو فائدہ پہونچے گا،اوراس میں ملک کا فائدہ بھی ہے کہ اتنی بڑی اقلیت جوملک کی آبادی کا پانچواں حصہ ہونے کے لحاظ سے بیس کروڑ سے کم نہیں،اتنی بڑی تعداد کا تعاون اوران کی شرکت خوش دلی کے ساتھ نہ ہوتو ملک صحیح طور پرکوئی ترقی نہیں کرسکتا،اس لیے اکثریت واقلیت کے درمیان جوہم وطنی کا برادرانہ تعلق ہے،اس کی بناء پر جوحقوق بنتے ہیں،ان کی ادائیگی ملک کے اصحاب اقتدار پر پوری طرح عائد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ ہم مسلمانوں کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ اپنی زندگی کواسلامی شریعت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے ذریعہ اورزندگی کے جوانسانی تقاضے ہیں ان کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کوخیرامت ہونے کے بلند مقام پر لائیں،اورمؤثر کردار پیش کریں،جس سے دوسروں کی نظر میں ان کی خوبی عیاں ہواوران کوتحفظ وحق شہریت کے سلسلہ میں کوئی دشواری پیش آئے تو دستوراورشہری آزادی کے حق کے حوالے سے جومناسب کوشش ہو،اس کواختیار کرکے مسئلہ کوحل کریں۔

حضرات!اس ملک کے دستور نے ہم کواپنے مذہبی احکام پرعمل کرنے کے سلسلہ میں جوحق دیا ہے،اس حق کی بقاء کی فکرکا بنیادی کام بورڈ نے اپنے ذمہ لیا ہے،اوراس سلسلہ میں اس کومسلمانوں کے تمام فرقوں اورملی جماعتوں کی شرکت اوران کا تعاون حاصل ہے،تحفظ شریعت کے معاملات کے علاوہ دیگرملی معاملات کی فکرمسلمانوں کے دیگر جماعتوں اور اداروں میں تقسیم ہے، یہ مسائل و معاملات مختلف اقسام کے ہیں، وہ سیاسی بھی ہیں اقتصادی بھی، تعلیمی بھی ہیں اور ثقافتی بھی، اورملکی معاملات سے بھی تعلق رکھتے ہیں، ان مسائل کی فکراورکوشش کے سلسلے میں مسلمانوں کی متعدد جماعتیں اپنا اپنا فریضہ انجام دے رہی ہیں، بورڈان کی اہمیت کوسمجھتا ہے،اوران کے کام کوقدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے،اورکسی اہم معاملہ میں خصوصی طور پرتعاون کی ضرورت پڑجائے تو وہ تعاون بھی دیتا ہے۔

حضرات! تحفظ شریعت کے دائرہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جوذمہ داری سنبھالی ہے، اس میں دستور کی رو سے احکام دینیہ پرعمل کرنے کے سلسلہ میں کسی بھی رکاوٹ کے پیدا کئے جانے پراس کے ازالہ کا قانونی کام ہے،اس کے ساتھ خودمسلمانوں کودینی احکام پرعمل کرنے کی تلقین کرنا جواصلاح معاشرہ کے عنوان سے زیرعمل ہے، نیز اس ملک میں مختلف مذاہب والے قانون داں ہیں،ان سے مذہبی امور کے سلسلہ میں قانونی کام پڑتا ہے،لہٰذا تفہیم شریعت کا کام بھی اختیارکیا گیا ہے۔

بورڈ نے اپنے ذمہ یہ جوکام لیے ہیں وہ اس ملک میں جہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ کی دوریاں بہت ہیں،اورملک کی آبادی بہت پھیلی ہوئی ہے،اس کی وجہ سے کام بھی بہت پھیلا ہوا ہے،اس کے لیے جتنا عملہ چاہئے اور جتنے مصارف کی ضرورت ہے، وہ اس کومہیا نہیں ہے، بورڈ عام طور پر رضا کارانہ کوششوں پر چلتا ہے،اور رضا کارانہ کام پرتوجہ کرنے والے کم ہوتے ہیں۔

بورڈ چوں کہ سب جماعتوں اورمسلکوں کا نمائندہ ادارہ ہے،لہذا ضرورت ہے کہ اس

کے اختیار کردہ کام کو مسلمانوں کی ملی جماعتوں کی طرف سے حسب ضرورت تعاون بھی ملتا رہے، اور یہ ان جماعتوں کے لیے مشکل نہیں، خاص طور پر اصلاح معاشرہ کا کام بڑی وسعت رکھتا ہے، ملک کی وسعت اور کام کی وسعت دونوں کو دیکھتے ہوئے دیگر تنظیموں کی طرف سے تعاون کی ضرورت ہے، اس صورت میں بورڈ کی طرف سے اختیار کردہ کام کی ادائیگی میں جو کمی محسوس کی جاتی ہے، وہ خاصی حد تک دور ہو سکے گی، اصلاح معاشرہ کا کام بہت اہمیت اور ضرورت رکھتا ہے، اس کی بعض خرابیاں بہت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک موقع پر سماج کو گن گھانے والی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

''ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے، اور ملی واجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بہت وسیع اور دور رس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا، اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں، اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر و فاقہ، اضطرار واضطراب اور ان افسوس ناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم از کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ یہ صورتحال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعدیل ذات اور ربوبیت اور رحمت عامہ صفات کے لیے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول اور زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا اور برہنہ تن شریف مرد وعورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولہے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں ہزاروں لاکھوں روپیہ بے دریغ خرچ کئے جائیں؟''

مسلمانوں کی آبادی جس تعداد میں اور ملک کے ہر جہت میں جس طرح پھیلی ہوئی ہے، اس کو خیر امت ثابت کرنے کا کام بہت اہم ہے، اس کام کی ادائیگی کے لیے بڑی توجہ

اور افراد کی ضرورت ہے، یہ مسلمانوں کا ذاتی اور سب کا مشترک مسئلہ ہے، لہٰذا مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے پروگرام میں اس کا حصہ ہونا چاہئے۔

حضرات! ہمارا یہ اجلاس ملک کے خاص حالات میں منعقد ہو رہا ہے، وہ ان حالات کے تناظر میں غور کرے گا، اور لائحہ عمل طے کرے گا، تمام ارکان بورڈ سے ملت کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے پورے تعاون کے ملنے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ کی جانے والی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ ہی ہماری اصل طاقت ہے، اور وہی ہماری کامیابی کی کلید ہے۔

بورڈ کے سابق ذمہ داران حضرات جن کی فکر وتوجہ سے بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، اور ان کی یہ فکر وتوجہ بورڈ کے کارگذاروں کے لیے رہنما بنی، وہ بورڈ کے کاموں پر رہنمائی کا ذریعہ بنتی رہے گی، حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اپنی ذمہ داری کی مدت میں بورڈ کو اس کی معیاری راہ عمل پر ڈال گئے، اس کے گرامی قدر موجودہ نائبین صدر اور جنرل سکریٹری مولانا نظام الدین صاحب، ان کے نائبین مولانا سید محمد ولی رحمانی، جناب عبدالرحیم قریشی، جناب عبدالستار شیخ، اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، بورڈ کے خازن جناب ریاض عمر صاحب اور مختلف کمیٹیوں کے کنوینر حضرات کے ذریعہ بورڈ اسی راہ پر گامزن ہے، اور ان سب لوگوں کا تعاون بورڈ کی تقویت کا باعث ہے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ بورڈ اس کی مدد سے اپنی قیمتی خدمات انجام دیتا رہے، اور اللہ کی مدد ہی تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین.

☆☆

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
(علامہ اقبالؒ)

مسلم پرسنل لاء اسلامی تشخص کی بنیاد

ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رسائل

امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

(۱) مسلم پرسنل لاء: بحث ونظر کے چند گوشے

(۲) یونیفارم سول کوڈ

(۳) متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء- ایک جائزہ

مسلم پرسنل لا
بحث ونظر کے چند گوشے

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟

انسانی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس کی شخصی اور خاندانی زندگی ہے، جس کا دائرہ محدود ہے، اس میں انسان کے ذاتی معاملات آتے ہیں یا پھر وہ چیزیں ہیں جو اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان معاملات اور حقوق وفرائض سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً ازدواجی تعلق، ماں باپ اور اولاد کا تعلق، وراثت، ایک دوسرے پر نفقہ اور حق پرورش وغیرہ۔ اس زندگی کو ہم شخصی اور خاندانی زندگی (Personal & Family life) کا عنوان دیتے ہیں، دوسری زندگی شہری اور اجتماعی زندگی ہے جس کا دائرہ خاندانی تعلقات کے حدود سے آگے بڑھ کر شہر، ملک اور بین الاقوامی امور تک کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے، اسے ہم اجتماعی اور شہری زندگی کا نام دیتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کے ہر گوشہ کے لئے (خواہ اس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہو، یا انفرادی زندگی سے) اصول بتائے ہیں جن پر حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا ہے۔

قرآن پاک کی تعلیمات، حضور اکرم ﷺ کی ہدایتوں اور صحابہ کرامؓ کی تشریحات کی روشنی میں فقہائے اسلام نے زندگی کے تمام گوشوں کے لئے قوانین مرتب کر دئے ہیں،

جنہیں اصطلاح میں ہم ''فقہ'' کہتے ہیں — یہ پوری ''فقہ'' قرآن وحدیث کی بنیادوں پر مرتب ہوئی ہے۔اور جس طرح انفرادی زندگی کے قوانین پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے، اسی طرح ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اجتماعی زندگی کے قوانین پر بھی عمل کریں۔

لیکن ہوا یہ کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور مسلم حکومتوں میں شخصی رجحان اور خدا کے حکم کے بجائے بادشاہ کی خواہش کے احترام کا جذبہ آتا گیا، اجتماعی قوانین جن کی روشنی میں حکومت چلائی جاتی تھی، عملاً ختم ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ اسلام کے بہت سے اجتماعی قوانین کتابوں میں محفوظ ہوتے چلے گئے اور عملی زندگی سے اس کا واسطہ کم ہوتا گیا۔

ہندوستان میں جب انگریزوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے حکومت چلانے کے لئے اپنا قانون نافذ کیا، جس کے نتیجہ میں اسلام کا ''اجتماعی قانون زندگی'' غیر متحرک ہوکر محض کتابوں میں رہ گیا اور صرف ''انفرادی زندگی'' کے قوانین عملا باقی رہ گئے جس کے نفاذ کے لئے حسب سابق قاضی مقرر ہوئے بعد میں یہ قضاء کا نظام بھی ختم ہوگیا اور شخصی وعائلی زندگی سے متعلق اسلامی قوانین کے نفاذ کا اختیار بھی عام سرکاری عدالتوں کے حوالہ کردیا گیا — انفرادی زندگی کے یہ اسلامی قوانین جنہیں برطانوی حکومت نے اپنے قانون میں جگہ دی، ''مسلم پرسنل لا'' کہلائے — اور ''مسلم پرسنل لا'' کا دائرہ صرف وراثت، نکاح، حضانت، خلع وطلاق، فسخ، مہر، نفقہ، اور اوقاف وغیرہ تک محدود رکھا گیا — گویا ''مسلم پرسنل لا'' کی اصطلاح انگریزوں کا عطیہ ہے جو انفرادی اور خاندانی زندگی سے متعلق قوانین کا ایک حصہ ہے — یہی ہے ''مسلم پرسنل لا'' اب تک چلا آرہا ہے۔ یہ گفتگو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ ''مسلم پرسنل لا'' قوانین اسلامی کا ہی ایک حصہ ہے جن کی تفصیلات فقہاء اسلام کے ہاتھوں مرتب ہوئی تھیں، اور جن کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے۔

نئے مسائل اور ان کا حل

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ''مسلم پرسنل لا'' دراصل شرع اسلامی کے ایک خاص حصہ

کا نام ہے، جو مسلمانوں کی شخصی وعائلی زندگی پر نافذ ہے تو اب اس کا کتنا اور کہاں تک امکان باقی ہے کہ موجودہ دور کے علماء اس میں تبدیلی لائیں اور اسے بدل کر کوئی ایسا ''پرسنل لا'' مرتب کریں جو ایک خاص قسم کے دانشور طبقہ کے مزاج کے موافق ہو، اس طرح کی تبدیلی حکومت کی خواہش کے مطابق تو ہوسکتی ہے، اسلام کے دستور کے مطابق نہیں ہوسکتی۔

یہ صحیح ہے کہ جدید ترقی نے معاشرہ کو بالکل نئی صورت حال سے دوچار کردیا ہے۔ یہ نئی صورت حال یقیناً اسلامی ہدایت کا طلب گار ہے، علماء کو نئے مسائل کا اسلامی حل دریافت کرنا ہوگا اور ان نئے سوالات کا جواب دینا ہوگا جن پر فقہ کی قدیم کتابوں میں بحث نہیں کی گئی ہے لیکن ایک تو یہ کہ ایسے مسائل بہت زیادہ نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ ایسے مسائل کی تعداد جتنی بھی ہو، ان کا حل حکومت کی متعین کردہ راہوں پر تلاش نہیں کیا جاسکتا، نہ ان معاملات میں مخصوص قسم کے دانشوروں کے مزاج کو بنیادی حیثیت دی جاسکتی ہے، بلکہ ان کے لئے وہی طریقہ اپنانا ہوگا جو طریقہ کار ماضی میں علماء کرام نے نئے نئے مسائل کے حل کے لئے اختیار کیا تھا، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کو بنیادی حیثیت دینا ہوگی، اصول فقہ کو سامنے رکھنا ہوگا، اور فقہ اسلامی کے عظیم خزانہ سے مدد لینی ہوگی، اس طرح نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور اسلام ان کا حل بھی پیش کرتا رہے گا۔(۱)

کیا حکومت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی چاہتی ہے؟

حالات اور واقعات کی جو ترتیب ادھر چند برسوں میں سامنے آئی ہے، انہیں دیکھتے ہوئے حکومت کے ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا اور اس ملک کا دستور بنا تو اس ملک کو ایک ''جمہوری ملک''

(۱) اس موضوع سے واقفیت کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل''۔

بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس میں فرد کے ذاتی رجحانات، افکار وعقائد، مذہب وثقافت اور تہذیب وتمدن کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ایک عنوان ''سیکولرزم'' کا اختیار کیا گیا جس کی وضاحت یہ کی گئی کہ ہندوستان کا نظام حکومت کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوگا، اور ہر شہری کو اپنے طور پر مذہبی امور میں آزادی حاصل رہے گی۔ اس طرح ایک مذہب کے ذریعہ دوسرے مذہب کا استحصال نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک خوش آئند تصور تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستان کے جمہوری نظام حکومت کے تحت سکون کی زندگی گذاریں گے، لیکن ارباب سیاست نے اب ''سیکولرزم'' کا مطلب ''رواداری'' اور ''غیر مذہبی'' کے بجائے ''مذہب کی نفی'' طے کر کے ایسے معاشرہ کے قیام کی جدوجہد شروع کر دی ہے جس میں مذہب کے اثرات ختم ہو جائیں۔

یہی ذہنیت مسلم پرسنل لا کی جگہ ''یکساں شہری قانون'' (Uniform Civil Code) نافذ کرانا چاہتی ہے..... اور اس سلسلہ میں دستور ہند کے رہنمائے اصول (Directive Principal) کی دفعہ ۴۴ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ''ہندوستان میں یکساں شہری قانون نافذ کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ جس وقت دستور ہند بنا تھا، رہنما اصول کی یہ دفعہ زیر بحث آئی تھی اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں — یہ ساری بحث دستور ساز اسمبلی کی پروسیڈنگ میں موجود ہے!

عدالتیں اب بھی رہنما اصولوں کے مقابلہ میں بنیادی حقوق کو زیادہ اہمیت دیتی رہی ہیں لیکن سیاسی رہنما مختلف عوامل کی وجہ سے رہنما اصولوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان رہنما اصولوں کے سہارے ''مسلم پرسنل لا'' میں ترمیم وتنسیخ کا مطالبہ کبھی واضح اور کبھی مبہم الفاظ میں کیا کرتے ہیں۔

حکومت نے اب تک براہِ راست تو نہیں لیکن بعض عمومی قوانین کے ذریعہ ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی کی کوشش کی ہے اور کچھ ایسے احکام اور ہدایتیں جاری کی جا چکی ہیں جن کے باعث ملک میں مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ ''مسلم پرسنل لا'' پر عمل نہیں کر سکتا — مثلاً یہ حکم جاری کیا گیا کہ حکومت کا کوئی ملازم اجازت حاصل کئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا، اس حکم سے مسلمان مستثنیٰ نہیں ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تعدد ازدواج جو ''مسلم پرسنل لا'' کا اہم مسئلہ ہے، کو حکومت نے مسلمانوں کے ایک حلقہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا، اور اب آسانی کے ساتھ اس حلقہ کو وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اس حکم کو فیکٹریوں، مختلف قسم کے نیم سرکاری اداروں اور دوسرے سیکٹروں میں کام کرنے والوں پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلہ کا ایک اہم قدم متبنّیٰ بل (Adoption of Children Bill) کی شکل میں اٹھایا گیا (۱) کوشش کی گئی کہ مساوی قانون سازی کے ذریعہ عہد جاہلیت کی ایک

(۱) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس ''بل'' کے خلاف آواز بلند کی جس کا اثر حکومت پر ہوا، اور حکومت نے اس بل کے متعلق رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے اسے پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے حوالہ کر دیا، بورڈ نے متبنّیٰ بل کے سلسلے میں عام مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے واقف کرانے کے لئے اردو اور انگریزی میں رسالے شائع کئے، اخبارات میں مضامین لکھوائے، بورڈ کے معزز ارکان نے جلسوں اور تقریروں میں اسے موضوع بحث بنایا، اور جب پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی نے ملک کا دورہ کر کے رائے عامہ جاننے کی کوشش کی تو بورڈ کے ارکان اور پڑھے لکھے مسلمانوں نے ہر مقام پر اس بل کے خلاف شہادت دی، پارلیمنٹ کی کسی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے کبھی اتنے زیادہ افراد نے اتنے واضح اور مدلل طور پر شہادت نہیں دی تھی۔ مسلمانوں کی اتنی واضح رائے سامنے آنے کے باوجود اس کمیٹی کی نہ فراموش کی جانے والی زیادتی ہے کہ اس نے اس بل کی حمایت میں اپنی رائے دی۔ کمیٹی کے تین مسلم ممبران نے مشترکہ طور پر بل کے خلاف نوٹ لکھا اور یہ مطالبہ کیا کہ اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے، حکومت نے مسلمانوں کی رائے عامہ کے پیش نظر ''بل'' کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ ۱۹۷۸ء میں یہ بل پھر راجیہ سبھا میں آیا، اس وقت وزیر قانون مسٹر شانتی بھوشن نے یہ اعلان کیا کہ ''یہ بل مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

غلط رسم کو زندہ کیا جائے، اور اسلامی قانون وراثت اور قانون نکاح کو مجروح کیا جائے۔(۱)

اس بل میں تبنیت کو اختیاری اور انفرادی فعل قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے بظاہر اس کا ٹکراؤ ''مسلم پرسنل لا'' سے نہیں معلوم ہوتا، لیکن اس کے اثرات بہت دوررس تھے، جس کی وضاحت خود وزیر قانون نے پارلیمنٹ میں ان الفاظ میں کی تھی ''یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کی طرف مضبوط قدم ہے''۔

اس طرح کے اقدامات ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں حکومت کے ذمہ داروں اور سیاسی رہنماؤں کی نیت صاف نہیں رہی ہے، اور مفکرین قانون یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔(۲)

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ جیسا بھی ہو، بہر حال غیر اسلامی ہوگا(۳) خدانخواستہ اگر یکساں سول کوڈ لایا گیا تو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی بڑی الجھنوں میں مبتلا ہوجائے گی اور بہت سے معاملوں میں ہمیں قانون کے ذریعہ مجبور کیا جائے گا کہ ہم جائز چیزوں کو چھوڑ دیں اور حرام

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس لئے ''بل'' کو واپس لیا جاتا ہے'' اس طرح ایک غیر اسلامی قانون سے مسلمان محفوظ رہے۔ متبنّٰی بل کے سلسلہ میں بورڈ کی یہ دوسری کامیابی تھی۔ اب پھر چند نام نہاد مصلحین اور ''بچوں کے ہمدردوں'' کی طرف سے یہ کوشش ہورہی ہے کہ بل دوبارہ پیش کیا جائے۔

(۱) تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''متبنّٰی بل ۱۹۷۲ء-ایک جائزہ''۔

(۲) مزید واقفیت کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلہ میں''۔

(۳) یہاں اس منطقی امکان سے بحث نہیں کہ اگر اسلامی قوانین شخصی کو ملک کے تمام باشندوں پر نافذ کردیا جائے تو یکساں سول کوڈ کے باوجود ''مسلم پرسنل لا'' پورے پورے طور پر باقی رہ جائے گا۔ کیوں کہ یہاں ایسے کسی اقدام کی عملاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے جذبات بھی اس سے مجروح ہوں گے اور اس طرح کی شخصی اور عائلی زندگی میں مداخلت شریعت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

کو قبول کرلیں(۱)۔

ہندوستان کے قانون سازوں کا ذہن مغربی سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے اور قانون بناتے وقت ان کے سامنے کسی مغربی ملک کا کوئی نہ کوئی قانون رہا کرتا ہے، اس لئے یکساں سول کوڈ پورے طور پر مغربی طرز کا ہوگا، جس کی ایک مثال ''ہندو کوڈ'' ہے، میرا خیال ہے کہ اگر حکومت نے یہاں یکساں سول کوڈ بنایا تو وہ موجودہ ہندو کوڈ کو یونیفارم سول کوڈ کا نام دے گی، اسے تھوڑی بہت ظاہری تبدیلی کے ساتھ سول کوڈ بنا دیا جائے گا۔ ہندو کوڈ کی بنیاد ہندو مذہب کی تعلیمات نہیں بلکہ مغربی نظریات ہیں، مثلاً ہندو کوڈ کی رو سے شادی کے بعد تین سال تک میاں و بیوی میں علیحدگی کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور دونوں میں سے کوئی اگر علیحدگی چاہے تو اسے شادی کے بعد کم سے کم تین سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہندو کوڈ نے طلاق کا اختیار بھی مردوں سے ختم کردیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ مرد اور عورت میں سے جو بھی علیحدگی چاہے عدالت میں درخواست دے، عدالت اگر علیحدگی کے مطالبہ کو درست سمجھے گی تو علیحدگی کرادے گی۔ یہ سسٹم خدا کے بتائے ہوئے قانون سے صاف طور پر ٹکراتا ہے۔ شریعت (مسلم پرسنل لا) نے اس کا پابند نہیں کیا ہے کہ نباہ ہورہا ہو یا نہیں، بہر حال تین سال تک میاں و بیوی ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہیں، شریعت نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، خلع اور فسخ کا حق عورت کے لئے مخصوص کیا ہے اس لئے اس طرح کے قوانین ایک مسلمان کی عائلی زندگی کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔

ہندو کوڈ میں وراثت کے متعلق بھی دفعات موجود ہیں۔ یہ دفعات بھی اسلام کے قانون وراثت سے ٹکراتی ہیں۔ مثلاً ہندو کوڈ نے ماں، بیوی، بیٹا اور بیٹی کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ اگر مرنے والے کے یہ چاروں وارث موجود ہوں تو جائداد برابر برابر تقسیم کی جائے گی اور سبھوں کو برابر حصہ ملے گا۔ جب کہ اسلام نے ان چاروں کے لئے چار الگ درجات متعین کئے

(۱) تفصیلی واقفیت کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''یونیفارم سول کوڈ'' شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

ہیں اور ہر ایک کے حصہ کی مقدار بتادی ہے.....اس طرح ہندو کوڈ کا وہ پورا حصہ جو میراث سے متعلق ہے اسلام کے قانون میراث سے بالکل الگ ہے۔ بہت سے وہ لوگ جو اسلامی قانون کے لحاظ سے حقدار یا زیادہ کے حقدار ہوا کرتے ہیں ہندو کوڈ کی نظر میں ان کا حصہ کم ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اور بہت سے وہ لوگ جو اسلامی قانون کے لحاظ سے کم کے مستحق ہیں یا جنہیں کچھ نہیں ملنا چاہئے وہ ہندو کوڈ کے مطابق زیادہ پاسکتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس طور پر کچھ لوگوں کی حق تلفی اور کچھ لوگوں کو بیجا نفع پہنچتا ہے جو غلط ہے۔(۱)

دونوں قوانین کے درمیان جو فرق ہے اس کی یہ چند مثالیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب سے برآمد کیا ہوا یہ ہندو کوڈ مسلم پرسنل لا سے بالکل الگ اور مخالف قانون ہے۔ یکساں سول کوڈ موجودہ ہندو کوڈ سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا اس لئے اگر مسلم پرسنل لا کی جگہ یکساں سول کوڈ نافذ کیا گیا، تو مسلمانوں کی عائلی زندگی کی پوری عمارت ڈھہ جائے گی۔

مسلم پرسنل لا اور مسلم ممالک

یہ بات بار بار دہرائی گئی کہ جب مسلم ممالک میں مسلم پرسنل لا کو ختم کیا جاسکتا ہے تو ہندوستان میں تبدیلی کیوں غلط ہوگی۔ خاص کر وہ لوگ جو ہر معاملے میں پاکستان کے نام سے بدکتے ہیں، اس معاملہ میں پاکستان کی دہائی دے کر ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستانی

(۱) اسلامی تعلیمات کے جو عالمگیر اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں اور دستوروں میں وراثت کا نظام جاری کیا گیا ہے، اور مرنے والے کے مال کو خاندان کے مختلف افراد میں تقسیم کرنے کا تخیل ابھرا ہے، ہندوستان میں بھی ماضی میں تقسیم وراثت کا تخیل موجود نہیں تھا، اسلامی قانون کی افادیت اور تقسیم دولت کے اصول نے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن کو متاثر کیا، اور ان میں وراثت کے قانون کو مرتب کرنے کی تحریک ہوئی، لیکن جب انہوں نے قانون سازی کی تو اساتذہ مغرب کی نقالی کی، جب کہ خود مغرب میں یہ تخیل اسلامی ہدایات کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا، جسے اساتذہ مغرب نے اپنے انداز پر ڈھال لیا۔

مسلمانوں کی پیروی کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور حکومت پاکستان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

''مسلم پرسنل لا'' کی تنسیخ یا تبدیلی کی یہ دلیل بظاہر مضبوط معلوم ہوتی ہے، مگر اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جو قرآن وسنت کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، خواہ کہیں ہو رہا ہو، کسی ''مسلم اسٹیٹ'' کی غلط کارروائی ''اسلامی قانون'' نہیں کہلاسکتی ہے(۱) اور نہ اس بنیاد پر اسلامی قانون میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ جو چیز قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح ہے اسے ہی صحیح اور اسلام کے مطابق کہا جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلم ممالک میں ''پرسنل لا'' کی تبدیلی کا جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے وہ حقیقت سے دور ہے۔ عام طور پر مسلم ممالک میں ''مسلم پرسنل لا'' نافذ ہے اور وہاں کے لوگ شریعت کے مطابق اپنے عائلی مسائل حل کرتے ہیں۔ صرف چند ممالک ایسے ہیں جہاں تبدیلی ہوئی ہے۔ ماضی بعید میں تبدیلی کی اہم مثال ''ترکی'' ہے جہاں ۱۹۲۶ء میں نہ صرف ''مسلم پرسنل لا'' کو ختم کرکے انفرادی زندگی کے نظام کو درہم برہم کردیا گیا۔ انتہا یہ ہوئی کہ انگریزی لباس کو قانونی شکل دی گئی، عربی زبان کا استعمال ختم کردیا گیا اور اسلامی عبادتوں پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا اور لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ مذہب ومعاشرہ کے جانے پہچانے طریقوں سے الگ ہوجائیں۔ اس قسم کے باطل قوانین کی مخالفت کرنے والے سیکڑوں علماء شہید کردئے گئے اور توپوں کے سائے میں اسلامی قوانین کو مٹایا گیا۔ ترک علماء اور عوام نے اس طویل عرصہ میں کبھی بھی ان قوانین کو پسند نہیں کیا اور آخر کار ترکی حکومت قوانین بدلنے پر مجبور ہوئی اور آہستہ آہستہ ترکی حکومت پھر اسلام کے قریب آرہی ہے۔

ماضی قریب میں کچھ تبدیلیاں پاکستان میں لائی گئیں جس کا برابر ذکر خیر ہوتا ہے

(۱) جس طرح ''عوامی جمہوریہ چین'' میں جمہوریت کے نام پر جو کارروائی کی جاتی رہی ہے، انہیں دنیا کے جمہوری ممالک مشعل راہ نہیں سمجھتے اور نہ ''جمہوریہ ہندوستان'' انہیں قبول کرنے کو تیار ہے۔

پاکستان میں جو کچھ ہوا اس کی ہمیں خبر ہے اگر چہ وہاں کی تبدیلیوں کا زیادہ تر تعلق انتظامی امور سے ہے، لیکن یہ صحیح ہے کہ متعدد تبدیلیاں قانون شریعت کے خلاف ہوئی ہیں، اور نہ صرف ہم، بلکہ پاکستان کے لوگ بھی اسے غلط سمجھتے ہیں۔ جس وقت یہ تبدیلی لائی گئی وہاں کے علماء نے زبردست احتجاج کیا اور عوام نے علماء کا ساتھ دیا، مگر پاکستان کی فوجی حکومت نے احتجاج کرنے والوں کو جیل بھیج کر ''مسلم پرسنل لا'' کے کچھ حصوں کو بدل ڈالا۔ اگر ہندوستان کی حکومت پاکستان کو سامنے رکھ کر یا ترکی کو مثال بناتے ہوئے ''مسلم پرسنل لا'' کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی ان دونوں ملکوں کی طرح آمرانہ اور فوجی نظام اپنایا جارہا ہے۔

وہ لوگ جو اس مسئلہ میں بار بار پاکستان کا نام لیتے ہیں، ان کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ پاکستان کی فوجی حکومت کا طرز عمل ہندوستان کی حکومت کے لئے دلیل فراہم کرسکتا ہے، تو پھر پاکستان کی جمہوری حکومت کا طرز عمل اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ ہندوستان کی جمہوری حکومت اسے اپنائے..... پاکستان کے صوبہ سرحد میں چند ہدایتیں دی گئی تھیں۔ مثلاً زنا کرنے والوں اور شراب پینے والوں کو سزا، نائٹ کلبوں اور ڈانس پر پابندی، رمضان المبارک کا احترام، عملہ کے لئے نماز کی پابندی، عورتوں کو چست اور جاذب نظر لباس پہن کر نکلنے کی ممانعت اور اسی انداز کی کچھ تبدیلیاں، جو پاکستان کے ایک صوبہ میں لائی گئیں، کیا پاکستان کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دینے والے اس نقش کو بھی اپنانے کا مشورہ دیں گے؟ اور ان کی یہ کوشش ہوگی کہ ہندوستان یا اس کے کسی صوبہ میں ایسی ہدایتیں دی جائیں؟

ایک چیز اور بھی لائق توجہ ہے..... مسلم ممالک نے پرسنل لا میں تبدیلی کی ہے یا نہیں؟ اور کی ہے تو کس طرح کی اور کس حد تک؟ اس بحث میں پڑنے سے پہلے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ مسلم ممالک نے اپنے ملک میں آباد مذہبی اقلیتوں کے دینی امور میں کوئی مداخلت کی

ہے یا نہیں؟ اس کا جائزہ لیا جائے۔ ہندوستانی مسلمان مذہبی اقلیت ہیں، اس لئے مذہبی امور میں اگر مسلم ممالک کی کوئی مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے تو اس کے لئے سب سے بہترین ان ممالک کی اقلیتی صورت حال ہوسکتی ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی بھی مسلم ملک نے اپنے یہاں کی مذہبی اقلیت کے دینی اُمور میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی ہے، نہ پرسنل لا کو ہاتھ لگایا ہے۔ ایسے بھی مسلم ممالک ہیں جن کے پڑوس میں دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی حکومت ہے اور دونوں میں ایسے شدید ترین اختلافات بھی موجود ہیں جن کی تہ میں کسی نہ کسی درجہ میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما ہے۔ لیکن اس ملک میں پڑوسی ملک کے ہم مذہب، اقلیت کی شکل میں آباد ہیں اور وہ اپنی دینی زندگی اور پرسنل لا کو محفوظ سمجھتے ہیں اور اس پر آزادی کے ساتھ عمل کرتے ہیں..... مصر میں یہودیوں کی مذہبی آزادی اس کی واضح مثال ہے!

معاشرتی دشواریاں

کہا جاتا ہے کہ ''مُسلم پرسنل لا'' پر عمل کرنے سے معاشرتی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، اور مسلم معاشرہ ان قوانین کی وجہ سے کراہ اُٹھتا ہے۔ خاص طریقہ پر طلاق اور تعدد ازدواج ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کی زندگی ہر وقت خطرات میں گھری رہتی ہے اور طلاق کی ننگی تلوار عورت کے سر پر لٹکتی رہتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم پرسنل لا کی رُو سے مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اور اسے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن یہ قانون کی خامی نہیں ہے نہ کوئی ایسا جُرم، جس کے تذکرہ سے فضا گونج جائے..... شریعت نے شوہر اور بیوی میں علیٰحدگی کی مختلف شکلیں بتائی ہیں، مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اور عورتوں کے لئے خلع اور فسخ نکاح کی راہ بتائی گئی ہے..... یہ صحیح ہے کہ مرد اپنے اس حق کا براہ راست استعمال کرسکتا ہے اور عورتیں اپنا حق

بالواسطہ استعمال کرتی ہیں۔ مرد اور عورت کے حقوق میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریوں کی نوعیت جُدا جُدا ہے، نکاح کے بعد مرد پر جتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، عورتوں پر اتنی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے۔ مرد پر بیوی اور بچوں کے اخراجات کے علاوہ مہر کی شکل میں ایک رقم بھی واجب ہوتی ہے۔ علیٰحدگی کا فیصلہ اگر بلاواسطہ عورتوں کے بھی حوالہ کیا جاتا تو عورتیں اپنے اس حق کو استعمال کرتیں جس کے نتیجہ میں عورتوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی مگر مہر کی رقم کی فوری ادائیگی اور بچوں کی کفالت اور تربیت کا نظم مرد کو کرنا پڑتا اور مرد بلاوجہ دشواریوں میں مبتلا ہوتا، اس لئے شریعت نے علیٰحدگی کا براہ راست اختیار مرد کو دیا تاکہ اپنے حق کو استعمال کرتے وقت وہ ان اخراجات اور دشواریوں کی فہرست کو بھی سامنے رکھے اور کمزور اسباب کی بنیاد پر یا بلاسبب بیوی کو علیٰحدہ نہ کرے۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ گرچہ طلاق کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے مگر اسے ''ابغض المباحات'' (جائز چیزوں میں سب سے زیادہ کریہہ) قرار دیا ہے اور یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ جب نباہ ہونے کی کوئی شکل باقی نہ رہے تو بہت سوچ سمجھ کر طلاق دینی چاہئے اور ایک ہی مرتبہ تین طلاق نہیں دینی چاہئے۔ شریعت نے تفصیل کے ساتھ طلاق کا طریقہ بتایا ہے، اس طریقہ پر عمل کرنے کے بعد اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مرد اشتعال کے نتیجے میں یا جذبات کی رو میں طلاق دیدے۔ شریعت کی ہدایت کے مطابق دی ہوئی طلاق ایک عاقلانہ اور ٹھنڈا فیصلہ ہی ہوسکتی ہے، وہ ایسی تلوار ہرگز نہیں ثابت ہوسکتی جو ہمیشہ عورت کے سر پر لٹکتی رہے لیکن اگر کوئی مرد، شریعت کی ان ہدایات کے باوجود وقتی اشتعال کے نتیجہ میں طلاق دیتا ہے تو یہ طلاق واقع ہوگی۔ ہم اسے قانون کی خرابی نہیں کہہ سکتے۔ یہ قانونی حق کا غلط استعمال ہے، اس غلط استعمال کو روکنے کیلئے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے نہ کہ قانون بدلنے کی!

شریعت نے عدل وانصاف کی شرط کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے اس

مسئلہ میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ شریعت نے عورتوں کے احساسات کی رعایت نہیں کی..... لیکن اگر عائلی زندگی کے پورے نظام کا جائزہ لیا جائے اور شریعت نے عصمت و عفت کی جیسی تعلیم دی اسے پیش نظر رکھا جائے تو یہ کوئی غیر منطقی چیز نظر نہیں آئے گی۔ مغرب نے دنیا کو جس معاشرہ سے روشناس کرایا ہے، اس میں عصمت وعفت جیسے الفاظ کی معنویت تلاش کرنا مشکل ہے اور اس معاشرہ کو سامنے رکھ کر تعدد ازدواج جیسے قانون کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن اسلامی معاشرہ کے پیش نظر اس قانون کی ضرورت پڑسکتی ہے اور مرد کے ایسے حالات ہوسکتے ہیں کہ وہ صاف ستھری زندگی گذارنے کیلئے دوسرے نکاح کی ضرورت محسوس کرے۔ (۱)

مسلم پرسنل لا اور دُوسرے ملکی قوانین

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ملکی قوانین بھی اسلام کا ایک حصہ ہیں اور وہ بھی مسلم پرسنل لا کی طرح قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ مثلاً زانی کو سنگسار کرنا یا کوڑے مارنا، چور کا ہاتھ کاٹنا، یا شراب پینے والے کو درے لگانا وغیرہ ملکی قوانین ہیں اور شریعت محمدیؐ کا اہم حصہ ہیں۔ آج یہ قوانین ہندوستان میں رائج نہیں ہیں۔ لیکن اس کے رائج نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علماء یا مسلمانوں نے اس تبدیلی کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا ہے، بلکہ یہ تبدیلی جبر واستبداد کی فضا اور ایسے شاہی نظام میں ہوئی تھی جس میں زبان کھولنا کھلے طور پر جرم تھا اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تبدیلی کے خلاف بھی علماء نے آوازیں بلند کی تھیں، لیکن یہ تبدیلی ان پر لادی گئی اور انہیں مجبوراً خاموش ہوجانا پڑا تھا۔ اور اب بھی پورے یقین کیساتھ کہتا ہوں کہ کسی بھی ملک کا معاشرہ صاف ستھرا اسی وقت ہوسکتا

(۱) ویسے حکومت ہند کے شائع کردہ اعداد وشمار کے لحاظ سے تعدد ازدواج کا تناسب مسلمانوں کے مقابلہ ہندوؤں میں زیادہ ہے۔

ہے جب اس کے قوانین، اسلامی احکام کی روشنی میں مرتب کئے جائیں یہ کوئی قدامت پسندی ہرگز نہیں، حقیقت پسندی ہے، انسان کو نہ قدامت پسند ہونا چاہئے نہ جدت پسند، بلکہ حقیقت پسند اور حق پرست ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے ملکی قوانین کا نافذ نہ ہونا ایک تکلیف دہ حقیقت ہے، لیکن اس حقیقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا سہارا لے کر رائج اسلامی قوانین پر بھی عمل کرنے سے روک دیا جائے۔ اگر کسی شخص کو مجبور کر کے کسی زمانہ میں کسی اچھی چیز سے روک دیا گیا تھا تو اس سے دوسری اچھی چیزوں کے بند کرنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا۔ ایمان داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ پچھلی بند کی ہوئی چیز بھی کھولدی جائے۔

یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عائلی قوانین کے مقابلہ میں عام ملکی قوانین کے نفاذ کی زیادہ ذمہ داری حکومت کی ہے۔ ملک میں امن وامان قائم رکھنا، غلط عناصر سے معاشرہ کو بچانا، جرائم کو مٹانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک کی جمہوری حکومت، صالح معاشرے کی تعمیر میں کیا رول ادا کرتی ہے اسلام نے عام ملکی قوانین سے متعلق بھی ہدایتیں دی ہیں، لیکن ان کا نفاذ حکومت کی قوت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان کے نفاذ کی ذمہ داری عام مسلمانوں پر نہیں اسلامی حکومت پر ہے!

عائلی قوانین کا معاملہ، عام ملکی قوانین سے بڑی حد تک مختلف ہے، عائلی قوانین دو فرد یا دو خاندان کے چند افراد سے متعلق ہوتے ہیں، اس لئے حکومت کو ان معاملات میں دخل اندازی کے مواقع کم ہیں، اور بحیثیت مُسلمان متعلق افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی ہدایات کی روشنی میں عائلی زندگی گذاریں، اس لئے اسلام کے عائلی قوانین ان تمام جگہوں پر نافذ ہوں گے، جہاں مسلمان آباد ہیں چاہے وہاں اسلامی حکومت قائم ہو یا نہ ہو۔!

یہ چیز بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام کے عائلی قوانین کے مقابلہ میں اگر دوسرے قوانین بنائے جائیں گے اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مسلمانوں کی زندگی

بڑی مشکلات سے دوچار ہوجائے گی، ایک طرف امن پسند شہری کی حیثیت سے مسلمان ان قوانین کا احترام کرنا چاہیں گے تو دوسری طرف اسلامی احکام انہیں پابند بنائیں گے کہ وہ مخصوص طریقہ کار اپنایا جائے جسے اسلام نے متعین کیا ہے اس طرح مسلمانوں کی داخلی زندگی ہر مرحلہ میں ملکی عائلی قوانین اور اسلامی عائلی قوانین کے درمیان ٹکراتی رہے گی۔ اور وہ مجبور ہوں گے کہ ملکی عائلی قوانین کو نظر انداز کر کے اسلامی قوانین کی پابندی کریں اگر ایسا نہ کیا گیا تو حرام وحلال، جائز وناجائز کا فرق ختم ہوجائے گا۔ (۱)

مسلمانوں کا مضبوط موقف

اسلام، مسلمانوں کی زندگی کا پرائیوٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس میں زندگی کے تمام گوشوں کے لئے رہنمائی موجود ہے۔ اور ایمان کا تقاضہ ہے کہ ان تمام ہدایتوں اور رہنمائی کو مانیں اور اسے محفوظ رکھیں اور ممکن حد تک اسے اپنی زندگی میں نافذ کریں۔ علماء اور ہندوستان کے مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی مخالف ہے، اور جو لوگ تبدیلی کے حق میں ہیں ان کی تعداد لاکھ میں ایک بھی نہیں ہے، علماء اور عام مسلمانوں کے غیر معمولی اجتماع کی وجہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا مسلمانوں کی مستقل تہذیب اور عائلی نظام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ مسلمانوں کی انفرادی، عائلی اور سماجی زندگی سے مسلم پرسنل لا کا بہت گہرا تعلق ہے اور انہیں قوانین کی بنیاد پر ان کی انفرادی اور سماجی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگر مسلم پرسنل لا ختم ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ

(۱) بعض ممالک نے طلاق کے اثر انداز ہونے کے لئے عدالت کی توثیق کی شرط لگادی اور یہ قانون بنادیا گیا کہ صرف وہی طلاق معتبر ہوگی جس کی ضرورت عدالت بھی محسوس کرے اور زوجین کے حالات کے پیش نظر دی ہوئی طلاق کی توثیق کردے۔ اس قانون پر مشہور اور عالمی ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ (مصر) نے اپنے ایک اجلاس (منعقدہ قاہرہ اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں یہ تجویز منظور کی کہ ''عدالت خواہ کچھ بھی فیصلہ کرے شوہر کی طرف سے دی گئی طلاق شرعاً نافذ ہوگی۔''

اسلامی قوانین عملاً عبادات کے دائرہ میں سمٹ کر رہ جائیں گے بلکہ سماجی روح کا بھی خاتمہ ہوجائے گا اور وہ جڑ ہی خشک ہوجائے گی جس کے پتوں کا مخصوص رنگ اسے دوسرے درختوں سے ممتاز کرتا ہے۔

اور سب سے اہم وجہ مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ مسلم پرسنل لا کا تعلق دین وشریعت سے ہے اور اس کی جڑیں قرآن وحدیث میں پیوست ہیں۔ خدا کے فرمان، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں فقہائے کرام نے زندگی سے متعلق قوانین مرتب کئے، یہ قوانین ہمارا قیمتی دینی اور علمی سرمایہ ہیں۔ ان قوانین کا ایک حصہ جو عائلی اور انفرادی زندگی سے متعلق ہے مسلم پرسنل لا کہلاتا ہے۔ مسلمانوں اور علماء کا ایمانی جذبہ اسے برداشت نہیں کرتا کہ اسلامی احکام میں تبدیلی کی جائے۔

ایک قابل قدر کوشش

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن منعقدہ بمبئی، مسلمانان ہند کی متحدہ کوششوں کا نہایت اہم اور قیمتی حصہ ہے۔ اس کنونشن نے جہاں باہمی اختلافات کو اتحاد کا رخ دیا ہے اور آپس کے فاصلوں کو قُرب سے بدلا ہے۔ وہیں یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مسلم پیشوا اور رہنما اپنے جزوی اور فروعی اختلافات کو بھول کر کسی بھی اہم مسئلہ پر جمع ہوسکتے ہیں اور پورے ملک کے مسلمانوں کو غور وفکر کا ایک نیا رخ دے سکتے ہیں۔..... حکومت نے خاموشی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے کہ مسلم پرسنل لا وہ مسئلہ ہے جس پر ملت کے تمام طبقے ایک ہیں اور ان میں کوئی بھی جماعت ایسی نہیں ہے جو مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کو برداشت کرسکتی ہو۔(۱)

(۱) مسلمانوں کے اتحاد اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جدوجہد کے نتیجہ میں نہ صرف ''متبنّیٰ بل'' کا معاملہ ختم ہوا بلکہ کریمنل پروسیجر کوڈ کی ترمیم شدہ دفعہ ۱۲۵ میں بھی حکومت نے (باقی اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کے رخ کو دیکھتے ہوئے حکومت کے ذمہ داروں نے متعدد بار یقین دہانی کی ہے کہ ''مسلم پرسنل لا میں اُس وقت تک ترمیم نہ ہوگی جب تک مسلمان نہ چاہیں'' مگر امت کے دینی اُمور مستقبل کے وعدوں پر چھوڑے نہیں جاسکتے اور نہ ملت کی کشتی ان کے سہارے چلائی جاسکتی ہے نہ ایسی یقین دہانی پر تکیہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کیلئے خود مسلمانوں کی مسلسل بیداری، اتحاد اور فراست ایمانی کے ساتھ مسائل کا حل ڈھونڈنے کے عزم کی ضرورت ہے، اور کنونشن (بمبئی) کے نتیجہ میں قائم ہونے والے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے۔ تاکہ مسلمانوں کا متحدہ جذبہ، مشترکہ آواز اور متفقہ مطالبہ، ایک متعین پروگرام اور واضح طریق عمل کی شکل میں سامنے رہے اور پورا ملک یہ محسوس کرے کہ بورڈ، مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مضبوط ادارہ ہے۔

☆☆

(بقیہ صفحہ گزشتہ) بورڈ کے ذمہ داروں سے گفتگو کے بعد ترمیم کی۔ ان دفعات کے ذریعہ قانون یہ بنایا گیا کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیدی، تو دین مہر اور واجبات عدت کے علاوہ مطلقہ عورت کو تا نکاح ثانی اور نکاح نہ کرنے کی شکل میں تاحیات نفقہ بھی دینا ہوگا۔ اس طرح کے نفقہ کی کوئی ذمہ داری شریعت اسلامیہ نے طلاق کے بعد مردوں پر عائد نہیں کی ہے۔ اور اس طرح کے نفقہ کو لازم قرار دینا مردوں کے ساتھ زیادتی تھی۔ اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایسی قانون سازی کے خلاف جدوجہد کی، جس کے نتیجہ میں دین مہر اور واجبات عدت کے سوا کسی نفقہ کی ذمہ داری مرد سے ختم کردی گئی۔
(دیکھئے CR, Pc, 127, B) مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے!۔

یونیفارم سول کوڈ

ہندوستان مختلف تہذیبوں اور متعدد مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے، اور برابر یہاں کی خمیر میں ''مذہب'' شامل رہا ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے اس ملک میں اپنے مذہب پر پوری آزادی کے ساتھ عمل کرتے رہے ہیں، ماضی بعید میں جب مسلمانوں کے قافلہ نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر اپنے خیمے نصب کئے، اس وقت کی تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد مذہب کے ماننے والوں سے آباد یہ ملک مذہبی اعتبار سے آزاد تھا، اور مذہب وتہذیب سے وابستہ احکام وروایات پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہ تھی، تہذیبی رنگا رنگی اور مختلف مذہب کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ان کی سماجی زندگی میں بے ربطی اور انتشار کا ذریعہ کبھی نہیں بنا۔ مسلمان جو ایک مستقل دین اور مکمل تہذیب کے ساتھ نہ صرف عبادتوں بلکہ شخصی معاملات میں بھی قانونی طور پر آزاد رہے، اور ابتدائی عہد کی تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں ہندو معاملات ومسائل کے حل کے لئے ''برہمن'' متعین کئے جاتے تھے، مسلمانوں کے معاملات مسلم قاضیوں کے ذریعہ طے پاتے تھے۔ جنہیں اس وقت کی اصطلاح میں ''ہنرمند'' کہا جاتا تھا۔

ہندوستان میں ایک عرصہ تک مسلم حکومت قائم رہی۔ اس زمانہ میں بھی مسلم آبادی کے لئے ان کی عبادتوں کا نظام اور شخصی قوانین بحال رکھے گئے، اور مختلف مذہب کے ماننے والوں کے معاملات ان کے مذہب کے مطابق طے کئے جاتے رہے — مسلم عہد کے ختم ہونے کے بعد انگریزوں کے عہد میں بھی شخصی قوانین بحال رہے اور انگریزوں نے موجودہ

صدی کے نصف اول میں تدریجاً اسلام کے شخصی قوانین کو دستور میں جگہ دی، جسے ''مسلم پرسنل لا'' کہا گیا، یہ دستور سازی دراصل اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ مسلمان ان قوانین (جن کا تعلق شخصی اور عائلی زندگی سے ہے) سے دست بردار نہیں ہو سکتے، اور ایک ذمہ دار حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ان قوانین کی اہمیت محسوس کرے، اور انہیں قانونی تحفظ دے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا، اور ملک کا نیا دستور بنا تو اس میں بھی ''مسلم پرسنل لا'' کی قانونی حیثیت تسلیم کی گئی، اور طویل ترین ماضی کی روایات اور عوامی رجحان جس کی بنیاد مذہب پر ہے، کا احترام کیا گیا اور قانون سازوں نے صاف طور پر دستور ساز اسمبلی میں اعلان کیا کہ ''مسلم پرسنل لا'' میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

یونیفارم سول کوڈ کا معاملہ

اب اس ملک میں مسلم پرسنل لا کو ختم کر کے ''یونیفارم سول کوڈ'' کی بات کی جاتی ہے۔ ''یونیفارم سول کوڈ'' — یا — ''یکساں شہری قانون'' سے مراد وہ قوانین ہوا کرتے ہیں جو کسی بھی مخصوص خطہ زمین پر آباد لوگوں کی سماجی اور عائلی زندگی کے لئے بنائے گئے ہوں، ان قوانین کے تحت ہر فرد کی شخصی اور خاندانی زندگی کے معاملات آتے ہیں اور نکاح و طلاق، فسخ وہبہ، وصیت وواراثت اور تبنیت جیسے امور انہیں قوانین کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں، ان قوانین کے نفاذ میں کسی شخص کے مذہب اس کی تہذیب اور رسم ورواج کا خیال نہیں کیا جاتا، ان چیزوں سے بالکل الگ ہو کر ہر مذہب کے ماننے والے کے لئے ایک قانون ''یونیفارم سول کوڈ'' ہے۔ اور اسی قانون کے تحت نکاح اور طلاق جیسے امور بھی انجام پاتے ہیں، یعنی سول کوڈ کے ذیل میں وہ سارے امور آجاتے ہیں جن کا تعلق پرسنل لا سے ہوتا ہے۔

ہندوستان میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں

کو اپنی مذہبی ہدایات کے خلاف نکاح وطلاق جیسے معاملات انجام دینا ہوں گے، وصیت اور وراثت کے معاملہ میں بھی انہیں مذہبی قانون کے بجائے دوسرے قوانین پر عمل کرنا ہوگا، اسی طرح دوسرے مذہب اور رسم ورواج کے پابند لوگوں کو بھی اپنا مذہب چھوڑنا ہوگا، اپنے رواج کو مٹانا ہوگا اور نئے قانون کا پابند ہونا پڑے گا۔ اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' واضح طور پر ''مسلم پرسنل لا'' سے مختلف ایک قانون ہے۔ جس کے نفاذ کے بعد ''مسلم پرسنل لا'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی (۱)— گویا ''مسلم پرسنل لا'' جس کی بنیاد قرآن وسنت ہے، اور یونیفارم سول کوڈ کو یکجا نہیں کیا جاسکتا، اس حقیقت کی وضاحت مسٹر گجندر گڈکر (چیرمین لاکمیشن، حکومت ہند) نے اپنی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کی:

''مسلم برادری کے لئے سیکولرزم کا اعلان ہے کہ تعداد ازدواج کو ختم کرنے اور یکساں سول کوڈ کے مسئلہ پر صرف سماجی بنیادوں پر غور ہوگا، قرآن کے حوالہ سے نہیں۔''(۲)

مسلم برادری کے لئے سیکولرزم کے اس اعلان کی وجہ ان کے ذہن میں یہ ہوسکتی ہے کہ جب تک قرآن اور مذہب سے پورے طور پر دامن کو بچانہ لیا جائے سیکولر اسٹیٹ کا خاکہ پورا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ایک دانشور کی رائے ہے۔ ''اگر کوئی ریاست اپنے تمام شہریوں کے لئے یکساں معاشرتی قانون نہیں بناتی تو پھر ایسی ''ریاست'' اپنے آپ کو سیکولر

(۱) یہاں مجھے اس امکان سے بحث نہیں ہے کہ اگر ''مسلم پرسنل لا'' ہی کو ''یونیفارم سول کوڈ'' قرار دیا جائے، اور اسلام کے قوانین شخصی کو ملک کے تمام باشندوں پر نافذ کردیا جائے تو ''یونیفارم سول کوڈ'' کے باوجود مسلم پرسنل لا پورے طور پر باقی رہ جائے گا۔ یہ صرف ایک منطقی امکان ہے۔ جس کے وجود کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا، اس طریقہ کار سے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مجروح ہوں گے، ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہندوستان یا کسی ملک کے غیر مسلم شہریوں کی مذہبی آزادی کو ختم کیا جائے اور ان کے شخصی قوانین کو مٹا کر ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔

(۱) قومی آواز، 16/12/1970

ریاست کہنے کا حق بھی نہیں رکھتی۔''(۱)

یا وہ بھی اس نتیجہ تک پہنچے ہوں کہ ''کسی مذہب کا صحیفہ، خواہ اسے خدا نے وحی کے ذریعہ انسانوں تک بھیجا ہو، یا وہ کسی رشی منی کے کانوں میں گونجا ہو، زندگی کے کسی بھی میدان میں قطعیت کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔''(۲) وجہ جو بھی ہو مگر ایک مشہور قانون داں اور حکومت کے ذمہ دار کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ ''یکساں سول کوڈ'' کے مسئلہ پر قرآن کے حوالہ سے گفتگو نہیں کی جاسکتی، جب کہ مسلم پرسنل لا کی بنیاد قرآن اور سنت ہی ہے۔

لیکن دستور ہند کے وضع کرنے والوں کا کمال ہے کہ ایک طرف انہوں نے ''مسلم پرسنل لا'' کو قانونی تحفظ دے دیا۔ اور دوسری طرف ''یونیفارم سول کوڈ'' کے نفاذ کی ہدایت بھی دیتے گئے، اور ایسی ترکیب نکالی جس سے وقتی طور پر باغباں خوش اور صیاد راضی رہ سکے۔

قانونی پس منظر

اس دہری پالیسی، جسے دستور کے وضع کرنے والوں نے اپنایا تھا، کے ساتھ ہندوستان میں یکساں شہری قانون کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ مناسب ہے کہ پہلے دستور کے اس حصہ کا جائزہ لے لیا جائے، جس کا تعلق ''یونیفارم سول کوڈ'' سے ہے، دستور کے رہنما اصول Directive Principle کی دفعہ 44 میں کہا گیا ہے:

"The State shall endeavour to secure for citizens a uniform civil code throughout the territory of India."

(ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو)

پارلیمنٹ میں دفعہ 44 کی خواندگی ہوئی، تو اس پر طویل بحث کی گئی، مسلم ارکان

(۱) مسٹر ایم، آر، اے بیگ ان ڈیفرنٹ سیڈس ص ۱۶۹

(۲) اے، بی شاہ، چیلنجز ٹو سیکولرزم ص 34

پارلیمنٹ نے اس دفعہ میں اضافہ یا ترمیم کا مطالبہ کیا اور متعدد ترامیم پیش کیں،(۱) مگران میں سے کسی کو قبول نہیں کیا گیا، ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کو ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی:

''یہ محض حکومت کو اختیار دیا جارہا ہے، جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی شخصی قوانین کو ختم کردینا ضروری ہوگا، خواہ ملک کے مسلمان، عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے کسی کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیے کہ صرف اختیار کے مل جانے کی وجہ سے حکومت اس پر عمل کے لئے اصرار کرے گی۔

حکومت کے اختیار عملاً ہمیشہ محدود ہوا کرتے ہیں۔ خواہ لفظی طور پر آپ انہیں کتنا ہی لامحدود کردیں، کیونکہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی، جس کے نتیجہ میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہوجائیں۔ اگر کسی وقت حکومت ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہیے۔''

اس طرح ''دستور'' میں دی گئی ''وسعت'' کو یقین دہانی کے ذریعہ ''سمیٹنے'' کی کوشش کی گئی، یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہوگی اس کا اندازہ مذکورہ بیان کی قوت سے ہی لگایا جاسکتا ہے، لیکن پارلیمنٹ کی اکثریت نے دفعہ 44 کو قبول کرلیا، اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' کے نفاذ کا بیج بودیا گیا۔

(۱) یہ ترامیم جناب محمد اسماعیل صاحب، جناب بی پوکر صاحب، جناب نظیر الدین احمد صاحب، جناب محبوب علی بیگ صاحب نے پیش کی تھیں، ان تمام تجویزوں کا ماحصل یہ تھا کہ اس دفعہ سے پرسنل لا علیحدہ رکھا جائے۔ مثلاً جناب محبوب علی صاحب کی ترمیم یہ تھی:

"Provided that nothing in the article shall effect Personal Law of the citizens."

(Directive Principles in the Indian Constitution. page193.)

تاریخی پس منظر

''یونیفارم سول کوڈ'' کے قانونی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، تاریخی حالات کا بھی جائزہ لینا مناسب رہے گا، تاکہ اندازہ ہوجائے کہ دستور کے نفاذ کے بعد سے اب تک ''یونیفارم سول کوڈ'' کے سلسلہ میں قانون سازی کے ذمہ داروں اور حکومت کا کیا انداز فکر رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نیم سرکاری یا غیر سرکاری سطح سے مختلف قسم کے اجتماعات کے ذریعہ ''یونیفارم سول کوڈ'' کی راہ ہموار کی جاتی رہی ہے۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند قسم کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی تیار ہوچکے ہیں، جو براہ راست یا بالواسطہ یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی جدوجہد کررہے ہیں، ایسی انجمنیں بھی بن چکی ہیں جن کا بنیادی موضوع یہی مسئلہ ہے، ایسے افراد، گروپس اور انجمنیں، خواہ انہیں مسلم عوام اور قرآن وسنت سے واقف حضرات کا تعاون حاصل نہ ہو، اور ان کی آواز مسلم معاشرہ سے بالکل الگ — ایک آواز ہو(۱) مگر یہ قوتیں اپنی سطح پر کام کررہی ہیں، اور انہیں یہ کہتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ہمارے ساتھ ہے، خود حکومت کے ذمہ داروں کا ذہن بھی ''یونیفارم سول کوڈ'' کے ساتھ ہے، اور مختلف موقعوں پر ان حضرات کی طرف سے ''یونیفارم سول کوڈ'' کے نفاذ کے ارادوں کا اظہار ہوا ہے، مثلاً جب ہندو پرسنل لا کو نئی شکل دی جارہی تھی تو اس

(۱) حقیقت یہ ہے کہ ایسی آوازیں نہ صرف مسلم معاشرہ سے بالکل علیحدہ ہیں بلکہ براہ راست قرآن اور حدیث کی تعلیمات سے بھی واضح طور پر مختلف ہیں، اس طبقہ میں ایک مشہور نام حمید دلوائی صاحب کا ہے، جنہوں نے اپنی وصیت یں وہ باتیں لکھیں جو صراحتہً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں انہوں نے وصیت نامہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ مرنے کے بعد انہیں مسلمانوں کے طریقہ پر دفن نہ کیا جائے۔ اس انداز فکر سے ان کی اسلام کے ساتھ وفاداری کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے حضرات مسلمانوں میں کس طرز کی اصلاح چاہتے ہیں۔

وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے کہا تھا۔ ''ہم نے آئین کے نفاذ (26 رجنوری 1950ء) کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ ہندو میرج ایکٹ پاس کئے ہیں، اب ہندو قانون وراثت کا مسودہ پارلیمنٹ میں زیر غور ہے یہ سب ضابطۂ دیوانی کو یکساں بنانے کے اقدامات ہیں۔''(۱)

ضابطۂ دیوانی کو یکساں بنانے کے اقدامات کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہندوؤں کا نمبر کیوں آیا؟ پورے ملک میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کس طرح نافذ کیا جائے گا؟ اس کا جواب انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں یوں دیا:

''ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے جو ہماری پچاسی فی صد آبادی کے لئے ہو تو باقی آبادی پر اسے نافذ کرنا مشکل نہ ہوگا۔ اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔''

مسٹر پاٹسکر کا یہ بیان ایک سوچی سمجھی پالیسی کا اعلان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ پالیسی اب تک عملی شکل میں سامنے نہیں لائی گئی ہے، مگر ذہنی پالیسی کے نقوش کبھی مدھم نہیں ہوئے۔ اور وقتاً فوقتاً یہ اندازہ لگایا جاتا رہا ہے کہ ملک کی پچاسی فیصد کے علاوہ آبادی کا ذہن اس پالیسی کو برداشت کرسکتا ہے یا نہیں؟

۱۹۶۳ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کرنا چاہا تھا، جس کا مقصد مسلم پرسنل لا میں تبدیلی پر غور وفکر اور اس کے لئے عملی راہوں کی تلاش تھا، مسلمانوں کی ہمہ گیر مخالفت کے نتیجہ میں یہ کمیشن مقرر نہیں کیا گیا۔ اور وزیر قانون نے پارلیمنٹ میں یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ حکومت اس وقت (مسلم پرسنل لا) میں کوئی ترمیم کرنا مناسب نہیں سمجھتی (۲) یہ جملہ خود

(۱) ۲۵ اگست ۱۹۵۵ء کی ریڈیائی تقریر

(۲) ۲۲ اگست ۱۹۶۳ء کو راجیہ سبھا میں وزیر قانون کی تقریر۔

بتا رہا ہے کہ مسئلہ ختم نہیں ہوا، نہ پالیسی میں فرق آیا، حالات سازگار نہیں ہیں، اس لئے اس پالیسی پر عمل نہیں ہوگا — ۱۹۷۲ء میں مرکزی وزیر قانون مسٹر گوکھلے نے پھر اس پالیسی کا اعادہ کیا انہوں نے Adoption of Children Bill 1972 (متبنّٰی بل) کو پیش کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا۔ ''یہ مسودہ قانون ''یونیفارم سول کوڈ'' کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔''(۲)

مختلف وزراء قانون کے بیانات حکومت کی پالیسی کی نشاندہی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ حکومت ''یونیفارم سول کوڈ'' کے سلسلہ میں دستور کے ''رہنما اصول'' کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، اور حکومت کی خواہش ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے لئے ہر فرقہ وطبقہ کا ذہن تیار ہونا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر کچھ ایسے حضرات بھی موجود ہیں جن کا ذہن رائے عامہ کے احترام سے خالی ہے اور جو قوت کے سہارے ''یونیفارم سول کوڈ'' کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ''اگر پارلیمنٹ کے سیکولر ممبران کی مدد سے حکومت ایک مشترکہ عائلی قانون نافذ کر دیتی ہے تو مسلمان کچھ دنوں تک مخالفت کریں گے، لیکن اس کی وجہ سے آسمان نہیں پھٹ پڑے گا''(۲) اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں گجندر گڈکر (چیرمین لاکمیشن) نہ یہ بات دہرائی:

''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرلینا چاہئے اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ یہ قانون نافذ کیا جائے گا۔''(۳)

(۱) اللہ کا فضل ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کی منظم جدوجہد اور مسلمانان ہند کے مؤثر اجتماع کے نتیجہ میں حکومت نے متبنی بل واپس لے لیا۔

(۲) اے، بی، شاہ، ٹائمز آف انڈیا نئی دلی، ۱۳ رجولائی ۱۹۶۹ء۔

(۳) مارچ ۱۹۷۳ء میں بنگلور میں یونیفارم سول کوڈ کے موضوع پر تقریر۔

یونیفارم سول کوڈ کی حمایت کے اسباب

مذکورہ تفصیل ہمیں بتاتی ہے کہ حکومت برابر ''یونیفارم سول کوڈ'' کے نفاذ کی خواہش مند رہی ہے(۱) اور ایک عرصہ سے ملک کا ایک طبقہ — جس میں بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے اور کچھ مسلمانوں کی۔ اسے نافذ کرنے کے لئے ذہن سازی کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ کچھ لوگ انتہا پسندوں کی شکل میں قوت کے سہارے ''یونیفارم سول کوڈ'' کے نفاذ کا مشورہ دیتے ہیں، کچھ لوگ اصلاح کے نام پر اس کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں، اور بعض حضرات ناصح مشفق بن کر حالات کے تقاضوں کی رعایت کی سفارش کرتے ہیں، لیکن یہ سارے طبقے جو مختلف قسم کے مشورے دے رہے ہیں ایک ہی منزل کے راہی ہیں، ہر ایک کی تجویزیں الگ ہیں، ان کے لب ولہجہ میں فرق ہے۔ ان کے دلائل مختلف ہیں، لیکن گہرا جائزہ یہی بتلاتا ہے کہ ان سب کا مقصد ایک ہے، اور دیر یا سویر یہ سب ایک ہی جگہ پہنچ جائیں گے۔(۲)

منزل کے اس اتحاد کی وجہ یہ ہے کہ اس ذہن کے لوگ مغربی افکار وخیالات کے اسیر ہیں، ان کی تعلیم وتربیت مغربی طرز کی ہے، وہ مغربی معاشرہ سے ذہنی اور عملی تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مغربی قوانین کو پڑھا اور سمجھا ہے، اس لئے ہندوستانی دستور کے فریم میں انہیں مسلم پرسنل لا جیسی چیز اجنبی لگتی ہے۔ وہ شریعت کو زائد ضرورت سمجھتے ہیں ان کا خیال

(۱) ملاحظہ فرمائیں ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ- نئے مرحلہ میں۔''

(۲) مثلاً پروفیسر آصف فیضی صاحب اعتدال پسند اور عائلی مسائل کے بہت بڑے اسکالر کہے جاتے ہیں، موصوف کی اعتدال پسندی کا مطلب شاید یہ ہے کہ قرآن مجید کو مقدس آسمانی صحیفہ تصور کرتے ہیں مگر وہ بھی مسلمانوں کے عائلی مسائل پر غور کرتے ہوئے قرآن کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھتے، ایک موقع پر فرماتے ہیں ''مقدس قرآن بحث وتمحیص سے بالاتر آسمانی صحیفہ ہے، لیکن اس میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جنہیں بدل ڈالنے کی ضرورت ہے، جیسے تعدد ازدواج، پردہ، طلاق''۔ (اسٹیٹمینٹ ۱۱/اگست ۱۹۷۰ء)

ہے کہ شریعت فرد کا ایک پرائیوٹ معاملہ تو ہوسکتا ہے، قانون نہیں بن سکتا ہے۔ مغربی انداز فکر کی وجہ سے ان کے نزدیک مشرق کی روایتیں بھی قابل احترام نہیں ہیں، اور نہ مشرقی مزاج وانداز انہیں بھاتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی چیز کو پرکھنے کے لئے صرف اساتذۂ مغرب کی دی ہوئی کسوٹی ہے — مغرب سے الگ ہوکر ان کے سامنے نہ کوئی دعوت ہے نہ پیغام، نہ طرز فکر ہے، نہ راہ عمل، ''مغرب'' نے یونیفارم سول کوڈ، کی تعلیم دی ہے۔ وہاں مذہب کے نام پر جو کچھ ہے وہ صرف زندگی کا پرائیوٹ معاملہ ہے، وہاں مذہب کا دائرہ عبادات اور رسول تک محدود ہے۔ اس لئے ایسے حضرات ''یونیفارم سول کوڈ'' کے سوا کسی اور چیز کو مشکل ہی سے سوچ سکتے ہیں۔

یونیفارم سول کوڈ کی حمایت کا دوسرا اہم سبب وہ قوانین ہیں جنہیں پارلیمنٹ نے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کے درمیان منظور کیا ہے، جس کے نتیجے میں ''ہندو پرسنل لا'' کی ایک خاص شکل ابھری، یہ شکل ہندو مت تصورات سے بالکل الگ ہے، اسی وجہ سے خاصے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے ان قوانین کی سخت مخالفت کی تھی، اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بہت چیں بچیں ہوکر ان قوانین پر مہر تصدیق ثبت کی تھی — ہندو پرسنل لا، کی منسوخی کے وقت ہی یہ ذہن بننے لگا تھا کہ ''مسلم پرسنل لا'' کو بھی منسوخ ہونا چاہئے، اور جس طرح ہندوؤں کے لئے مغرب سے برآمد کردہ پرسنل لا نافذ کیا جارہا ہے اسی طرح کا پرسنل لا ہر ہندوستانی کے لئے نافذ ہونا چاہیے۔ مذکورہ بالا قوانین جب پارلیمنٹ میں پیش ہوئے تھے تو مشہور لیڈر راجاریہ کرپلانی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر ہندوستان ایک جمہوری ریاست ہے تو پھر میری یہ گزارش ہوگی کہ صرف ایک فرقہ کے لئے قانون نہ بنایا جائے، کیا ہماری گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے بھی یک زوجگی کا قانون پاس کرے گی''۔(۱)

(۱) اچاریہ کرپلانی کی یہ تقریر بتلاتی ہے کہ بہت سے پڑھے لکھے ہندو بھائی صرف اس ناراضگی کی وجہ سے مسلم پرسنل لا کی مخالفت کرتے ہیں کہ ہندو پرسنل لا ختم کردیا گیا ہے۔

یونیفارم سول کوڈ کے حامیوں کے دلائل

یونیفارم سول کوڈ کی حمایت میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو ''مسلم پرسنل لا'' کی بعض دفعات سے متعلق ہیں، اور کچھ دلائل براہ راست ''یونیفارم سول کوڈ'' سے متعلق ہیں، یہاں ہمیں ان دلائل سے بحث نہیں ہے جن کی بنیاد ''مسلم پرسنل لا'' کی کوئی دفعہ ہے، کیوں کہ وہ جزوی چیزیں ہیں (۱) جنہیں سامنے رکھ کر کسی اصول کا طے کرنا غلط ہے، یہاں ہمیں ان دلائل کا خلاصہ پیش کرنا ہے۔ جو براہ راست ''یونیفارم سول کوڈ'' سے تعلق رکھتے ہیں، ان دلائل کے تجزیہ سے بنیادی طور پر چار چیزیں سامنے آئیں۔

(۱) آئینی زاویۂ نگاہ سے یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ دستور کے رہنما اصول کی دفعہ (۴۴) کے پیش نظر ملک کے تمام باشندوں کا ''سول کوڈ'' ایک ہونا چاہئے، دستور کے یہ رہنما اصول دراصل وہ خاکے ہیں جو ملک کے مستقبل کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ حکومت کو ایسی راہ اختیار کرنی چاہئے جس پر چل کر رہنما اصول کے مقاصد پورے ہوسکیں۔

(۲) ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، سیکولرزم کا لازمی تقاضہ ہے کہ ملکی قوانین مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں، اس لئے یونیفارم سول کوڈ کے ذریعہ غیر مذہبی عائلی قوانین کا نفاذ ہونا چاہئے۔

(۳) مذہبی قوانین پرانے ہیں، زندگی کی دوڑ میں اب ان کی کوئی افادی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے، ڈ وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں، نہ ان میں سماجی پیچیدگیوں کے حل کرنے کی صلاحیت ہے، بدلتے ہوئے سماج کے لئے منجمد تعلیمات کا قدیم مجموعہ کبھی بھی مفید نہیں ہوسکتا، اس لئے ''مذہبی قوانین'' کی جگہ نئے قوانین کو نافذ کرنا ضروری ہے، تاکہ ایک طاقت ور سماج کی تشکیل ہوسکے۔

(۱) اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے ''مسلم پرسنل لا۔ بحث ونظر کے چند گوشے۔''

(۴) ہندوستان میں مختلف مذہب کے ماننے والے موجود ہیں، ان میں یکجہتی کے جذبہ کو فروغ دینے اور اتحاد کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے شخصی قوانین ایک ہوں۔ مختلف قسم کے شخصی قوانین باہمی اختلافات کا ذریعہ بنتے ہیں اور قومی یک جہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔

یونیفارم سول کوڈ کی مخالفت کے اسباب

مسلمان ''یونیفارم سول کوڈ'' کے مخالف ہیں: (۱) ہندوؤں کا مذہبی طبقہ بھی اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔ (۲) مسلمانوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ''یونیفارم سول کوڈ'' مذہبی تعلیمات سے متصادم ہے، اس کے نفاذ کے بعد عائلی اور شخصی زندگی میں قرآن وسنت کی ہدایات سے دستبردار ہونا پڑے گا، اور ایک ایسے قانون کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا پڑے گا جس کے نتیجے میں مذہب کی مقرر کی ہوئی حدیں مٹ جائیں گی اور فرد کی شخصی زندگی سے حلال وحرام کا وجود ختم ہوجائے گا، مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ ان قوانین کے ذریعہ اپنی عائلی اور شخصی معاملات ومسائل کا حل نکالیں جن کا ہر قدم پر مذہب سے ٹکراؤ ہوتا رہے۔

جن لوگوں نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور اسلام کو بعض دوسرے مذاہب کی طرح عبادات اور رسم ورواج کا مجموعہ سمجھتے ہیں، انہیں یکساں شہری قوانین کے نفاذ کے خلاف مسلم رائے عامہ کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی اور جو لوگ مسلمانوں کی مذہب سے وابستگی کا علم

(۱) یونیفارم سول کوڈ کی حمایت میں دانشور قسم کے چند افراد پیش پیش نظر آتے ہیں مگر مسلم عوام پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مسلم عوام ''یونیفارم سول کوڈ'' کی مخالفت میں پورے طور پر متفق الخیال ہیں۔

(۲) راشٹریہ سویم سنگھ کے سابق سربراہ گرو گولکر اور رام راجیہ پریشد کے رہنما سوامی کرپاتری جی ''یونیفارم سول کوڈ'' سے اپنا اختلاف ظاہر کرچکے ہیں۔

نہیں رکھتے وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مسلم رائے عامہ اس مسئلہ پر کتنی مضبوط ہوسکتی ہے لیکن مسلمانوں کی مذہب سے بھرپور وابستگی اور اسلامی تعلیمات کی وسعت انہیں اجازت نہیں دیتی کہ وہ شخصی زندگی کے مذہبی قوانین سے دست بردار ہوں، کیوں کہ یہ مذہبی قوانین بھی دین کا ایک اہم حصہ ہیں، اور ان کی بنیاد بھی اسی طرح قرآن وسنت میں موجود، ہے جس طرح نماز۔ روزہ اور دوسرے عبادات کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے کچھ تہذیبی امتیازات ہوتے ہیں جن کا تعلق بڑی حد تک ''پرسنل لا'' سے ہوا کرتا ہے، بعض مذاہب کے یہ امتیازات مذہبی تعلیمات کی بنیاد پر نہیں بلکہ رسم ورواج اور جغرافیائی حالات کے ماتحت ہیں، مسلمانوں کے بھی تہذیبی امتیازات ہیں۔ جن کی بنیاد مذہبی تعلیمات پر ہے، مسلمان آمادہ نہیں ہیں کہ وہ تہذیبی امتیاز سے دستبردار ہوں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان بلا وجہ امتیازی نقطۂ نظر یا علیحدگی پسندی کا جذبہ رکھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ تہذیبی امتیاز، مذہبی تعلیمات کی بنیاد پر ہے، یوں بھی تہذیبی رنگا رنگی اور عائلی زندگی کے طور طریقوں کی جداگانہ نوعیت کا نتیجہ علیحدگی پسندی نہیں ہوا کرتا، علیحدگی پسندی، قومی معاملات سے بے تعلقی، مشترکہ سماجی ربط کی کمی، رفاہی کاموں سے دوری کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ مسجد میں نماز نہ پڑھنے والا ہندو، مندر میں پوجا نہ کرنے والا مسلمان، گرنتھ صاحب پر عمل نہ کرنے والا عیسائی اور بائبل کی مقدس تعلیمات کو اپنے لئے غیر ضروری سمجھنے والا سکھ کبھی علیحدگی پسند نہیں کہا جاسکتا!

یونیفارم سول کوڈ کے حامیوں کے دلائل کا تجزیہ

جن بنیادوں پر ''یونیفارم سول کوڈ'' کی حمایت کی جاتی ہے، کوڈ کے مخالفین انہیں قابل قبول دلیل نہیں سمجھتے، کوڈ کی حمایت میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دلائل اپنے اندر نہ منطقی قوت رکھتے ہیں اور نہ ہندوستانی مزاج وسماج سے

ان کی تائید ہوتی ہے۔ مناسب ہے یہاں ان دلائل کا جائزہ لے لیا جائے، تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے۔

۱- سب سے اہم آئینی بحث ہے، جس نے اس مسئلہ کے لئے بیج کا کام دیا ہے جیسا کہ ابتدائی حصہ میں بیان کیا گیا۔ دستور ہند کے رہنما اصول (دفعہ ۴۴) میں یکساں شہری قانون کا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن دستور ہند میں بنیادی حقوق (دفعہ ۲۵) کے تحت مذہبی آزادی کا وعدہ موجود ہے اور یہ یقین دہانی کی گئی ہے کہ ہر شخص کو مذہب قبول کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے کا پورا حق ہوگا۔ دستور کے متن کا ترجمہ یہ ہے:

دفعہ ۲۵ (۱) امن عامہ، اخلاق، صحت اور اس قسم کے دوسرے احکام کے تابع رہ کر تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی، مذہب کے اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے، اور اس کی اشاعت کا مساوی حق ہوگا۔

۲- یہ آرٹیکل کسی ایسے مروجہ قانون کو متاثر نہیں کرے گا اور نہ ریاست کے لئے کسی ایسے قانون سازی کے لئے مانع ہوگا، جس کے ذریعہ:

(الف) کسی مذہبی رسم کے معاشی، مالی، سیاسی، یا کسی سیکولر پہلو کو منضبط یا محدود کیا جائے۔

(ب) سماجی بھلائی اور اصلاح یا ہندوؤں کے عوامی نوعیت کے مذہبی اداروں کو ہندوؤں کے تمام طبقات کے لئے کھول دئے جانے کا اہتمام کیا جائے۔

مذہب کی آزادی کے ساتھ یکساں شہری قانون کی گاڑی نہیں چل سکتی اس لئے ماہرین قانون کا خیال ہے کہ ان دونوں دفعات میں ٹکراؤ ہے، ان حضرات نے دونوں حصہ قانون، بنیادی حقوق اور ''رہنما اصول'' پر کافی بحث کی ہے اور مختلف کورٹس کے فیصلے بھی ان دونوں قسموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ماہرین قانون اور عدلیہ کا عام رجحان یہی ہے کہ ''بنیادی حقوق'' کی دفعات زیادہ اہم اور مکمل قانون کا ایک حصہ ہیں، ''رہنما اصول'' کی حیثیت

کمزور ہے، اور اسے مستقل قانون نہیں کہا جا سکتا، مذہبی آزادی کا تعلق ''بنیادی حقوق'' سے ہے۔ اس لئے اسے قانوناً پوری اہمیت حاصل ہے، اس قانون کے رہتے ہوئے یکساں شہری قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

دستور کے یہ رہنما اصول ملک کے مستقبل کے لئے دستور سازوں کا خاکہ ہو سکتے ہیں، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ان خاکوں میں رنگ بھرا جائے، دستور میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کے علاوہ اور چیزوں کے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔ مگر نہ اس رہنمائی کو قانونی شکل دی گئی، نہ کسی کو یہ شکوہ ہے کہ اب تک یہ خاکے بے رنگ پڑے ہوئے ہیں۔ اسی پر بس نہیں، بعض ایسے ''رہنما اصول'' بھی ہیں، جنہیں قانونی شکل دی گئی اور اس پر عمل کے لئے اقدامات کئے گئے، اور بعد میں ان قوانین میں اتنی گنجائش پیدا کر دی گئی اور ایسی راہیں نکال دی گئیں کہ وہ بے حیثیت ہو کر رہ گئے ہیں، ''شراب بندی'' اس کی ایک مثال ہے۔ گاندھی جی کی ہدایت میں سے ایک ''شراب بندی'' بھی ہے۔ جس کے بارے میں وہ آزادی سے پہلے بھی بارہا اپنے خیالات ظاہر کر چکے تھے، جنگ آزادی کے لئے لڑنے والی، ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس نے بھی شراب کے استعمال کے خلاف آزادی سے پہلے ہی تجویزیں پاس کی تھیں۔ دستور ہند میں ''شراب بندی'' کے لئے ''رہنما اصول'' میں واضح الفاظ موجود ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قوانین بھی بنائے گئے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر شراب نوشی کو دوبارہ قانونی تحفظ مل گیا۔

ہندوستان میں قانون کو منطبق کرنے کی یہ شکل بھی بتاتی ہے کہ ''رہنما اصول'' پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور قانونی روایت (Tradition) کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ''رہنما اصول'' ملک کے مستقبل کا یقینی خاکہ بھی نہیں ہے، ہاں! انہیں دستور سازوں کا خواب کہا جا سکتا ہے، جو کبھی پورا ہوتا ہے اور کبھی اس کی تعبیر تلاش میں زندگی موت کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے۔

۲- سیکولرزم کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں ''یونیفارم سول کوڈ'' نافذ کیا جائے نہ سیکولرزم کا یہ مفہوم ہے کہ ریاست کے چپہ چپہ سے مذہبی نقوش، سماج سے مذہبی روایات، اور افراد کے دلوں سے مذہبی تعلیمات کو کھرچ کھرچ کر مٹا دیا جائے۔ سیکولر ریاست کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا وہ کسی مذہب کی طرف دار نہیں ہوگی اور کسی مذہب کے ماننے یا نہ ماننے کی وجہ سے کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ہر فرد کو مذہب کے قبول کرنے کی آزادی ہوگی۔ یہ مفہوم دستور ہند سے واضح ہوتا ہے اور اس مفہوم کے پیش نظر یہاں قوانین بنائے گئے ہیں اس کے بعد یہ سوال نہیں اٹھتا کہ سیکولرزم کا لازمی تقاضہ ''یونیفارم سول کوڈ'' ہے۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیکولرزم ایک مصالحتی راستہ ہے، جس کے تحت ریاست کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ عام ملکی معاملات کے لئے قوانین بنائے بین الاقوامی امور میں حصہ لے، ریاست کے باشندوں کی عمومی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرے اور فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ شخصی اور عائلی زندگی میں ان قوانین کو قبول کرے جن پر وہ مذہب یا رسم ورواج کی بنیاد پر عمل کرتا رہا ہے — اگر سیکولرزم کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور قرار دیا جائے اور سیکولرزم کو مسلم پرسنل لا کے خاتمہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو اسے اکثریت کی ڈکٹیٹر شپ کہہ سکتے ہیں، سیکولرزم نہیں۔

۳- یہ حقیقت ہے کہ مذہبی قوانین پرانے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ منجمد ہیں۔ ان کی افادی حیثیت ختم ہو چکی ہے اور وہ سماجی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ مذہبی قوانین (۱) کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ بنیادی اور اصولی ہے جن میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو حالات کے الٹ پھیر، عرف ورواج کے

(۱) یہاں صرف مذہب اسلام سے بحث ہے، کیونکہ ''یکساں سول کوڈ'' اسلامی قانون کے مقابلہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بدلنے اور وقت کے تقاضوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے بدل سکتے ہیں، اور بدلتے رہے ہیں(۱) قانون کے اس دوسرے حصہ کی موجودگی میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ مذہبی قوانین منجمد ہیں۔ یا ان کی افادی حیثیت اور سماجی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت ختم ہوچکی ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی اپنے اندر کوئی منطقی قوت نہیں رکھتا کہ کوئی قانون قدیم ہونے کی وجہ سے فرسودہ ہوجائے نہ ہر قدیم چیز بے کار ہوجاتی ہے۔ اور نہ ہر نئی چیز کارآمد۔ قوانین کے کارآمد یا بیکار ہونے کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ معاشرہ کو اطمینان بخش بنیادوں پر زندہ رکھنے اور ترقی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ عائلی قوانین جن سے یہاں بحث ہے، کو اسی اصول پر پرکھنا چاہیئے ''یونیفارم سول کوڈ'' کی بنیاد ظاہر ہے کہ مغربی قوانین ہی بنیں گے، مغرب میں جو عائلی اور شخصی قوانین نافذ ہیں، انہیں کی بنیاد پر ''ہندو کوڈ'' بنا ہے اور یونیفارم سول کوڈ کے خط و خال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں جن نئے قوانین کو نافذ کرنے کی جد وجہد کی جارہی ہے، اس کی تجربہ گاہ موجود ہے، ہمیں ان تجربہ گاہوں کا مطالعہ کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ قوانین عائلی زندگی میں اطمینان وسکون کا کس حد تک ذریعہ بنے ہیں؟

یہ ایک طویل اور تقابلی مطالعہ کے لئے نتیجہ خیز موضوع بحث ہے جس کی ان مختصر صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن حقائق کی بناء پر اسے ماننا چاہئے کہ مغربی ممالک کی عائلی زندگی کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں، اور شخصی زندگی کا سکون واعتماد رخصت ہو چکا ہے۔ ان ممالک میں نکاح ایک کھیل ہے، اور طلاق تماشہ ہے(۲) شرم وحیا، عفت و

(۱) اس سلسلہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'' اور ''مذہب اخلاق اور قانون''۔

(۲) امریکہ میں ۱۹۷۶ء کی پہلی ششماہی میں ۹۸۷۰۰۰ شادیاں ہوئیں اور ۵۳۸۰۰۰ طلاقیں ہوئیں۔ امریکہ کے صرف ایک شہر لاس اینجلس میں ایک سال پچاس ہزار طلاقیں ہوئیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

عصمت جیسے الفاظ کا وجود لغت کے دائرے میں سمٹ چکا ہے۔ بن باپ کے بچوں، بن بیاہی ماؤں کی لاکھوں مثالیں، معاشرے میں پھیلتی جارہی ہیں، مادر زاد ننگا رہنا، اور ایسے لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا(۱) بھی شاید ترقی یافتہ اور طاقت ور معاشرہ کا ایک حصہ سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ سب تہذیب جدید کے کرشمے اور مغربی عائلی قوانین کے نفاذ کے عملی نتائج ہیں، اب اگر دانشوروں کے دل سے احساس زیاں رخصت نہیں ہوا ہے وہ مغرب کی ان خرابیوں کو خرابی سمجھنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور وہ اگر اس اصول پر ایمان نہیں رکھتے کہ ہر نئی چیز قابل قبول۔ اور ہر پرانی چیز قابل نفرت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مذہبی شخصی قوانین کو فرسودہ کہہ کر یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کی جائے۔

۴- ملک کے لئے اتحاد اور قومی یکجہتی بڑی اہم ضرورت ہے اور ہندوستان میں آباد مختلف فرقوں کے درمیان دوستی خیر سگالی اور رواداری کے جذبہ کو فروغ دینا بہترین ملکی خدمت ہے، لیکن ''قومی یک جہتی'' کو سیاسی استحصال کے کے لئے استعمال کرنا بدترین قسم کی وطن دشمنی ہے، ہر وہ چیز جو ایک مخصوص قسم کے ذہن رکھنے والوں کو اپیل کرے، وہ سیکولرزم کا تقاضہ اور قومی یکجہتی کا ذریعہ بن جائے اور جو چیز اس ذہن کے خلاف ہو، اسے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے خانہ میں رکھ دیا جائے۔ یہ غلط اور ملک کے مستقبل کے لئے مہلک ہے۔

قومی یکجہتی اور باہمی رواداری کا ''یکساں سول کوڈ'' سے کتنا اور کس طرح کا تعلق ہے؟

(بقیہ صفحہ گزشتہ) (بحوالہ World Almanac) روس میں اوسطاً ہر تین میں ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے (بحوالہ ڈائجسٹ Sputnic) سویڈن میں ہر پانچ شادیوں میں اوسطاً دو کامیاب اور تین ناکام ہوتی ہیں، ڈنمارک اور جرمنی میں طلاق کی شرح اس سے بھی زیادہ ہے۔

(۱) مسٹر نکسن (سابق صدر امریکہ) کے خلاف وہائٹ ہاؤس کے سامنے عظیم الشان مظاہرہ میں دس ہزار ننگے بھی شریک تھے، جس کی تفصیلی خبر تصویر سمیت امریکی رسالہ ٹائم نے شائع کی تھی۔

اس کا اندازہ اس طرح لگانا چاہئے کہ جن مسائل کا تعلق افراد کی شخصی زندگی سے ہے، ان کی بناء پر آج تک دو فرقوں کے درمیان کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی یا دوسرے فرقوں کے درمیان نکاح وطلاق، ہبہ و وراثت وغیرہ جیسے مسائل کو لے کر کبھی اختلاف ہوا ہو، اس کی مثال نظر نہیں آتی، کیوں کہ یہ معاملات دو فرقوں کے درمیان نہیں ہوا کرتے ایک فرقہ کے دو یا چند افراد کے درمیان ہوتے ہیں اس کے برخلاف دو فرقوں کے درمیان شادی (جو یونیفارم سول کوڈ کی ایک دفعہ بن سکتی ہے) سے بڑے تلخ نتائج سامنے آئے ہیں، اور کئی بار شدید ترین فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی ہے، اس لئے واقعات کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ مختلف فرقوں کے علیحدہ شخصی قوانین قومی یک جہتی اور ملکی اتحاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کئی ایسے اہم مسائل موجود ہیں جن کی وجہ سے ملکی اتحاد اور سالمیت کو نقصان پہنچا ہے، اور مستقبل میں مزید نقصانات کا خطرہ ہے، لیکن دوسری مصلحتوں کی وجہ سے ان مسائل اور عوامی مزاج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، انہیں ملکی سالمیت کے نام پر ختم نہیں کیا گیا۔ انہیں مسائل میں سے زبان کا مسئلہ دہکتا ہوا انگارہ ہے، جس نے آسام میں ہلچل پیدا کردی، بنگال کو ہنگاموں پر اکسایا، اور جنوب وشمال کے درمیان، عدوات ونفرت کی خلیج حائل کردی، اس خلیج کا اندازہ ماضی کے ہنگاموں سے لگایا جاسکتا ہے اور ہوسکتا ہے مستقبل میں یہی چیز علیحدگی کا ذریعہ بنے۔ لیکن ان تمام واقعات کے باوجود ''زبان'' کے مسئلہ پر قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت واتحاد کی خوش کن آواز سننے میں نہیں آتی، اور اگر آتی ہے تو صرف اس لئے کہ اس ذریعہ سے ہنگاموں کو روکا جاسکے۔

ایسی صورت میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کے مخالفین اگر یہ کہتے ہیں کہ قومی یکجہتی اور ملکی اتحاد جیسے الفاظ سیاسی استحصال کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو اسے غلط نہیں کہا

جاسکتا — قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے ایک بہترین نسخہ دو فرقوں کے درمیان شادی کو کہا جاتا ہے، مگر ایسا کہتے وقت نہ صرف حال میں ہوئی مختلف شادیوں کے برے نتائج کو فراموش کردیا جاتا ہے، بلکہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس شخصیت نے بھی اس نسخہ پر عمل کیا تھا، جسے ہندوستان میں عام طور پر فرقہ پرستی کی علامت ملک کے اتحاد کو ختم کرنے والا، اور ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے ایک پارسی گھرانے میں شادی کی تھی، ان کی شادی اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت ہوئی تھی، یہ ایکٹ بھی متوازی قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بنا تھا، جس پر ایک مقبول مسلم رہنما نے عمل کیا۔ مگر اس عمل سے قومی یکجہتی کو کس درجہ فروغ ملا، اسے سب جانتے ہیں۔ دراصل زوجین کے درمیان اگر مذہبی، تہذیبی اور لسانی ہم آہنگی نہ ہو تو تجربات شاہد ہیں کہ زیادہ تر شادی ناکام رہتی ہے اور اکثر وبیشتر طلاق تک پہنچ جاتی ہے، ایسی شادی جو زوجین کے درمیان یک جہتی نہیں پیدا کرسکتی، قومی یک جہتی کس طرح پیدا کرسکتی ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ شخصی زندگی کے یہ قوانین، قومی اتحاد اور یک جہتی پر برا اثر نہیں ڈالتے اور یونیفارم سول کوڈ، قومی یک جہتی کا ذریعہ نہیں بن سکتا، قومی انتشار کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ قانون سازی ایسی ہونی چاہیے کہ اس ملک میں آباد تمام مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائی اپنی انفرادیت کو محفوظ سمجھے اور اس قانون کے دائرہ میں رہ کر وہ ملک کے استحکام اور ترقی میں پر سکون، باعمل شہری کی حیثیت سے حصہ لے سکے۔ قانون سازی کا یہ طریقہ ملک میں یکجہتی کی فضا پیدا کرنے میں معاون ہوگا۔ لیکن اگر مختلف تہذیبی، لسانی یا مذہبی اکائیاں کسی قانون کے ذریعہ اپنی انفرادیت کو مٹتا ہوا محسوس کریں گی تو ان میں ردعمل ہوگا۔ وہ اس قانون کے خلاف آواز بلند کریں گی۔ قانون سازوں پر ان کا اعتماد باقی نہیں رہے گا، اور قومی یک جہتی کو نقصان پہنچے گا۔ مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ یونیفارم سول کوڈ ان کی تہذیبی اور سماجی انفرادیت کے خاتمہ کا ذریعہ ہوگا، اسی لئے ''یونیفارم سول کوڈ'' قومی یک جہتی کا ذریعہ نہیں،

قومی انتشار کا وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے!

مذکورہ بالا امور کے پیش نظر، مسلم رہنما، علماء اور اہل علم ''یونیفارم سول کوڈ'' کے مخالف ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ''مسلم پرسنل لا'' مسلمانوں کی شخصی زندگی کے مسائل کے حل کرنے کے لئے مفید راستہ ہے۔ جس کے نفاذ کے لئے حکومت کو مزید سہولتیں، اور قانونی آسانیاں دینی چاہئیں، مسلم پرسنل لا کو منسوخ کرکے ''یونیفارم سول کوڈ'' کا نفاذ کسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ تو بن سکتا ہے مگر اس تبدیلی سے کوئی مفید کام نہیں انجام پائے گا۔

☆☆

متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء
ایک جائزہ

متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء The Adoption of Children Bill کے متعلق یہ مختصر سی تحریر بل کی تمام دفعات کا ملکی مفاد کے پیش نظر جائزہ نہیں ہے۔ نہ بل کے قانونی شکل میں آجانے اور اس کے نفاذ کے بعد معاشرے میں پڑنے والے اثرات پر تبصرہ ہے۔ اس تحریر کا مقصد صرف ان بنیادی اور اہم باتوں کی واضح نشاندہی ہے۔ جن کی وجہ سے یہ بل اپنے اندر کوئی خاص افادی پہلو نہیں رکھتا لیکن اسلامی قانون سے ٹکراتا ہے اور مسلم پرسنل لا کو متاثر کرتا ہے۔

بل کا مقصد:

اس بل کا جائزہ اس نتیجہ تک پہونچاتا ہے کہ بل کا مقصد یہ ہے کہ:

(۱) ان بچوں کیلئے مناسب گھر اور خاندان کے نظم کی راہ نکل سکے جو نادار اور خبر گیری سے محروم ہیں۔

(۲) یہ بل تبنیت کے لئے ایک ایسا قانون وضع کرنا چاہتا ہے جس کا اطلاق تمام فرقوں پر ہو سکے۔

(۳) اور اس بل کے قانونی شکل میں آجانے کے بعد اس قانون سے فائدہ اٹھانے والوں کے درمیان عملی اعتبار سے حقیقی رشتہ کا معاملہ ہوگا۔

نادار بچوں کی خبر گیری:

(۱) نادار اور خبر گیری سے محروم بچوں کی حفاظت اور کفالت کا معاملہ یقیناً بہت اہم ہے اور اس نیک ارادے کو صحیح راہوں سے پورا بھی ہونا چاہئے۔ ایسے بچوں کیلئے کوئی ایسی راہ نکالنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے۔ جس کے ذریعہ وہ بچے اچھی تربیت، بہتر تعلیم اور روشن مستقبل کے مالک بن سکیں۔ لیکن یہ جائزہ لینا ہوگا کہ کیا اس طرح کے قوانین (جو ابھی بل کی شکل میں ہیں) ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان گنت قابل رحم بچوں کے مسئلہ کا حل بن سکیں گے!

ماضی کا تجربہ:

۱۹۵۶ء میں Hindu Adoption & Maintenence Act پاس ہوا تھا۔ اس قانون کا تعلق ملک کی سب سے بڑی اکثریت سے ہے۔ قانون سازوں کے ذہن میں یہ بات رہی ہوگی کہ اس قانون کے ذریعہ خبر گیری سے محروم ہندو بچوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا اور ان کے ساتھ پھیلی ہوئی ناانصافیوں کا دروازہ ایک مدت تک بند ہو جائے گا۔ لیکن اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قانون سے پہلے اور قانون کے بعد بچوں کے گود لینے کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہاں جو بچے گود لئے گئے ان کو قانونی تحفظات ضرور حاصل ہو گئے۔ اس طرح موجودہ بل اگر قانون کی شکل اپناتا ہے تو اس سے متبنّٰی بچوں کو (مذہب اور فرقہ کے فرق کے بغیر) کچھ تحفظات مل جائیں گے۔ مگر خبر گیری سے محروم بچوں کی حفاظت اور کفالت کے تناسب میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اور وہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا جس کا تذکرہ اسباب واغراض کی توضیح کرتے ہوئے پہلے پیراگراف میں کیا گیا ہے۔

"TO PROVIDE PROPER HOMES AND FAMILIES FOR ABANDONED. DESTETUTE AND NEGLECTED CHILDREN"

۱۹۵۶ء کے مذکورہ ایکٹ کے تجربہ کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ۱۹۷۲ء کا متبنّٰی بل ایکٹ بن جانے کے بعد قابل رحم بچوں کی حالت میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کا قانون یا موجودہ بل ۱۹۷۲ء قابل رحم بچوں سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا تعلق ان بچوں سے ہے جنہیں گود لیا جا چکا ہے۔ خواہ وہ بچے خبر گیری سے محروم اور نادار ہوں یا نہیں!

گود لینے والوں کا جذبہ:

اس موقع پر یہ بھی غور کر لینا مناسب ہوگا کہ گود لینے والے کس جذبہ کے تحت بچوں کو گود لیتے ہیں۔ ایسے افراد مشکل سے نظر آئیں گے جنہوں نے کسی کی غربت پر ترس کھا کر بے گھر کو گھر والا بنانے کے لئے اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے بچوں کو سینے سے لگانے کے لئے گود لیا ہو۔ جو افراد گود لیا کرتے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت صرف اولاد کی کمی کو دور کرنے اور بچوں سے محرومی کی کسک کو مٹانے کیلئے کسی کو گود لیا کرتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر نادار، بے گھر، مفلس اور قابل رحم بچے گود نہیں لئے جاتے خاندان ہی کے کسی بچہ کو گود لیا جاتا ہے۔ اور اکثر خاندانی رشتہ کو نیا رنگ دے کر ایک فطری جذبہ کی تکمیل کی کوشش کی جاتی ہے۔

غیر ملکی حضرات کے سامنے کچھ اور مقاصد بھی ہوا کرتے ہیں مگر عام طور پر ناداری اور افلاس کسی کو گود لینے کا سبب نہیں بنا کرتے اس لئے یہ بل قانون کی شکل میں آجانے کے بعد قابل رحم بچوں کے درد کا مداوا نہیں بن سکتا۔

بچوں کا مسئلہ حل ہونا چاہئے:

یہ حقیقت ہے کہ ملک میں غریبی اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے پچیس سالہ کوششوں کے باوجود آمدنی کے اوسط کے مقابلہ گرانی کا اوسط زیادہ بڑھا ہے۔ اور مفلسی پھیلتی چلی

جارہی ہے۔موجودہ حالات میں ملک کے بگڑتے ہوئے اقتصادی ڈھانچہ کے سدھرنے اور پھیلی ہوئی غریبی کے سمٹنے کے امکانات دور دور نظر نہیں آتے۔ملک کی موجودہ اقتصادی صورتحال کا لازمی نتیجہ خبر گیری سے محروم بچوں کی تعداد میں اضافہ ہے۔اس بڑھتی ہوئی تعداد کو متبنّٰی قانون کے ذریعہ قابل ذکر حد تک بھی کمی نہیں کیا جاسکتا۔اور ایسی کوئی توقع نہیں ہے کہ ایسے خوش قسمت بچوں کی تعداد ایک فیصد بھی ہوسکے گی جن کا مستقبل اس طرح کے قوانین کے ذریعہ کسی نیک انسان کے ساتھ مکمل وابستگی سے ''یقینی'' اور ''تابناک'' ہوسکتا ہو۔اس لئے ایسے بچوں کے لئے کوئی یقینی اور نفع بخش راہ نکالنی ہوگی۔اور ایسی شکل پیدا کرنی ہوگی کہ ان کی آرزوؤں کی کلی مرجھا کر نہ رہ جائے۔

متبنّٰی اسلام کی نظر میں:

(۲) اس بل کا دوسرا اہم مقصد ''تبنیت'' کیلئے ایسا قانون وضع کرنا ہے، جس کا اطلاق تمام فرقوں پر ہوسکے، اس طرح اس بل کی بنیاد پر بنا ہوا قانون ہر مذہب اور رواج کے پابند ہندوستانیوں پر یکساں طور سے نافذ ہوگا، ظاہر ہے اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔اسلامی نقطۂ نظر سے تبنیت ایک غلط رسم ہے جسے اسلام نے ختم کردیا ہے۔اور اس طرح کے مصنوعی رشتوں کو ناقابل قبول قرار دیا ہے، قرآن میں تبنیت کی رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا گیا،

ماجعل ادعیائکم ابنائکم ذالکم قولکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل، ادعوھم لا بآئھم ھو اقسط عنداللہ فان لم تعلموا اٰبائھم فاخوانکم فی الدین و موالیکم (احزاب: ۴، ۵)

ترجمہ: لے پالک تمہارے بیٹے نہیں ہیں۔ان کو بیٹا کہنا تمہارے منہ کی ایک بات ہے۔اور اللہ تو سچی بات ہی کہتا ہے اور وہی راستہ کی ہدایت کرتا ہے۔لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کرکے پکارو کہ اللہ کے یہاں یہی پکا انصاف ہے۔اور اگر تم ان کے

آباء کو نہیں جانتے ہو تو وہ لے پالک دین میں تمہارے بھائی اور رفیق ہیں۔

یہ آیت کسی بچہ کو گود لینے کی رسم کی صراحۃً مخالفت کرتی ہے اور مصنوعی رشتوں کو حقیقی سمجھنے سے روکتی ہے۔باپ اور ماں کے تبادلہ کے بجائے قرآن کے نقطۂ نظر سے بچوں کو حقیقی ماں باپ کی طرف منسوب کیا جانا چاہئے۔اور اگر کسی کا باپ معلوم نہ ہو تو اس کے لئے کسی مصنوعی باپ کو تلاش کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔یہ ضروری ہے کہ ایسے بے پناہ بچے لوگوں کی نگاہ کرم کے زیادہ محتاج ہیں اس لئے قرآن نے جذبۂ انسانی کو بیدار کرنے کی خاطر ایسے بچوں کو ''دینی بھائی'' قرار دیا ہے۔اور یہ بھی کہا ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان دوستی اور رفاقت کا رشتہ ہے۔اس انداز بیان سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ایسے بچوں کی دیکھ بھال کرنی چاہئے اور معاشرہ میں نیکی اور بھلائی کے عنصر کو ابھار کر ایسا مزاج بنانا چاہئے کہ مصنوعی رشتوں کے بغیر انسانی جذبۂ ہمدردی کی وجہ سے ایسے بچے دردر کی ٹھوکریں نہ کھائیں، اور رفیق اور بھائی ہونے کے ناطے ہر شخص ان کا خیال رکھے۔

مذکورہ آیت سے واضح ہے کہ تبنیت کا سلسلہ قرآن کی ہدایت کے خلاف ہے اور قرآن متبنّٰی (Adopted Child) کو صلبی اور حقیقی اولاد قرار دینے سے روکتا ہے۔

اس واضح آیت کی موجودگی میں کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ قانون تبنیت کا تعلق مسلمانوں سے بھی جوڑ دیا جائے۔

مصنوعی رشتوں کی وجہ سے حقدار کو محروم نہیں کیا جاسکتا:

اس بل کا تیسرا اہم مقصد یہ ہے کہ متبنی اور متبنّٰی لینے والوں کے درمیان حقیقی رشتہ کا معاملہ کیا جائے۔یعنی اگر کسی بچہ کو متبنّٰی بنایا گیا تو وہ بچہ متبنّٰی بنانے والے کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی تمام امور و حالات میں حقیقی بچہ متصور ہوگا۔اور اس کی حیثیت قانونی شادی سے پیدا شدہ اولاد کی ہوگی۔

(الف) زندگی میں دوسروں کی مدد کرنا بہت اچھا کام ہے۔اسلام نے اس کی بڑی ہمت افزائی کی ہے۔لیکن یہ اچھا اور نیک کام اس حد تک ہونا چاہئے کہ دوسرے حقدار اور وہ لوگ جن کی کفالت کسی شخص پر عائد ہوتی ہے۔اس ''نیک کام'' سے ''متاثر نہ ہوں'' زندگی میں کوئی ایسی راہ اختیار کرنا اسلامی نقطہ نگاہ سے جرم ہے، جس کے نتیجے میں اس شخص کے انتقال کے بعد وارثین اپنے حقوق سے محروم ہوجائیں۔

متبنّٰی بل اور قانون وراثت:

(ب) دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام نے مستقل وراثت کا قانون بنادیا ہے۔اور وارثین کے حقوق اور حصے متعین کردیئے ہیں۔اگر کوئی شخص کسی کو متبنّٰی بناتا ہے تو اس کے نتیجہ میں دوسرے وارثین کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور مصنوعی اولاد خونی رشتوں کے ذریعہ ملنے والی میراث میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔جس کے نتیجہ میں اسلام کے قانون وراثت کا پورا ڈھانچہ منہدم ہوجاتا ہے۔

مثلاً اگر کسی شخص کو بچہ نہیں ہے اور اس کا انتقال ہوگیا۔اس کے والدین زندہ ہیں تو مرنے والے کے متروکہ مال میں سے والدین کا حق قرآن نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

فان لم یکن له ولدو ورثه ابواه فلأ مه الثلث (النساء:۱۱)

ترجمہ: اگر اس کے بچہ نہیں ہے اور ماں، باپ اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کا تہائی حصہ ہے۔

یا کسی مرنے والی کے اولاد نہیں ہے تو بھائی اس کا وارث قرار دیا گیا ہے۔

وهو یرثها ان لم یکن لها ولد (النساء: ۱۷۶)

ترجمہ: اور وہ بھائی وارث ہوگا اگر بہن کو بچہ نہ ہو۔

کسی مرنے والے کو بچہ نہ ہو تو بیوی کا حصہ چوتھائی مال ہوگا۔

ولهن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد (النساء: ۱۲)

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اس مال میں سے جسے تم نے چھوڑا ہے۔ بشرطیکہ تمہیں بچہ نہ ہو۔

یہ چند مثالیں جن میں بتایا گیا ہے کہ بچہ نہ ہونے کی شکل میں ماں، بھائی اور بیوی کا کیا حصہ ہوگا۔اب اگر زیر بحث بل کو قانونی حیثیت حاصل ہوجائے تو متبنّٰی حقیقی اولاد کی حیثیت اختیار کرے گا۔اور ماں، بھائی اور بیوی (یا اس طرح دوسرے حقداروں) کے حصے کم یا ختم کرنے ہوں گے۔کیوں کہ اولاد کی موجودگی میں ان حقداروں کو اسلامی قانون وراثت کے مطابق کم حصہ ملا کرتا ہے۔

اسی طرح تبنیت کے قانون پر عمل کرنے کے نتیجہ میں مذکورہ آیات کی صریح مخالفت ہوگی اور حقداروں کی حق تلفی ہوگی۔

یہ اختیاری قانون عملاً اضطراری ہوگا!

مذکورہ بالا حقائق سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ بل قانون کی شکل میں آنے کے بعد گرچہ اختیاری رہے گا۔اور کسی شخص کو متبنّٰی بنانے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔بلکہ گود لینا فرد کا انفرادی عمل ہوگا۔لیکن یہ اختیار جب عملی شکل میں سامنے آئے گا تو بہت سے لوگوں کے لئے جبر بن جائے گا۔اور انفرادی اختیاری عمل سے دوسرے کے حقوق نئے قانون کے ذریعہ پامال ہوں گے۔اس لئے اس طرح کے قوانین گرچہ بظاہر اختیاری معلوم ہوتے ہیں، مگر برتنے کے وقت بہتوں کے لئے اضطراری ہوجائیں گے۔

مثلاً کسی شخص نے ایک بچہ کو گود لے لیا ہو تو موجودہ بل کے مطابق اس شخص کے مرنے کے بعد وہ بچہ اس شخص کا وارث ہوگا۔اور اس کے ماں، باپ، بھائی بہن کو اس بچہ کے نہ ہونے کی شکل میں جو حصہ مل سکتا تھا نہیں ملے گا۔حق تلفی کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ اس شخص نے اپنے قانونی اختیار کو استعمال کرکے بچہ کو گود لے لیا تھا۔ظاہر ہے اس کے عمل میں اس کے

ماں، باپ، بھائی بہن کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مگر اپنے کسی عمل کے بغیر ان کے حقوق پامال اور حصے کم ہوں گے، اس طرح یہ اختیاری قانون ماں باپ وغیرہ کے حق میں لازمی اور اضطراری نتائج سامنے لائے گا۔

اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے متروکہ مال کا کسی کو (خواہ وہ گود لیا ہوا بچہ کیوں نہ ہو) حقدار بنا دیتا ہے تو یہ اس کا اپنی دولت کے ساتھ نجی معاملہ ہے۔ اسلام نے متروکہ مال کا پورا ضابطہ متعین کر دیا ہے اور مرنے والے کو اپنے مال کے ایک تہائی حصہ میں وصیت کا اختیار دیا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ کیلئے کوئی وصیت کرتا ہے تو یہ وصیت دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوگی جسے اسلام نے قبول نہیں کیا ہے۔

متبنّٰی بل اور قانون نکاح:

تیسری چیز یہ ہے کہ یہ مسودہ قانون اسلام کے قانون نکاح کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اسلام نے ان عورتوں کی فہرست بتادی ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ اس فہرست کے سوا تمام عورتوں سے نکاح درست قرار دیا گیا ہے لیکن اس مسودہ قانون میں متبنّٰی کو حقیقی اولاد بنا دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ان رشتوں میں بھی نکاح حرام ہو جائے گا جن رشتوں کی بنیاد پر حقیقی اولاد کے لئے رشتہ نکاح ممنوع تھا۔ اور وہ رشتے جن میں اسلام کے قانون نکاح کے مطابق نکاح درست تھا۔ اس مسودہ قانون کی رو سے وہ رشتے حرام ہو جائیں گے۔ مثلاً کسی شخص نے اجنبی بچہ کو گود لے لیا اس شخص کو اگر کوئی بچی ہے تو اس مسودہ قانون کی بنیاد پر اس بچی سے اس بچہ (متبنّٰی) کا کبھی بھی نکاح نہیں ہو سکے گا۔ جب کہ اسلامی قانون کے مطابق ان دونوں میں رشتہ نکاح قائم کرنا بالکل درست ہے۔ اس طرح یہ مسودہ قانون اسلام کی فہرست محرمات کے سوا ایک اور فہرست محرمات بھی متعین کر دیتا ہے۔ اور قانونی شکل میں آجانے کے بعد یہ قانون گود لئے بچوں کو مجبور کریگا کہ وہ اسلام کی بنائی ہوئی

فہرست محرمات کے سوا قانون کی متعین کی ہوئی فہرست محرمات کا بھی پورا احترام کریں۔

یہ طریقہ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کو غلط پابندیوں میں جکڑتا ہے اور ایک مسلمان بچی کو اس شخص سے نکاح نہ کرنے کا حکم دیتا ہے جس سے نکاح کرنے کی اجازت اسلام نے دی ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسودہ قانون اسلام کے مختلف صریح قوانین وضوابط سے ٹکراتا اور مسلم پرسنل لا کے ایک اہم حصہ کو پورے طور پر مجروح کرتا ہے۔ ساتھ ہی یہ مسودہ قانون ملک میں پھیلے ہوئے بے شمار نادار خبر گیری سے محروم قابل رحم بچوں کے لئے کوئی سہارا نہیں بن سکتا۔

مسلمانان ہند کا نقطہ نظر:

انہیں وجوہ کی بنا پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن منعقدہ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء (بمبئی) نے اپنی قرارداد نمبر ۲ میں یہ اعلان کیا کہ یہ اجلاس متبنّٰی بل ۱۹۷۲ء کو اپنی موجودہ شکل میں قانون شریعت میں مداخلت سمجھتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ورکنگ کمیٹی منعقدہ ۴/۵/جولائی ۱۹۷۳ء (الہ آباد) نے متبنّٰی بل ۱۹۷۲ء سے متعلق مسلم پرسنل لا کنونشن کی منظور شدہ تجویز کو دہرایا۔ میں بھی متبنّٰی بل ۱۹۷۲ء سے متعلق پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی کے سامنے مسلم پرسنل لا کنونشن (بمبئی) اور ورکنگ کمیٹی مسلم پرسنل لا بورڈ کی تجویز کی مکمل تائید کرتا ہوں، اور مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اس بل کو اپنے بیان کئے گئے مقصد میں غیر مفید، ناکام، اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف، شریعت اسلامیہ کے قانون وراثت کو درہم برہم کر دینے والا اور مسلم پرسنل لا کو مجروح کرنے والا سمجھتا ہوں۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق متبنّٰی بل کو ایسی شکل دے کہ اس کے اثرات سے مسلم پرسنل لا محفوظ رہ سکے۔

☆☆

آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن منعقدہ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء بمبئی کی

منظور شدہ بنیادی قراردادیں

● **قرارداد نمبر ۱:** مسلمانان ہند اس صورت حال سے شدید تشویش اور اضطراب میں مبتلا ہیں جو مختلف قانون ساز اسمبلیوں اور قوانین کے ذریعہ ان کے پرسنل لا کو ختم کرنے اور مشترکہ سول کوڈ کی راہ ہموار کرنے کے لئے کی جارہی ہیں۔ لہٰذا مسلمانان ہند کا یہ نمائندہ اجتماع منعقدہ بمبئی (بتاریخ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء) جو مسلمانان ہند کے تمام مکاتب فکر اور مسالک کے علاوہ ان کی تمام دینی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی انجمنوں، جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے، کامل اتفاق اور قطعیت کے ساتھ اپنے اس موقف کا اعلان کرتا ہے کہ شریعت اسلامی کے احکام وحی الٰہی پر مبنی ہیں ان میں نہ کوئی کمی ہے جسے پورا کرنے کی ضرورت ہو اور نہ زیادتی جسے کم کرنے کی حاجت پیش آئے۔

(۱) یہ کنونشن اس امر پر بھی اپنے یقین کا اظہار کرتا ہے کہ مسلم پرسنل لا مسلمانوں کے دین و مذہب کا ایک جز ہے۔ اور کسی مسلمان کے لئے احکام شرع اسلامی سے گریز جائز نہیں اور نہ وہ کسی ایسے فیصلے کو کسی حال میں قبول کرسکتا ہے۔ جو اللہ کے حلال کئے ہوئے کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے۔ یہ کنونشن اس امر پر بھی اپنے محکم فیصلے کا اعلان کرتا ہے کہ پارلیمنٹ یا ریاستی مجالس قانون ساز کو شریعت اسلامی میں کسی ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل نہیں ہے اور کون سے قوانین شرع اسلامی کے مطابق یا متعلق ہیں اور کون سے نہیں، اس کے بارے میں ہر فرقہ اور مسلک کے مستند و معتمد علمائے شریعت کا فیصلہ آخری اور قطعی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) یہ کنونشن ان چند افراد کی مذموم کوششوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے جو مسلم پرسنل لا کی اصلاح کے نام پر قانون شریعت میں مداخلت کیلئے راہ ہموار کررہے ہیں۔

(۳) اگر دور غلامی میں کچھ مذہبی قوانین میں ترمیمات کی گئی ہوں یا کسی مسلم ملک میں عائلی قوانین کے اندر کوئی تبدیلی عمل میں آئی ہو تو یہ عمل قانون شریعت میں ترمیم و تنسیخ کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتا۔

(۴) یہ کنونشن اس امر پر بھی یقین رکھتا ہے کہ شخصی اور عائلی قوانین امت کے تشخص، اس کی امتیازی حیثیت اور اس کی تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کے ضامن ہیں اور کوئی مسلمان اپنی ملی انفرادیت دینی امتیازات اور تہذیبی و ثقافتی خصوصیات سے کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوسکتا۔

(۵) مہذب دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ہر تہذیبی اور مذہبی اکائی کو اپنی تہذیب و مذہب کے تحفظ کا نہ صرف پورا پورا حق حاصل ہے۔ بلکہ اگر کسی گروہ کی تہذیبی اور مذہبی خصوصیات کو مٹانے کی کوشش کی جائے تو اسے نسل کشی کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ اس لئے آزاد ہندوستان کے معماروں نے بھی دستور ہند کے بنیادی حقوق میں مذہبی آزادی اور اسکے قیام و بقا کی بھرپور ضمانت دی ہے اس لئے کنونشن کو یقین ہے کہ ہندوستانی عوام ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے جو دستور کی روح کو پامال کرنے اور کسی گروہ کو اس کے دستوری حق سے محروم کردینے والی ہو۔ یہ کنونشن مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اپنے اس فیصلے کا اعلان کرتا ہے کہ:

(الف) مسلمانوں کے شخصی اور عائلی قوانین جو دراصل ان کے دین و مذہب کا لازمی جزو ہیں انہیں ختم کرکے ـــــ ان کی جگہ یکساں سول کوڈ کا اجرا یا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم یا متوازی قانون سازی کے ذریعہ اسے بے اثر بنانا انسانی حقوق کے بین الاقوامی منشور کے منافی، تہذیبی نسل کشی کے ہم معنی اور دستور ہند کے بنیادی

حقوق کے معارض ہوگا۔اوراس طرح کے کسی بھی اقدام کا مطلب مسلمانوں کو کتاب اللہ اورسنت رسول ﷺ سے انحراف پر مجبور کرنا ہوگا جو کسی بھی مسلمان کے لئے کسی حال میں قابل برداشت نہیں ہوسکتا۔

(ب) یہ کنونشن اس امر پر بھی یقین رکھتا ہے کہ دستور ہند کے رہنما اصولوں کا آرٹیکل ۴۴ بنیادی حقوق کی دفعات کے تابع ہے۔اس لئے مسلم پرسنل لا آرٹیکل ۴۴ کے دائرے سے خارج ہے۔

(ج) یہ کنونشن پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز میں پیش ہونے والے ان بلوں کو ناقابل قبول قرار دیتا ہے جو بالواسطہ مسلم پرسنل لا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(د) یہ کنونشن اس امر کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مسلمانوں کو عائلی اور معاشرتی زندگی کے شرعی احکام وآداب سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ پوری طرح شرعی احکام پر عمل کرکے معاشرہ کو صالح بنیادوں پر استوار کرسکیں۔

● **قرارداد نمبر۲:** یہ اجلاس Adoption of Children Bill 1972 (قانون تبنیت ۱۹۷۲ء) اور Public Trust Bill کو اپنی موجودہ شکل میں قانون شریعت میں مداخلت سمجھتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

● **قرارداد نمبر۳:** آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کرتا ہے جو ہمیشہ ہر فرقہ ومسلک کے مسلم علماء ماہرین شریعت، مسلم قانون داں اور ملت کے دیگر ارباب حل وعقد پر مشتمل ہوگا۔نیز مختلف فرقہ ومسلک کی نمائندگی بورڈ کی ضمنی کمیٹیوں میں بھی ملحوظ رہے گی۔

(الف) یہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قوانین شرع کی بقا اور تحفظ کے لئے ہر طرح کی ضروری تدابیر عمل میں لانے اور ہر طرح کی جدوجہد منظم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

یہ بورڈ علماء و ماہرین قانون پر مشتمل ایک ایسی مستقل کمیٹی بنانے کا ذمہ دار ہوگا جو موجودہ قوانین نیز پارلیمنٹ اور مختلف ریاستی مجالس قانون ساز میں پیش ہونے والے مسودات قانون (بلوں) اور گشتی احکام (سرکلر) کا جائزہ اس نقطہ نظر سے لیگی اور لیتی رہے گی کہ اس کا کیا اثر مسلم پرسنل لا پر پڑتا ہے۔

یہ بورڈ شریعت اسلامی کے عائلی قوانین کی اشاعت اور مسلمانوں پر اس کے نفاذ کے لئے ہمہ گیر خاکہ تیار کرے گا۔یہ بورڈ مسلم پرسنل لا کی تحریک کیلئے بوقت ضرورت ''مجلس عمل'' بھی بنا سکتا ہے۔جس کے ذریعہ بورڈ کے فیصلہ پر عمل درآمد کے لئے پورے ملک میں جدوجہد منظم کی جاسکے۔

(ب) اس بورڈ کی ایک جنرل کونسل ہوگی جو ۱۵۱/ارکان پر مشتمل ہوگی اور کنونشن کی اسٹیرنگ کمیٹی کے ارکان اس کے رکن بنیادی (Founder Members) ہوں گے باقی ارکان کو جنرل کونسل کو آپٹ (Opt) کرے گی اور ''۴۱'' افراد پر مشتمل ایک ''مجلس عاملہ'' ہوگی جسے بورڈ منتخب کرے گا۔

(ج) عہدیداروں کا تعین ان کا انتخاب اور دیگر ضوابط اپنے لئے خود یہ بورڈ تیار کرے گا۔

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور "القاسم اسلامک یونیورسٹی" کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو بھی خواہان ملت اسلامیہ صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہ کا پاک ارشاد ہے:

"جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے" (الکہف: ۳۰ ترجمہ: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ "ترجمان القرآن")

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia

At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:

K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002